مقام محمود

سلسلہ مطبوعات ادارہ طاقِ بستان آرہ

(نمبر ۴)

مقامِ محمود

مرتبہ

عبدالمالک آروی

comp

سلسلۂ مطبوعات طاق بستان آرہ

نمبر (۲)

مقامِ محمود

یعنی

جناب عبدالمالک آروی کے تاریخی، ادبی

اور انتقادی مقالات کا پہلا مجموعہ

ملنے کا پتہ

منیجر طاق بستان آرہ (بہار)

مطبوعہ جمال برقی پریس دہلی

قیمت ۲/ ۱۲

فہرست مضامین مقامِ محمود

ادبیات

تاریخ و اساطیر

تاریخ طبع مضامین

آرہ کے دور ادبی کی ایک مختصر تاریخ	مخزن اکتوبر ۱۹۲۹ء
عہد ظفر کے تاریخی و سیاسی حالات	نگار جنوری ۱۹۳۰ء
زاہد فریب جوگن	انکشاف نومبر ۱۹۳۰ء
دولت خلجیہ کا آخری نظارہ	صوفی جنوری ۱۹۳۱ء
بنی فاطمہ کی سیاسی تحریکیں	نگار اکتوبر ۱۹۳۲ء
سلاطین آستانۂ فقرا پر	آئینہ دسمبر ۱۹۳۲ء
غربا تخت شاہی پر	مساوات مارچ ۱۹۳۳ء
بہار کا ایک دل والا شاعر گمنامی میں	ساقی سالنامہ ۱۹۳۳ء
عہد طاہریہ کی وفاکیش حسینہ	مساوات اپریل ۱۹۳۴ء
صفیر بلگرامی	نگار فروری ۱۹۳۴ء
دہلی اور لکھنؤ اسکول کی شاعری	نگار جون جولائی ۱۹۳۸ء
غالب کی اخلاقی کمزوریاں	نگار مارچ ۱۹۳۹ء
خاتون صحرا	تنویر فروری تا اگست ۱۹۳۹ء

اھداء

ڈاکٹر سید محمود صاحب مدظلہٗ ادب و سیاست دونوں میں جس امتیاز کے مالک ہیں وہ عہدِ حاضر کی ہندوستانی تاریخ کا ایک ایسا صفحہ ہے جس کا بہیم تعارف و مطالعہ کیا جا چکا ہے، ڈاکٹر صاحب نے اپنے مختصر سے دورانِ وزارت میں جس وسعت قلب اور پاکیزگی ذوق کا ثبوت دیکر علمی خدمت کرنیوالوں کے قلوب پر اپنے خلوص و کرم کا غیر فانی نقش چھوڑا، اس کا اندازہ آسانی سے نہیں کیا جا سکتا۔ مدت ہوئی آپ اپنے منصب سے سبکدوش ہو چکے، لیکن وہ زمانہ ایک "یاد" بن کر دل پہ چھا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک لائق وزیر کی حیثیت سے یقیناً اپنا فرض ادا کیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ اپنے احساس فرض کے ماتحت طاق بستان کو درخور اعتنا نہ سمجھتے تو آج یہ ادارہ اس منزل پہ نہ ہوتا جہاں ہے، طاق بستان کے لئے سابق وزرار سے بھی تحریک کی گئی تھی لیکن اس وجہ سے کہ قدرت کی طرف سے ہر کام کے لئے ایک وقت مقرر ہے، حکومت نے توجہ نہ کی، لیکن ڈاکٹر صاحب کا یہ بلند احساس فرض تھا جس نے طاق بستان کی ایک ہی آواز پر آپ کو ایک مجہول اور گمنام ادارہ کی سرپرستی پر مجبور کر دیا اس سے جہاں ڈاکٹر صاحب کی فرض شناسی اور بلندی اخلاق پر روشنی پڑتی ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے آپ کو کافی ملکہ عطا کیا ہے کہ کام کرنے

والوں کو بھانپ لیں۔ اس وقت ادارہ کے سامنے بہت سے مفید لوائح عمل ہیں، دقتیں حائل ہیں لیکن جو کچھ ہو رہا ہے وہ ڈاکٹر صاحب کے اسی سابق التفات اور ادب نوازی کا منت کش ہے سنہ ۳۹ء میں بھی آپ نے طاق بستان کو میرے مضامین کا مجموعہ شائع کرنے کے لئے صہ ۲۵۰ روپے دیئے تھے، اب یہ کتاب "مقام محمود" کے نام سے شائع ہو رہی ہے، خدا کا شکر ہے کہ وزارت مستعفی ہو چکی ہے اور آج میں ایک بے غرض محبت کیش کی طرح ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں اپنا ہدیۂ محبت پیش کرنے کی عزت حاصل کر رہا ہوں، "مقام محمود" ہمارے ولولہ انگیز دورِ حیات کی بہترین یادگاروں میں سے ہے۔

طاق بستان۔ ملکی محلہ آرہ

مورخہ ۱ر جون سنہ ۴۱ء

عبدالمالک آروی

دیباچہ

طاق بستان محض چند افراد کی ذاتی کوششوں کی بدولت معرض وجود میں آیا تخیل میں تو اس کی تخلیق مدت سے تھی، لیکن عملی کام ۳۸ء سے شروع ہوا ادارہ نے کام کی ابتدا جس طرح کی وہ ایک دلچسپ اور حیرت انگیز افسانہ ہے۔ ہم ان نجی دشواریوں اور عملی راہ کی صعوبتوں کا تذکرہ کرنا نہیں چاہتے علم نے بے سروسامانی کی فضا میں بھی اپنے تاریخی نقوش چھوڑے ہیں گو اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ علم نے حکومت اور دولت ہی کی آغوش میں نشوونما پائی، یہ محض طاق بستان کے مخلص کام کرنے والوں کی جگر کاویوں کا ثمرہ ہے کہ ادارہ بلا کسی معقول سرپرستی کے کام کرتا جارہا ہے اور جب تک اس کے ان سرگرم کام کرنے والوں کے دم میں دم ہے کوئی وجہ نہیں کہ اس کا قدم آگے نہ بڑھتا جائے۔

ہم یہاں حکومت بہار اور ریاست حیدرآباد کا شکریہ ادا کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتے کہ ادارۂ طاق بستان کو آٹھ سو کی رقم ملی، ڈاکٹر سید محمود صاحب، سر حید رنواز جنگ (سر اکبر حیدری مدظلہٗ) علیہ حضرت بیگم صاحبہ مظہر الحق مرحوم اور ہز ایکسیلنسی صدر (حیدرآباد) نے جس مخصوص توجہ سے کام لے کر ادارہ کے کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی، اس نے ہمارے اندر نئی روح اور نئی اُمنگ پیدا کر دی۔

ملک کے ان مشہور اداروں کا بھی شکریہ ادا کرنا ہمارا فرض ہے جنھوں نے مطبوعات طاق بستان کے نشر و اشاعت میں زبردست حصہ لیا۔ مکتبہ دانش (لاہور)

ندوۃ المصنفین (دہلی)، مکتبہ جامعہ، کتب خانہ علم و ادب (دہلی) صدیق بکڈپو، نگار بک ایجنسی (لکھنؤ)، مکتبۂ ابراہیمیہ (حیدرآباد دکن) ایوان اشاعت (گورکھپور) شاد بک ڈپو (پٹنہ) نے کافی تعداد میں ہماری مطبوعات منگائیں، خصوصیت کے ساتھ اول الذکر پانچ اداروں نے ہماری مطبوعات کے کئی کئی سو نسخے لئے، یہاں تک کہ ڈیڑھ ہزار نسخے بہت قلیل مدت میں ان اداروں ہی کی بدولت ملک کے طول و عرض میں پھیل گئے۔

خصوصیت کے ساتھ حضرت نیاز مدظلہٗ نے غیر معمولی طور پر لطف و توجہ سے کام لیا اور "نگار" نے طاق بستان اور اُس کی مطبوعات کی اشاعت میں بڑی اعانت کی ان تمام حوصلہ افزائیوں ہی کا نتیجہ ہے کہ ہم ادارہ کی چوتھی کتاب "مقام محمود" شائع کر رہے ہیں یہ کتاب مجموعہ ہے جناب عبدالمالک آروی کے مضامین کا، اس مجموعہ میں صرف ادبی، تاریخی اور انتقادی مقالات ہیں۔ دوسرا مجموعہ بھی مرتب ہو چکا ہے جو علمی اور فنی مقالات پر مشتمل ہے اور بہت جلد شائع ہو جائے گا۔ تیسرا مجموعہ، جو مذہبیات سے متعلق ہے وہ بھی مستقبل قریب ہی میں غالباً مکتبہ برہان (دہلی) سے شائع ہوگا۔

محمد امیر

رکن ادارہ طاق بستان

ادبیات

دہلی و لکھنؤ اسکول کی شاعری

فلسفہ کے مختلف مسالک، تصوف کے مختلف خانوادوں، فن مصوری و موسیقی کے مختلف اسکول کی طرح شاعری کے بھی بہت سے اسکول گزرے ہیں۔ اور جب تک فطرت انسانی میں تنوع اور طبائع میں اختلاف و تضاد قائم ہے۔ اسی طرح مسلک و اسکول کی تخلیق بھی ہوتی رہے گی۔ صرف فلسفہ یونان کی تاریخ میں سالیس ملیطی سے لیکر فلاطینوس تک تقریباً ایکدرجن فلسفہ کے مختلف مسالک کی ہنگامہ آرائیاں رہیں کبھی ہیروان زونو فن کو فروغ رہا کبھی سوفسطائیہ کو کبھی اکاڈمیین مشائین اور رواقیون کی سرگرمیاں رہیں کبھی ہیقوریین تشگکین اور اشراقیون کی گیرائیاں، ہندوستان میں بھی فلسفہ ویدانت، وسانکھیہ مذاہب جین اور بودھ اسی اختلاف نظر و فکر کی پیداوار ہیں۔ تصوف کی دنیا میں آیئے وہاں بھی وجود و فنا، عرفان و حضور کے نظریوں کا اختلاف نظر آئے گا ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ قادریہ و چشتیہ سہروردیہ و فردوسیہ کے خانوادے معرض وجود میں آتے، مصوری کی تاریخ میں بھی آپ کو اطالوی، ایرانی، راجپوت و مغل، چینی و جاپانی آرٹ کی رنگینیاں نظر آئیں گی، موسیقی کا بھی یہی حال ہے، مولدات بصرہ اور قینات حجاز اسلامی موسیقی کی تاریخی حقیقتیں ہیں پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ شاعری کی دنیا اس کلیہ سے ممتاز رہتی، چنانچہ

یہاں بھی آپ کو طرز و ادا کا یہی اختلاف مختلف اسکول کی شکل میں نظر آئے گا، اس وقت میں صرف اُردو شاعری سے بحث کروں گا۔

تاریخ و تذکروں میں اُردو شاعری کے صرف دو اسکولوں کا نام لیا جاتا ہے یعنی دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول، لطف یہ ہے کہ اگر صرف دہلوی اور لکھنوی تذکروں میں یہ تخصیص و تعیین پائی جاتی تو تعجب کی بات نہ تھی، کیونکہ بہار اور دکن اُردو کے ان مرکزی مقامات سے اس قدر دور واقع ہوئے ہیں کہ میر و قائم گردیزی، (میر حسن سے یہ توقع کرنا درست نہیں کہ وہ بہار و دکن کی خدمات اُردو کو اس عہد میں جس وقت ذرائع رسل و رسائل میں اتنی آسانیاں نہ تھیں۔ بہ وضاحت بیان کریں گے متوسطین تذکرہ نگاروں میں مصحفی نے البتہ بہار کی طرف کافی توجہ کی، دکنی تذکرے بالخصوص خواجہ خان حمید اورنگ آبادی کا تذکرہ "گلشن گفتار" خود دہلوی شعرا کے حالات سے بڑی حد تک تشنہ ہے، "چمنستان شعرا" شفیق کا بھی یہی حال ہے، گو "گلشن گفتار" کی ایجاز و اختصار کے بدلے اس میں تفصیل و اطناب پایا جاتا ہے۔ بہاری تذکروں میں سے اکثر طبع ہی نہ ہوئے اور جو طبع بھی ہوئے وہ اب ناپید ہیں۔ انجمن ترقی اُردو دکن اور مولانا عبدالحق صاحب کا ملک کو ممنون ہونا چاہیے کہ ان کی کوششوں کی بدولت اہم اور مفید تذکرے شائع ہوئے انھیں میں تذکرہ گلزار ابراہیم (نواب ابراہیم خاں خلیل) اور تذکرہ "گلشن ہند" (مرزا علی لطف) ہیں، خلیل نے آغوش بہار میں نشو و نما پائی لطف بہاری نہیں ہیں، لیکن "گلشن بیخار" شیفتہ کی روایت کے مطابق وہ کچھ دنوں نواح عظیم آباد

میں بھی رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ علی لطف نے اپنے تذکرہ میں جو گلزار ابراہیم سے ماخوذ ہے۔ بہاری شعرار کے حالات لکھے ہیں، ان تذکروں کے علاوہ بہار کے مشہور تذکرے ''تذکرۂ عشقی''، ''تذکرۂ شورش''، ''تذکرہ روز روشن'' و ''معراج الخیال''، عبرتی بہار کے محققین کے علاوہ دہلی، لکھنؤ اور دکن کے ارباب فکر و ذوق کی نظروں سے ناپید ہیں، بہار کے دور متاخرین میں بعض شعرا نے مفید تذکرے لکھے اور وہ طبع ہو کر اطراف ملک میں پہونچے بھی مثلاً شوق نیموی کا تذکرہ ''یادگار وطن''، شاد کی ''نوائے وطن'' اور ''حیات فریاد''، صفیر کا تذکرہ ''جلوۂ خضر''، نواب امداد امام اثر کی ''کاشف الحقایق'' شوق اور شاد کے تذکروں میں عموماً معاصرین کے حالات ہیں جلوۂ خضر اور کاشف الحقایق بہت بسیط تذکرے ہیں۔ لیکن بہار کے چند شعرا کے کمالات کا اعتراف کرنے کے علاوہ ان میں کوئی بہاری شاعری کی خصوصیات سے بحث نہیں کرتا، صفیر نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ زبان اُردو کا عروج، دہلی اور لکھنؤ تک محدود ہے[۱]۔ لیکن میری یہ تحقیق ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کی طرح دکن اور بہار کے بھی مخصوص اسکول ہیں جس طرح حکومت کی سرپرستی ایرانی صوفیہ و شعرا کی آمد اور مقامی اثرات نے دہلی و لکھنؤ اسکول کی تخلیق کی انھیں اثرات کے ماتحت بہار اور دکن میں بھی اُردو شاعری کو عروج ہوا۔

سب سے پہلے یہ غور کرنا ہے کہ دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول کی تخلیق جن اثرات کے ماتحت ہوئی بہار اور دکن پر وہی اثرات مترتب ہوئے یا نہیں محض اس بنا پر کہ

---

[۱] جلوۂ خضر جلد (۲)، صفحہ (۱۳)

بہار یا دکن میں دہلی اور لکھنؤ سے شعرا گئے اور انھوں نے وہاں اپنا اثر پیدا کیا۔ بہار اور دکن کے اسکول شاعری کو دہلی اور لکھنؤ کا پرتو نہیں کہا جا سکتا، بیشک بہار میں دہلی سے کثیر تعداد میں شعرا آئے قائم و میر حسن نے اپنے تذکروں میں ان کا حال لکھا ہے مصحفی نے تذکرہ "ہندی گویان" میں اور خلیل نے "گلزار ابراہیم" میں ان کے نام گنائے ہیں ان تذکرہ نگاروں کی روایات کے مطابق فغاں، فدوی، ضیا، عشق دہلی سے بہار میں آکر بہت دنوں رہے، اور ان میں بعض یہیں سپرد خاک ہو گئے، شاہ رکن الدین عشق تو بہت پھولے پھلے، آپ صوفی سجادہ نشین تھے، مریدوں کا حلقہ ہو گیا، آج بھی پٹنہ میں آپ کی خانقاہ "تکیہ شریف" کے نام سے موجود ہے جہاں سالانہ عرس ہوا کرتا ہے۔

بہار کے مشہور غزل گو شیخ غلام علی راسخ (متوفی ۱۲۳۸ھ) میر سے جا کر ملے[1] شاد کہتے ہیں یہ ملاقات لکھنؤ میں ہوئی اشکی و جمال نے خواجہ میر درد سے شرف نیاز حاصل کیا[2]۔ لکھنؤ سے مرزا دبیر و میر انیس اور ان کے برادران و عزیزان باکمال بارہ سال تک مسلسل ہر سال ہفتوں تک پٹنہ میں مہمان رہتے[3] اور دبیر نے تو آرہ کو بھی رونق بخشی؛ امیر مینائی ۱۳۰۵ھ میں عظیم آباد میں تشریف لائے اور لوگوں کو اپنے کلام سے محظوظ[4] فرمایا، محض اس آمد و رفت سے بہار کو دہلی یا لکھنؤ کا زلہ ربا نہیں کہا جا سکتا ورنہ پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ دہلی اسکول کی تخلیق دکن نے کی، اور لکھنؤ اسکول دہلی کی پیداوار ہو

---

[1] تذکرہ آبحیات [2] حیات فریاد [3] جلوہ خضر جلد ۲ صفحہ ۲۶۴ [4] جلوہ خضر جلد ۲ صفحہ ۲۸۹

تذکروں میں مذکور ہے کہ ولی دکنی کا دیوان دہلی میں آیا تو لوگوں نے ریختہ گوئی کی طرف توجہ کی[1]۔ اسی طرح دہلی سے میر و سودا، ضاحک و انشا، ضیا و حسن، مصحفی و جرأت وغیرہ کا لکھنؤ میں آکر سکونت اختیار کرنا تذکروں میں موجود ہے۔ ان واقعات کے ہوتے ہوئے اگر دہلی اسکول کی اصلیت تسلیم کی جاتی ہے، اور لکھنؤ اسکول کو دہلی اسکول کا پرتو نہیں کہا جاتا، تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ صفیر بلگرامی کی طرح اُردو زبان کی ترقی و عروج کو دہلی اور لکھنؤ تک محدود کر دیا جائے، اور بہار و دکن کو اس کا خوشہ چیں سمجھ لیا جائے۔

دنیا میں اکثر ایسا ہوا ہے کہ ایک ہی قسم کے اثرات و ماحول نے چند مسالک کی تخلیق کی، فلسفہ و مذہب دونوں کی تاریخیں اس حقیقت سے مالا مال ہیں یہودی فلسفہ اسکندریہ اور فلسفۂ اشراقی دونوں ایک ہی دور کی چیزیں ہیں، سابق الذکر کے علمبردار "فیلو" (Philo) اور آخر الذکر کے بانی فلاطینوس (Plotinus) دونوں کے افکار میں مماثلت پائی جاتی ہے بعض سطحی اہل قلم نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے اثر و تاثر، فعل و انفعال کا نتیجہ بتایا لیکن محققین کے نزدیک یہ نظریہ حقیقت سے دور ہے واقعہ یہ ہے کہ یہودیوں سے یونانی بُت پرست نفرت رکھتے تھے، اور اس لئے یہ کبھی ممکن نہ تھا کہ ان میں باہم اثر و تاثر کی کارفرمائیاں ہوتیں اس لئے اہل نظر و تحقیق نے یہ فیصلہ کیا کہ فلسفہ کے ان دونوں اسکولوں نے ایک ہی اثر کے ماتحت

---

[1] مخزن نکات صفحہ ۱۰۔ تذکرہ جلوۂ خضر جلد ا صفحہ ۹ ۷ ۔ ۸۷

خود مختارانہ ترقی کی، بدھ و جین مذاہب کی تاریخ میں بھی اس قسم کی شہادت ملتی ہے قدیم علمار کا خیال تھا کہ یہ دونوں ایک ہی مسلک کے دو نام ہیں، یا پھر جین مذاہب بدھ مذہب کا پرتو ہے درانحالیکہ اس کو واقعہ سے کوئی سروکار نہیں جین مذہب بدھ مذہب سے بہت قدیم ہے۔

یہی حال بہار و دکن کے اسکولوں کا ہے۔ ہر چند اس وقت وضاحت کے ساتھ اس پر بحث نہیں ہوسکتی، کہ دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ اور کیا یہی اجزائے ترکیبی بہار اور دکن اسکول کی تخلیق میں معاون ہوئے پھر بھی ایجاز و اختصار کے ساتھ عرض کیا جائے گا۔

دہلی اسکول کی تخلیق میں ایرانی شعرا و صوفیہ کی آمد، اور سلاطین و امرا کی ادب نوازی و بارش کرم کو بڑا دخل ہے، چنانچہ محمد مقیم ہروی (صاحب اکبر نامہ) اور بدایونی (صاحب منتخب التواریخ) نے سیکڑوں شعرا کے نام گنائے ہیں، جو عہد اکبری میں وارد ہندوستان ہوئے، عبدالباقی نہاوندی نے عبدالرحیم خانخاناں کے نام سے "مآثر رحیمی" لکھی، اور خانخاناں کی سخاوت دریادلی اور علم دوستی کے بے شمار واقعات سپرد قلم کئے، عرفی، ظہوری، نظیری، ملک قمی سیکڑوں شعرا اس کے خوان کرم کے ریزہ چیں تھے، اس کے بعد جہانگیر سے لیکر اورنگ زیب تک برابر شعرائے ایران کی آمد رہی، صائب، رکنائے کاشی، ابوطالب کلیم، طالب آملی، مرزا موسوی خاں فطرت اسی دور میں آئے، تذکرہ کلمات الشعرا سرخوش

اس دور کی ادبی سرگزشت کی، مختصر مگر جامع تاریخ ہے اس کے بعد سلطنت مغلیہ کا سب سے خطرناک، لیکن علمی و ادبی حیثیت سے نہایت تابناک دور محمد شاہ کے عہد حکومت سے شروع ہوتا ہے، یہیں سے فارسی اُردو میں منتقل ہوتی ہے، اور یہیں سے دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول کے فرق و امتیاز کی بنیاد پڑتی ہے۔ عہد متاخرین کے مشہور فارسی اور اُردو کے اکابر شعرا اسی دور کی پیداوار ہیں، اس عہد میں والہ داغستانی علی حزیں ہندوستان میں آئے آزاد بلگرامی اور خان آرزو کا یہی دور تھا۔ اسی عہد کے مستند علمی خیالات "ریاض الشعراء" (والہ داغستانی) "مجمع النفائس" (خان آرزو) "سرو آزاد" (غلام علی آزاد بلگرامی) اور تذکرۃ الاحوال" (شیخ علی حزیں) میں ملتے ہیں۔ میر تقی، قائم اور گردیزی نے شعراء ریختہ کے حالات میں اپنے تذکرے کسی قدر تقدم و تاخر کے ساتھ اسی عہد میں لکھے ان تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ فارسی شعرا تیزی کے ساتھ ریختہ کی طرف رجوع کرتے جاتے تھے، الغرض ایرانی شعرا کی آمد، فارسی و ہندوستانی زبان کے میل جول اور سلاطین و امراء کی علمی و ادبی سرپرستی نے اُردو شاعری میں دہلی اسکول کی بنیاد ڈالی، اب آیئے ہم بتائیں کہ بہار و دکن میں انھیں اثرات نے خود مختارانہ اُردو کو نشو و نما دی، دکن کے متعلق صرف اشارے کردوں گا، عہد بہمنیہ میں حافظ و جامی کو بلانے کے لئے ایران میں دعوت نامہ جاتا ہے، حافظ شیرازی ہورمز تک آتے ہیں لیکن پھر وطن واپس چلے جاتے ہیں، جامی خواجہ محمود گاواں وزیر اعظم سے معذرت کر لیتے ہیں۔ شیخ آذری اسفرائنی احمد شاہ بہمنی کے زمانہ میں دکن میں آتے ہیں، فیروز شاہ بہمنی خود بڑا شاعر تھا، تاریخ فرشتہ میں اس کے

اشعار بہت ہیں عروجی تخلص کرتا تھا، آدان عادل شاہیہ میں بھی سلاطین نے شاعری کی، یوسف عادل شاہ یوسف اور اسمٰعیل عادل شاہ وفا بلند پایہ شعرا گزرے ہیں، قطب شاہی حکومت کا بانی سلطان قلی قطب شاہ خود ریختہ کا شاعر گزرا ہے، قایم کی روایت کے مطابق محمد قلی قطب شاہ کے زمانہ میں ریختہ گوئی کو بڑا عروج تھا اسی زمانہ میں استرآباد سے میر مومن تشریف لائے ان کو حکومت کے معاملات میں بھی درخور تھا۔شفیق دکنی نے اپنے تذکرہ ،،شام غریباں،، میں ان ایرانی شعرا کو جمع کر دیا ہے جو ہندوستان میں آئے - بہار میں بھی شعرائے ایران اور صوفیہ کی آمد رہی۔ تذکرۂ صبح صادق میں ان کثیر ایرانی شعرا کے حالات مذکور ہیں جو عظیم آباد میں مقیم رہے۔ خان آرزو نے مجمع النفائس میں شیخ علی حزیں کے ورود عظیم آباد کا حال لکھا ہے ——— عہد عالمگیری کے مشہور ایرانی شاعر معز فطرت بھی عظیم آباد کے حاکم مقرر ہو کر گئے تھے، ان کا ایک فارسی اُردو مخلوط شعر نکات الشعرا، مخزن نکات اور جلوۂ خضر (جلد ۱ صفحہ ۱۰۷) میں مذکور ہے، عظیم آباد میں ایرانی شعرا کی اس آمد کا سلسلہ شاد کے زمانہ تک جاری رہا، چنانچہ اُنھوں نے بھی ملا حاجی بابا کا ذکر کیا ہے (ملاحظہ ہو حیات فریاد صفحہ ۱۳۲) بہار نے جوشش، راسخ اور شاد پیدا کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اس کا بھی ایک مخصوص اسکول ہے اور خود ہمارے عہد کے مایۂ ناز مفکر حضرت نیاز کا یہ قول کہ ،،شاد کا مثل نہ تو دہلی اسکول میں کوئی شاعر ہوا اور نہ لکھنؤ اسکول میں،، اس حقیقت پر مہر تصدیق ثبت کر دیتا ہے۔ خیر یہاں تک تو ایک ضمنی بحث تھی، اب آیئے غور کریں کہ اصطلاحات دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول کی کیا تعریف ہے ؟ عام طور پر جذبات کی شاعری کو دہلی اسکول

کی شاعری اور صنائع بدائع اور لفظی تکلفات کو لکھنؤ کی شاعری سے تعبیر کیا جاتا ہے، اسی لحاظ سے دہلی اسکول کی شاعری میرؔ سے شروع ہو کر غالبؔ پر ختم ہوتی ہے اور لکھنؤ اسکول کا دور ناسخؔ سے شروع ہو کر امیرؔ وغیرہ پر تمام ہوتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ میرؔ سے قبل اردو شعرار، خان آرزوؔ، شاہ حاتمؔ، آبروؔ کو کس اسکول کی طرف منسوب کیا جائے گا، میں شاکر ناجیؔ، یکرنگؔ وغیرہ کو نظر انداز کر دیتا ہوں، حالانکہ یہ لوگ بھی سلسلۂ ارتقا کی کڑی ہی کے لحاظ سے اپنی جگہ سنگین حقیقتیں ہیں، میں یہ تقسیم ماننے کے لئے طیار نہیں کہ جس مقام اور ماحول میں افراد کے اندر انقلاب ہو اور وہ افراد کوئی سیاسی یا ادبی شاہراہ اختیار کریں تو اس سیاست وادب کو اسی مقام اور ماحول کی طرف منسوب ہونا چاہیئے۔ غالبؔ کے بعد دہلی میں کون شاعر ہوا جس نے دہلی اسکول کی صحیح علمبرداری کی۔ بعض اصحاب نسیمؔ اور داغؔ کا نام لیں گے لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں، داغؔ کی زبان دہلوی تھی، لیکن ان کے جذبات پر اودھ ہی کے تخیلات کام کر رہے تھے، وہ دہلی اور لکھنؤ اسکول کے امتزاج واختلاط کا حقیقی آئینہ ہیں، یہی وجہ ہے یو۔پی کے مشاہیر شعرار ریاضؔ[۵] نے داغؔ کے دامن تربیت میں پناہ لی، داغؔ کے رجحان و ذوق پر اودھ کی رنگینیاں اثر انداز تھیں، اسی ہمرنگی نے یو۔پی کے اور شعرار کو بھی داغؔ کی طرف متوجہ کر دیا۔

---

۵ ریاضؔ خیرآبادی نے کبھی داغؔ سے اصلاح نہیں لی۔ ریاضؔ فی الحقیقت اسیرؔ کے شاگرد تھے بعد کو امیرؔ مینائی سے بھی کچھ دنوں استفادہ کیا۔ (نیاز)

یہ حقیقت ہے کہ لکھنؤ اسکول، غازی الدین حیدر سے قبل کوئی چیز نہ تھا، میں نے ابھی ابھی ظاہر کیا ہے کہ دورِ محمد شاہی سیاسی اعتبار سے بہت زیادہ نازک تھا لیکن ادبی اعتبار سے حد درجہ انقلاب آفریں گزرا ہے، اسی عہد یعنی ۱۱۳۳ھ میں سلطان محمد شاہ رنگیلے کی طرف سے سید محمد امین کاظمی اودھ کے صوبہ دار مقرر ہوئے، یہ نیشاپور کے رہنے والے تھے، یہی سلطنت اودھ کے بانی گزرے ہیں، انھوں نے شیخ زادوں کو نکال کر لکھنؤ پر قبضہ کیا۔ ان کے بعد ان کے داماد ابوالمنصور صفدر جنگ صوبہ دار اودھ ہوئے جب ۱۱۶۶ھ میں اُن کا انتقال ہو گیا تو شجاع الدولہ کو صوبہ داری ملی، یہ بھی ۱۱۸۸ھ میں رہرو ملک بقا ہوئے ان کے بعد نواب آصف الدولہ نے صوبہ کی حکومت سنبھالی آصف الدولہ خود بڑے پائے کے شاعر تھے آصف تخلص کرتے تھے، دہلی میں شاہ عالم آفتاب شعر کہتے تھے، اسی زمانہ میں کسی قدر تقدم و تاخر کے ساتھ، میرزا مظہر، خان آرزو، میر اور سودا گزرے ہیں۔ آصف الدولہ نے ۱۲۱۲ھ میں رحلت کی۔ نواب سعادت علی خاں نے صوبہ داری کا نظم و نسق شروع کیا، اسی عہد میں انشاء اور خلیل نے مشترکہ سعی سے اُردو کی مایۂ ناز کتاب ”دریائے لطافت“ لکھی۔ ۱۲۲۹ھ میں نواب سعادت علیخاں نے وفات کی، اور غازی الدین حیدر نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لی، اکبر شاہ ثانی کا زمانہ تھا، انگریزوں نے غازی الدین حیدر کو مطلق العنان بادشاہ بنا دیا اور حکومت کی تبدیلی کے ساتھ زبان میں بھی تبدیلی ہوئی۔ ابھی تک لکھنؤ دہلی اسکول کا تتبع تھا۔

نیرو میرزا، ضاحک و ضیا، استاد جرأت شعرائے دہلی کا دور دورہ تھا کہ قدرت نے اُردو شاعری میں انقلاب کی ضرورت سمجھی اور اسی نے ناسخ کی تخلیق کی۔ "ما ننسخ من آیۃ او ننسہا نأت بخیر منہا او مثلہا"، ناسخ نے زبان کی اصلاح کی طرف توجہ کی دہلی اسکول بھی میر و مرزا نے بھی اصلاحیں کی تھیں، لیکن ناسخ کی اصلاحات و اصولِ زبان نے اُردو کی کایا پلٹ دی، دہلی اسکول میں مومن کے زمانہ تک اُردو کا وہ انداز نہ تھا، جو ناسخ نے ان سے بہت قبل لکھنؤ اسکول میں جاری کر دیا تھا۔ ناسخ نے زبان اُردو پر جو احسانات کئے ہیں وہ لسانیات کی نہایت اہم چیزیں ہیں، اس سلسلہ میں صفیر بلگرامی کی جلوۂ خضر (جلد ۲ صفحہ ۳۲-۱۰۴) قابل مطالعہ ہے۔ ناسخ کے عہد میں لکھنؤ کے اندر خواجہ آتش بھی تھے۔ ایک طرف ناسخ اور ان کے تلامذہ رشک، برق، وزیر، بحر، آباد سحر، شہید، اثر، کوثر اور مسیحا لکھنؤ اسکول کو چار چاند لگا رہے تھے؛ دوسری طرف اُنکے ہم چشم خواجہ آتش اور ان کے تلامذہ اصغر، اعظم، افضل، اوج، بسمل وغیرہ یا بقول صفیر "۳۸ ماہ اوجِ کمال"، اپنی ضیا باریوں سے لکھنؤ اسکول کے نخل کی آبیاری کر رہے تھے ناسخ اسکول نے بہار پر بھی بہت اثر ڈالا تھا۔ چنانچہ اسی خانوادہ کے مشہور چشم و چراغ شمشاد نے شوق نیموی، قیس آروی، تمنا پھلواروی اور رہبر آروی پیدا کئے لیکن زمانہ نے اتنی کروٹیں بدلیں، زبان و طرز بیان میں اتنا انقلاب ہو گیا کہ اب نہ تو دہلی اسکول ہی باقی ہے اور نہ لکھنؤ اسکول، اور نہ صرف اودھ بلکہ بہار میں بھی ناسخ اسکول کے چند بے کیف اور بے مایہ مقلدین سسک رہے ہیں، یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ زبان اُردو

اس قدر آگے بڑھ گئی ہے کہ اب نہ تو دہلی اسکول کوئی قابل قدر چیز رہ گیا ہے اور نہ لکھنؤ اسکول جس کو متاخرین نے چوٹی، کنگھی، مسی، جوبن کے مزخرفات سے بدنام کر رکھا تھا ناسخ نے زبان میں جو انقلاب پیدا کر دیا تھا، ان کو اُن کے تلامذہ نے تکمیل تک پہونچا دیا اب ان کی باقیات محض سعی لاطایل سے کام لے رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ صوبہ اودھ کے مشہور بلاد موہان، مراد آباد، کاکوری، بدایوں، میرٹھ اور اکبر آباد سے ایک جدید اسکول پیدا ہوا جس کو نہ دہلی سے واسطہ ہے نہ لکھنؤ سے حالی پر جو عہد حاضر کے نظم نگاروں کے اوّلین اُستاد ہیں غالب کا کافی اثر تھا لیکن صرف تغزل میں، ان کی نظم نگاری انقلاب زمانہ کی پیداوار ہے۔ حالی کے بعد پنجاب کے فرزند اقبال نے اسکو بہت بڑی ترقی دی، اس پر مغربی ادب وخیال کا اضافہ کیا۔ اب یو۔ پی میں جوش، سیماب دکن میں علی اختر، بہار میں ڈاکٹر عظیم جمیل شمس، ارمان اس اسکول کو فروغ دے رہے ہیں۔ بہرحال عہدِ حاضر میں اُردو زبان کے اندر تغزل ونظم نگاری کے اعتبار سے جو انقلاب ہو گیا ہے، اس کو میں محض دہلی اسکول کی طرف منسوب کرنے کے لئے تیار نہیں ہاں صوبۂ اودھ کے اس دور کی شاعری کو " لکھنؤ اسکول کی انقلابی شاعری " سے تعبیر کرتا ہوں۔ اب آیئے فرداً فرداً اودھ کے اُن باکمال شعرا کے کلام پر کسی قدر مفصل تبصرہ کیا جائے۔

حسرت۔ حسرت کی شاعری پر نقد وتبصرہ کا حق جلیل احمد قدوائی نے جس بصیرت اور نکتہ رسی کے ساتھ ادا کیا ہے اس سے کسی کو انکار نہیں، اس انتقاد نے خود

جلیل صاحب کی زندگی کے بعض نقوش نمایاں کر دیئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ذوقِ سلیم کے ساتھ جب تک راہ عشق سے آگہی نہ ہو، جلیل صاحب کی طرح کوئی حسرت کی شاعری کے حقایق و نکات کو سمجھ بھی نہیں سکتا یہ اُردو زبان کی خوش نصیبی ہے کہ اسے حسرت جیسا شاعر نصیب ہوا، اور حسرت کو ممنون ہونا چاہیئے جلیل کا جنھوں نے صحیح معنی میں دنیا سے ان کا تعارف کرایا۔ جلیل صاحب کے نقد و تبصرہ کے بعد حسرت کے متعلق کچھ خامہ فرسائی کرنا تحصیل حاصل ہے لیکن آہنگ تسلسل کو قایم رکھنے کے لئے مجبوراً چند سطور لکھنا ہی ہیں

سب سے پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ حسرت کی شاعری کے محرکات کیا ہیں ؟ جلیل صاحب کی طرح میرا بھی ایمان[۱] ہے کہ حسرت کی شاعری کا اولین محرک اُن کا دلولہ عشق ہے، جسے زمانہ نے ہمیشہ محروم کامرانی رکھا، خود حسرت کا اعتراف ہے۔

یاد ایام کہ ہم جوشِ جنوں میں حسرت　　　خوار پھرتے تھے پریشان بیابانوں میں

شاعر نے دشت نوردی کی ہو یا نہیں لیکن یہ بالکل حقیقت ہے کہ اس نے شاعرانہ مبالغہ سے کام نہیں لیا، یقیناً وہ میر کی طرح "جوشِ جنوں" کے دورے گزرے اور اسی

---

[۱] آپ اور جلیل دونوں کا "ایمان" غلط ہے۔ حسرت میں کبھی وہ دلولۂ عشق پیدا نہیں ہوا جس کی محرومی و ناکامی ایک شخص کو شاعر بنا سکتی ہے حسرت شاعر پیدا ہوا تھا جو بغیر عشق کئے بھی شعر کہہ سکتا تھا۔ حسرت کی شاعری عشق سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ اس کی شاعری نے اُسے عاشق مزاج بنایا۔ فاضل مقالہ نگار نے ثبوت میں جو شعر پیش کیا ہے وہ درست نہیں، کیونکہ حسرت بیابانوں میں کبھی خوار نہیں پھرا، زندانوں میں گرفتار ضرور رہا ہے۔ اس نوع کے ادعائے شاعری سے کسی شاعر کی سیرت پر حکم لگانا مناسب نہیں۔
(نیاز)

عشقبازی نے ان کے اخلاق و کردار پر گہرا اثر ڈالا، فرماتے ہیں :-

نہ بغض وحسد ہے نہ غصہ نہ کینہ — گئے عیب سب عشقبازی میں حسرت

بے اختیار ہمیں اس وقت ظہوری ترشیزی کا یہ شعر یاد آرہا ہے۔

برائے کینۂ اغیار در دلم جانیست — شدہ است سینۂ ظہوری پُر از محبت یار

حسرت کی شاعری میں نہ کوئی فلسفیانہ پیام ہے، نہ کوئی شاعرانہ معنی آفرینی و نکتہ سنجی بلکہ وہ سیدھے سادے الفاظ میں اپنی کیفیات عشقیہ کو بیان کر دیتے ہیں انھوں نے جس معصومانہ اور پاکبازانہ انداز میں عشقیہ معاملات پر روشنی ڈالی ہے، وہ ہمیں خسرو اور اطالوی شاعر ڈانٹے (Dante) کی یاد دلاتے ہیں، اس میں شک نہیں اسی عشق نے گوئٹے سے "آلام ورتھر" (Sorrows of Werther) لکھوایا اور نواب مرزا شوق سے "زہر عشق"، لیکن گوئٹے اور شوق دونوں کے یہاں غم عشق ولولہ انگیز ہوا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماہرین نفسیات کی تحقیق کے مطابق ان کے عشق کے اندر جذبۂ جنسی (Sexual Instinct) کی کارفرمائیاں ہیں۔ اسکے برخلاف خسرو، ڈانٹے اور حسرت ہمیں محبت افلاطونی کی طرف رہنمائی کرتی ہیں خسرو کی شاعری بھی تشائم (Pessimistic) ہو لیکن اسمیں میر، ضیا، قایم اور فانی کی قنوطیت نہیں پائی جاتی، کیونکہ ان کے یہاں غم سرمایۂ نشاط بن جاتا ہے، اس کے برخلاف خسرو اور حسرت کے یہاں غم و یاس، دل و جگر میں ایک جانکاہ ہوک پیدا کر دیتے ہیں۔ خسرو کا شعر ہے

گرچہ با خسرو از و برگ و نوائے نہ رسید — شاد اباد ات گلستانِ جوانی ہر روز

حسرت فرماتے ہیں :۔

آہ وہ یاد کہ جس یاد کو ہو کر مجبور
دل مایوس نے مدت سے بھلا رکھا ہے

دونوں شعروں کو پڑھیے اور پھر سوچیے کہ خسرو اور حسرت سپردگی و فنا دگی اور حسرت سنجی و ناکامی کے اعتبار سے کس قدر ایک دوسرے سے قریب ہیں۔

حسرت کا دیوان ہمیں بے طرح ڈانٹے (Dante) کی یاد دلاتا ہے ، جو بقول اطالوی نقاد ادب میزینی ڈانٹے کے عنفوان شباب کی خوشبو ہے ، ڈانٹے نے اپنی زندگی کے اٹھائیسویں برس نظم و نثر دونوں میں "بیٹرس" (Beatrice) کے ساتھ اپنے عشق کا حال لکھا ، ڈانٹے نے جہاں پر اپنی محبوبہ کی رحلت کا تذکرہ کیا ہے وہاں طرز و بیان کے اندر ایسی عظمت و کشش پیدا ہو گئی ہے کہ میزینی بول اُٹھتا ہے کہ اس کا ترجمہ یا تو شیلی (Shelley) کر سکتا تھا یا پھر عہد حاضر میں اس کا حوصلہ کسی عورت ہی کے دل و دماغ کو ہو سکتا ہے ، ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ حسرت کی شاعری میں فلسفیانہ و حکیمانہ پیام نہیں ، بلکہ وہ خسرو اور ڈانٹے کی طرح اپنی عشقیہ کیفیات ، سوگ اور بروگ کا حال بیان کرتے ہیں ، ان کا شعر ہے :۔

علم و حکمت کا جنھیں شوق ہو آئیں نہ ادھر
کچھ نہیں فلسفۂ عشق میں حیرت کے سوا

اس سلسلہ میں اُنھوں نے محبت و سرفروشی کے اسرار و نکتے بیان کئے ہیں کہ رہ عشق کا ایک بے خبر انسان حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا ہے ، میں نے اگلے سطور میں اشارہ کیا تھا کہ حسرت کے عشق میں جوانی کی ہوس رانیوں کو دخل نہیں اُنھوں نے بالکل سچ کہا ہے

دیارِ شوق میں ماتم بپا ہے مرگِ حسرتؔ کا　　وہ وضعِ پارسا اُس کی وہ عشقِ پاکباز اُس کا

اور یہیں سے عشقِ افلاطونی (Platonic Love) کا سراغ ملتا ہے۔ عشقِ افلاطونی کیا ہے؟ ایک پاکباز محبت! گوشت پوست کی دنیا سے مجرد، ایک معصومانہ تخیل۔ یہاں ایک غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ میں حسرتؔ کی شاعری کو اسی دنیا کی چیز سمجھتا ہوں، وہ فلسفۂ اشراقین (Neo Platonism) کے نفسِ کل اور وحدت و کثرت کے مسائل نہیں بیان کرنے لگتے، اور نہ ان کا محبوب ماوراء آب و گل کوئی چیز ہے، بلکہ اُن کا معاملۂ عشق اسی دنیا کے ایک پیکرِ مادی کے ساتھ وابستہ ہے، لیکن اس کے اندر جوانی کی بے مستیوں اور جذبۂ جنسی کے داعیات کا پتہ نہیں، ان کے سارے کلام میں ان کی "وضعِ پارسا" اور "عشقِ پاکباز" کی کارفرمائیاں نظر آتی ہیں۔

حسرتؔ نے اپنے کلام میں نسیمؔ، مومنؔ و میرؔ کے ساتھ اپنی ارادت و عقیدت کا اظہار کیا ہے اور اپنے خیال میں خود کو ان کا ہم رنگ بتایا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کے مفصلہ ذیل اشعار قابلِ ذکر ہیں :-

حسرتؔ تری شگفتہ کلامی پہ آفریں　　یاد آ گئیں نسیمؔ کی رنگیں بیانیاں

حسرتؔ یہ وہ غزل ہے جسے سن کے سب کہیں　　مومنؔ سے اپنے رنگ کو تو نے ملا دیا

شیرینیٔ نسیمؔ ہے سوز و گداز میرؔ　　حسرتؔ ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

مگر حسرتؔ صاحب مجھے معاف فرمائیں گے مجھے ان سے اتفاق نہیں اور میرے خیال میں انھیں فارسی شعرا کی روش پر مقطعات میں اس نوع کی شاعرانہ رائے زنی کا حق

تو ضرور تھا، خواجہ حافظ، خواجو وظہیر کی سیادت تسلیم کرتے ہیں۔ رومی "ماازپئے سنائی وعطار آمدیم" لکھتے ہیں۔ غالب ظہوری کے تتبع پر نازاں ہیں:۔

غالب بہ شعر کم ز ظہوری نیم ولے ‫ ‫ عادل شہ سخن رس دریا نوال کو

حسرت کو بھی یہ حق حاصل تھا، ان سے کوئی مواخذہ نہیں، لیکن حقیقت یہ ہو کہ حسرت کو نسیم و مومن سے دور کا بھی واسطہ نہیں، اور میر کے نشاط انگیز غم کا حسرت کے یہاں باوجود کوشش بھی پتہ نہیں لگتا، میر کے یہاں غم سرمایۂ لذت ہے، اس پر میر کے محاسن شعری مستزاد ہیں۔ میر کا شعر ہے:۔

مغاں مجھ مست بن پھر خندۂ قلقل نہ ہووے گا ‫ ‫ مئے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے رووے گا

اس نوع کی شاعری کا حسرت کے کلام میں کہیں پتہ نہیں، یا پھر میر کا یہ شعر پڑھئے:۔

قاصد جو واں سے آیا تو شرمندہ میں ہوا ‫ ‫ بیچارہ گریہ ناک و گریباں دریدہ تھا

اس طرح کے تخیل شعری اور شاعرانہ معنی آفرینی سے حسرت کو کوئی لگاؤ نہیں، اور انھوں نے خود اعتراف کیا ہے

شعر میرے بھی ہیں پُر درد ولیکن حسرت ‫ ‫ میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

ہاں ان کا یہ ادعائے سخن ایک حد تک صحیح ہو سکتا ہے:۔

قائم ہے ترے دم سے طرز سخن قائم ‫ ‫ پھر ورنہ کہاں حسرت یہ رنگ غزلخوانی

ؔ حسرت کا یہ دعویٰ کہ ان کے کلام میں مومن، نسیم اور میر تینوں کا رنگ پایا جاتا ہے بالکل صحیح ہی حیرت ہے کہ عبدالمالک صاحب حسرت کے یہاں مومن کا رنگ نہیں پاتے (بقیہ نوٹ ملاحظہ ہو صفحہ آئندہ پر)

بعض مستثنیات کے ساتھ میر، ضیا اور قایم ایک ہی سرچشمۂ انوار کی کرنیں ہیں، میر حسن نے قایم کو طالب آملی کا ہمرنگ بتایا ہے یہ بالکل بے جوڑ سی بات ہے، پھر بھی اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، کہ حسرت کے کلام میں میر کا سوز و گداز اور قایم کی سوختہ سامانی دونوں پائی جاتی ہیں۔ اب آیئے ان کے اشعار پر مختصر سا تبصرہ کریں۔

بھولے سے وہ ادھر بھی جو آنکلے تھے کہیں
اس دن کا بھولتا ہی نہیں ماجرا مجھے

جلیل صاحب نے بھی مقدمہ میں یہ شعر لکھا۔ اور اس پر اپنے خالص معصومانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے، یہیں سے مجھے سراغ ملا کہ جلیل صاحب بھی حسرت کی طرح "حریف بادہ پیما" ہیں، حقیقت یہ ہے کہ "انتخاب شعر" سے بھی انسان کبھی "رسوا" ہو جایا کرتا ہے۔

جلیل صاحب نے مقدمہ میں حسرت کا یہ شعر بھی دیا ہے :۔

ہم سے ہر چند وہ ظاہر میں خفا ہیں لیکن
کوشش پرسش حالات چلی جاتی ہے

حسرت نے اس شعر میں جس عاشقانہ احساس و پندار کا اظہار کیا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے، عشقیہ معاملات کے نکتے اُنھوں نے اس عمق نظر کے ساتھ بیان کئے ہیں کہ بعض اوقات ہم حیران رہ جاتے ہیں اور حسرت کے کشف و کرامت کا اقرار کرنا پڑتا ہی، لیکن کشف و کرامت سے آپ یہ نہ جان لیں کہ میں حسرت کو صوفی صافی سمجھتا ہوں، گو اپنی

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۸) درآنحالیکہ کلام حسرت میں طرز مومن کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں، اسی طرح نسیم کا رکھ رکھاؤ بھی حسرت کے یہاں بہت پایا جاتا ہے۔ البتہ میر کا رنگ بیشک پھیکا ہے اور وہ بھی لفظی حیثیت سے معنوی حیثیت سے نہیں۔ (نیاز)

بلندی اخلاق اور پاس وضع کے لحاظ سے وہ کسی بڑے سے بڑے زاہد برگزیدہ سے کم نہیں، کیا شعر کہے ہیں :۔

نہ بھولے گا وہ وقت رخصت کسی کا مجھے مڑ کے پھر اک نظر دیکھ لینا

وہ شرمائی صورت وہ نیچی نگاہیں وہ بھولے سے ان کا ادھر دیکھ لینا

مصر کے مشہور نقاد ادب ڈاکٹر زکی مبارک نے، نقد شعر و ادب کے سلسلہ میں "صور شعریہ" کو بڑی اہمیت دی ہے، "صور یہ شعریہ" یہ ہے کہ ہم کسی منظر، یا کیفیت کو اس طرح بیان کریں کہ منظر کی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آجائے، یا وہ کیفیت خود ہمارے اندر طاری ہو جائے، حسرت کے اشعار بالا پڑھئے اور غور کیجئے اگر مرقع چغتائی کی طرح کبھی کسی مصور کے موئے قلم نے اس کو نقش کیا تو دیکھنے والوں کا کیا حال ہو گا۔ غالب کا مشہور شعر ہے :۔

نگاہ بے محابا چاہتا ہوں تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

حسرت کہتے ہیں :۔

ہو وہاں شان تغافل کو جفا وہ بھی گریز التفات نگہ یار کہاں سے لاؤں

الغرض حسرت اپنے ادائے بیان اور شعریت کے اعتبار سے ایک مخصوص انفرادیت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری منطق و مطالعہ کی مرہون منت نہیں بلکہ اس کے اندر محض داخلیت کی کارفرمائیاں ہیں۔

اصغر۔ اصغر کی شاعری پر کچھ روز ہوئے "نگار" میں ہمارے محترم حضرت نیاز مدظلہ نے

نقد و تبصرہ کیا تھا، میں حضرت موصوف کو محض ادیب و شاعر نہیں جانتا بلکہ میں ان کو عہد حاضر کا سب سے بڑا مفکر اور پیام بر سمجھتا ہوں، ممکن ہو لوگوں کو اس میں فرط ارادت کی کار زمائیاں نظر آئیں اور وہ میری اس نیاز کیشی کو (Negative Self-feeling) کا نتیجہ سمجھیں، لیکن اس اعتقاد کے لئے میرے پاس دلائل و براہین ہیں جو "نیاز نامہ" کی صورت میں بہت جلد ملک کے سامنے آئیں گے، بہر حال باوجود اس ارادت کے میں ان کا مقلد نہیں اور میں ان کی اصابت رائے کا پیہم تجربہ رکھنے کے باوجود ان کی ہر رائے سے پہلے بلا ذاتی تحقیق کے اتفاق نہیں کرتا حالانکہ میری ذاتی تحقیق و کاوش بھی اکثر و بیشتر اسی نتیجہ پر پہونچاتی ہے، اصغر کے متعلق بھی میں نے ذاتی تحقیق کی اور مجھے صاف گوئی کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس معاملہ میں مجھے حضرت نیاز سے اتفاق نہیں۔

نیاز صاحب اصغر کی شاعری کو بہ حیثیت مجموعی اچھی چیز ضرور سمجھتے ہیں لیکن انکے صوفیانہ رنگ کو وہ پسند نہیں کرتے، ان کے نزدیک تغزل کے اندر صوفیانہ افکار کا اختلاط مستحسن نہیں، مجھے یہیں سے نیاز صاحب سے اختلاف ہے، یہ اختلاف ذوق و وجدان کا ہے اس لئے یوں بھی اس کے لئے دلیل و برہان کی ضرورت نہیں، لیکن پھر بھی کچھ کہنا ہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب عورت و محبت، حسن و رنگ، لذت و الم، حیات و موت ہمارے جذبات کے اندر برانگیختگی اور عضلات میں ہنگامہ پیدا کر دیتے ہیں، تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ تصوف جو نام ہے ایک پاکباز محبت کا اور کثرت کے اندر وحدت کی جلوہ آرائیوں

کا، انسان کے اندر شعر گوئی کی صلاحیت پیدا نہ کر دے، یہی وجہ ہے کہ تصوف، فلسفہ اور شعریت کے امتزاج سے دنیا میں بڑے بڑے شعرا پیدا ہوئے، شوپنہار اور ابن سینا فلسفہ کے ساتھ شاعری کا بھی بلند ذوق رکھتے تھے۔

ابن عربی، رومی، میر، درد کی صوفیانہ شاعری، بالخصوص صوفیانہ رنگ تغزل سے کس کو انکار ہو سکتا ہے، ترجمان الاشواق اور دیوان شمس تبریز ہمیں اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ مادی محرکات عشق نے میر، کیٹس، نظیری اور ابن ابی ربیعہ پیدا کئے تو روحانی محرکات عشق نے بھی اس دنیا میں کچھ کم خدمتیں انجام نہیں دیں، جس طرح تخیلات و تصورات ایک اسکول سے دوسرے اسکول، ایک عہد سے دوسرے عہد میں منتقل ہوتے ہیں اسی طرح صوفیانہ شاعری کے تخیلات دوسری صدی ہجری سے برابر شعرائے متاخرین کو اثر پذیر کرتے رہتے ہیں۔ درد و غالب دونوں کے کلام پر اس رنگ کا اثر پڑا، دونوں نے ادائے بیان میں مختلف اسلوب اختیار کئے ہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ سنائی و عطار، رومی و عراقی کے کلام میں بے ساختہ پن ہے اور صوفیانہ افکار ان کی شاعری پر نفسیاتی ابتہاجیت کے طور پر چھائے ہوئے ہیں لیکن متاخرین میں صوفیانہ شاعری کے اندر تقلیدی رنگ غالب ہے وہ محسوسات کی دنیا سے الگ ہو کر اصول و ضابطہ کے ماتحت صوفیانہ شاعری کرتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے اشعار فلسفۂ اشراقی کا مسئلہ بن جاتے ہیں، غالب کے یہاں یہ بدعت زیادہ ہے۔ اصغر نے اس کی تقلید کی، بہرحال اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ (Suggestibility) کے اندر جاں کسی کے اندر کسی شخص کی

برتری و فوقیت کا احساس ہوتا ہے وہاں "قانون مقارنت" کو بھی بڑا دخل ہے، ہمارے عہد میں بہت بڑے بڑے علمار و ادب موجود ہیں لیکن ہم کسی ایک سے زیادہ اثر پذیر ہوتے ہیں اس کی وجہ وہی ہے کہ اس کے افکار ہمارے نفسیاتی "حال" کے زیادہ مطابق ہیں، اصغر کا بھی یہی حال ہے کہ صوفیانہ شاعری بالخصوص غالب کے تتبع میں انھوں نے اپنے تغزل کی بنیاد تصوف پر رکھی[1]۔

---

[1] میرے متعلق اکثر لوگوں کو یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے کہ میں شعر میں "رنگ تصوف" پسند نہیں کرتا اور اسی لئے میں اصغر کی شاعری کا معترف نہیں ہوں۔ تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کا موقع تو یہ نہیں ہے، تاہم چونکہ بات "سخن گسترانہ" آپڑی ہے، اس لئے مختصراً کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔

"تصوف" کا مفہوم دنیا نے جو کچھ قرار دیا ہو، مگر میں اُسے اتنی بلند چیز سمجھتا ہوں کہ اگر دنیا کے مذہب میں اس کا وجود نہ ہو تو پھر مذہب میں کوئی کشش باقی نہیں رہتی، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ ریاضی وطبعیات کی طرح کوئی ایسا علم نہیں ہے جو نظریات واصطلاحات کا محتاج ہو وہ بالکل اخلاقی دنیا کی چیز ہے اور اس کا تعلق انسان کے وجدان سے ہے۔ مثلاً یہ محسوس کرنا کہ تمام افراد نوع انسان ایک ہی چیز ہیں اور ان سب کو باہم گر محبت وہمدردی کی زندگی بسر کرنا چاہئے، یقیناً تصوف ہے۔ لیکن اس احساس کی صداقت وحقانیت کے ثبوت کے لئے حیز اصلی، مظہر کل، ناہد، اناہد وغیرہ کی اصطلاحات وضع کرنا اور "ذات وصفات" کے جھگڑے پیدا کرنا قطعاً تصوف سے خارج ہے۔ میں شاعری میں وجدان تصوف کے آثار وعلائم دیکھ کر بہت لطف اندوز ہوتا ہوں لیکن اصطلاحات تصوف کا استعمال میری طبیعت کو مکدر کر دیتا ہے اور میں ایسا محسوس کرنے لگتا ہوں کہ میری وجدانی کیفیت کم ہوتی جارہی ہے اور ایسا ہونا چاہئے کیونکہ اس صورت میں ذہن معنویت کی طرف سے خارج کی طرف منتقل ہوتا ہو (بقیہ نوٹ صفحہ آئندہ پر)

اب آیئے اس تمہیدی بیان کے بعد اصغر کی شاعری پر بحث کریں، اصغر کی شاعری کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ میرا خیال ہے کہ غالب کی صوفیت اور مومن کی معنویت دونوں

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۳) اور شاعری بالکل منطق کا مسئلہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ شاعری میں نعت گوئی سب سے ادنیٰ درجہ کی چیز سمجھی جاتی ہے، لیکن میں اس سے بھی لطف اٹھاتا ہوں اگر واقعی کوئی کیفیت اس میں پائی جائے۔ صمالہ آبادی کا شعر ہے:-

اور مدینہ میں خدائی کے بلانے والے

منتظر اور بھی دو چار ہیں آنے والے

میں اس شعر کو تمام کلیات محسن پر ترجیح دیتا ہوں، کیونکہ اس میں صرف جذبات ہیں اور یہاں سوائے تکلفات شاعری کے اور کچھ نہیں۔ شہیدی کا ایک شعر تصوف کے رنگ میں ملاحظہ ہو:-

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر

تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

اس کے مقابلہ میں غالب کے اس شعر کو پڑھئے:-

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا

یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اور خود فیصلہ کیجئے کہ ان میں کونسا شعر اپنا اثر چھوڑ جاتا ہے۔

میں شعر میں تصوف کا رنگ بہت پسند کرتا ہوں، لیکن صرف اسی حد تک کہ شعر کی شعریت باقی رہے اور ہمارے وجدان کو اصطلاحات تصوف میں الجھا کر تباہ نہ کیا جائے۔ اصغر کے یہاں تصوف کا رنگ اکثر و بیشتر یہی ثقیل صورت اختیار کر لیتا ہے اور اسی لئے میں اسے پسند نہیں کرتا

(نیاز)

کو ملا دیجئے اصغر کی شاعری کا ہیولیٰ بن جائے گا۔[1] جس طرح مومن کے اشعار ہمیں دعوت غور و فکر دیتے ہیں اسی طرح اصغر کا کلام بھی ہمیں فوراً لطف اندوز نہیں ہونے دیتا، میر و حسرت کی طرح آپ اس کے کلام کو سنتے ہی سر دھننے لگیں ممکن نہیں، یہ شعر گوئی اچھی ہے یا بری یہ طبائع کے ذوق و وجدان اور امعان نظر پر موقوف ہے نیاز صاحب جب مومن کی شاعری کو پسند کرتے ہیں، تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اصغر کی یہ دقت پسندی اُن کو ناگوار گزرے۔[2]

اصغر غالب کے صوفیانہ افکار سے پوری طرح اثر پذیر ہیں، سر سپرو نے اصغر کے کلام پر نہایت بصیرت افروز طریقہ سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

---

[1] مجھے اس تجزیہ سے اختلاف ہے۔ مومن کی تو اصغر کو ہوا بھی نہ لگی تھی اور غالب کے تصوف سے بھی انھیں کوئی واسطہ نہ تھا، اصغر کی شاعری کے اجزائے ترکیبی میری رائے میں تین ہیں غالب کی دقت پسندی، اقبال کی گہرائی اور خود اُن کا ذاتی "صوفی پن" سو اپنی کم علمی کی وجہ سے وہ غالب و اقبال کے رنگ کو تو نباہ نہ سکے، رہ گئی ان کی "صوفیت"، سو چونکہ وہ بھی اصطلاحی قسم کی مستعار صوفیت تھی، اس لئے "شاہد و مشہود" کے خشک استدلالات سے آگے نہ بڑھ سکی۔

اصغر بہت ذہین شخص تھے اور فطرت کی طرف سے انھیں سوچنے کا اچھا سلیقہ عطا ہوا تھا؛ لیکن افسوس ہے کہ مافی الضمیر کے اظہار کے لئے ان کو مناسب الفاظ نہ ملتے تھے۔ لیکن اگر کسی جگہ وہ اس میں کامیاب ہو گئے ہیں تو اس میں شک نہیں کہ بے مثل شعر کہہ گئے ہیں (نیاز)

[2] کجا مومن کی دقت آفرینی اور کجا اصغر کی اہمال پسندی، مومن "محذوفات" سے فنی اشارے (Artistic Suggestion) پیدا کرتا ہے اور اصغر "زوائد" سے مفہوم کو مسخ اور انداز بیان کو غیر شاعرانہ بنا دیتے ہیں، "دشتان بین خل و خمر"، "شراب سرکہ" میں کچھ تو فرق کرنا چاہیے (نیاز)

"حکیمانہ خیالات کو جن میں جذبات کی شدت و لطافت بھی ہو، شعریت کے رنگین و پُر کیف لباس میں پیش کرنا جناب اصغر کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جسے ان کے ہر ناقد نے تسلیم کیا۔ (مقدمہ "سرودِ زندگی" صفحہ ۸)

موصوف کی رائے اپنی جگہ پر بالکل قطعی ہے، اصغر کہتے ہیں :-

میں ہوں ازل سے گرم روِ عرصۂ وجود　　　میرا ہی کچھ غبار ہے دنیا کہیں جسے

اس شعر کے پڑھنے کے بعد ہم کسی قدر سوچ میں پڑ جاتے ہیں کیا واقعۃً اصغر نے جو تخیل اپنے شعر میں پیش کیا ہے اس پر ان کا اعتقاد بھی تھا، اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو ان کے شعر سے فلسفہ کا ایک خاص مسلک ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

جرمنی کے شہرۂ آفاق فلسفی "ہیگل" کی طرح اسی سرزمین کا ایک اور مفکر "ہیکل" (Haeckel) گزرا ہے وہ کہتا ہے کہ حدوث کے سوا کوئی شے مستقل و پائدار نہیں، صرف "جوہر" قدیم اور ناتغیر پذیر ہے، خواہ ہم اس جوہر کو فطرت یا ہیولی سے تعبیر کریں یا خدا یا روح عالم سے "جوہر" کا قانون ہمیں سکھاتا ہے کہ وہ ہمارے سامنے لامتناہی انواع و اقسام کی صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے لیکن اس کی مخصوص صفات مادہ اور قوت مستقل ہیں، جوہر کے تمام انفرادی اشکال و صور برباد ہو جانے والے ہیں اصغر نے بھی ہستی کی گرم روی کا جو فلسفہ بیان کیا ہے وہ ہیکل سے ملتا جلتا ہے۔[1]

---

[1] اسی قسم کے مباحث شعر کو نکرہ بنا دیتے ہیں اور تصوف کا یہی وہ پہلو ہے جس نے تصوف کو لغو اور بے کار کر دیا۔　(نیاز)

اصغر کے کلام پر غالب کا کافی اثر ہے، اُن کے بعض خیالات، صوفیہ (بالخصوص رومی) کے افکار سے اثر پذیر معلوم ہوتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

نظامِ دہر کیا بیتابیوں کے کچھ مظاہر ہیں — گدازِ عشق گویا روح ہے اجزائے عالم کی
شعاعِ مہر خود بیتاب ہی جذبِ محبت سے — حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ شبنم کی

اس سلسلہ میں رومی کی وہ غزل پڑھئے جس کے دو شعر یہ ہیں:۔

تنِ من چو ماہ ماند کہ زعشق می گدازد — دلِ من چو زنگ زہرہ کہ گسستہ دار بادا
بہ گدازِ ماہ منگر بہ گسستگیِ زہرہ — تو حلاوتِ غمش بیں کہ یکے ہزار بادا

اصغر فرماتے ہیں کہ "نظامِ دہر جسے تم کہتے ہو، وہ کوئی نظام ہے تھوڑا ہی، دہر ایک تماشا گاہ بیتابی ہے، عالم کے اجزائے ترکیبی ہی میں عشق کی گھلاوٹ ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ آفتاب بھی کشش عشق کی بنا پر شبنم کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے، ورنہ بیچاری شبنم میں جو اُڑنے کی طاقت ہے وہ ہمیں اور آپ کو معلوم ہی ہے، رومی کہتے ہیں کہ میرا جسم عشق سے اسی طرح گھلا جا رہا ہے جس طرح چاند گھُل گھُل کر گھٹتا ہے، اور میرا دل چنگ زہرہ کی طرح گسستہ تار ہے پھر فرماتے ہیں کہ چاند کی گھلاوٹ اور زہرہ کی گسستہ تاری پر نہ جاؤ، بلکہ انکی حلاوت غم پر غور کرو، کہ جس نے ایک شے کے مختلف اجزا کر دئے"، اصغر نے جہاں فلسفیانہ اشارات اور صوفیانہ رموز پیش نہیں کئے وہاں اُن کے کلام میں اور زیادہ کیفیت پیدا ہو گئی ہے، فرماتے ہیں:۔

بہائے دردِ الم دردِ غم کی لذت ہے — وہ ننگ عشق ہے جو آہ ہو، اثر کے لئے

ان کا یہ شعر مجھے بیحد پسند ہے:-

نہ میں دیوانہ ہوں اصغرؔ نہ مجھ کو شوق عریانی — کوئی کھینچے لئے جاتا ہے خود جیب و گریباں کو

"جیب و گریباں" پر کسی صاحب نے اعتراض کیا تھا جس کا جواب نیاز صاحب نے دیدیا ہے

جگرؔ۔ جگر کا کلام "شعلۂ طور" کے نام سے میرے پیش نظر ہے، اس کی ورق گردانی کرنے کے بعد جو عجیب و غریب چیز نظر آئی وہ جناب سید سلیمان ندوی کا تعارف ہے۔ سید سلیمان صاحب میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں وہاں بعض خطرناک یا تکلیف دہ قسم کی کمزوریاں بھی ہیں، سید صاحب اپنے استاد مولانا شبلی کی طرح علم و ادب کے ہر شعبہ پر کچھ نہ کچھ اپنا تصرف ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ شبلی مرحوم تو (Genius) تھے، نباہ لے گئے، ہر چند اس زمانہ میں مشکل ہی سے ان کی کوئی تصنیف ہوگی جو محققین کی ایراد و اعتراض سے پاک ہو، ان کے حامیین کہہ سکتے ہیں اعتراض تو قرآن پر بھی ہوتا ہے، لیکن میں کہونگا کہ ایسا اعتراض نہیں بلکہ المبرد کی طرح جس نے ابو نواس کے چند شعروں پر اعتراض کیا تھا اور جسے اس نے اپنی کتاب العقد میں درج کیا ہے۔ ابن خلکان "وفیات الاعیان" میں اپنا ایک خواب لکھتے ہیں جس میں المبرد ظاہر ہوتا ہے اور آپ معترضین کے اقوال نقل کرتے ہیں جو ابو نواس کے سلسلہ میں اس کے ایراد پر لوگوں نے کئے ہیں، وہ خواب میں بھی اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہے۔ شبلی مرحوم اگر زندہ ہوتے تو ان کو سیرۃ النبی، سیرۃ النعمان، شعر العجم کی خامیاں اور غلطیاں ماننا ہی پڑتیں مگر ہمارے سید صاحب کہ قدرت کی طرف سے شبلی جیسا ذہن بھی نہیں لے کر آئے ہیں اس پر آپ کی یہ اپچ حد درجہ حیرت انگیز ہے، انسان بھی ذوق نمود سے بعض اوقات کیسی

حد تک مجبور ہو جاتا ہے۔ نتیجہ وہی ہوا کہ ارض القرآن، سے لیکر آپ کی کل تصنیفات پر لوگوں نے اعتراضات کی بھرمار کردی اور آج تک آپ کسی کا شافی جواب نہ دے سکے، ممکن ہے کسی کا جواب دیا ہو، میری نظر سے نہیں گزرا، بہرحال شعلۂ طور کا تعارف بھی سید صاحب کی اس جابرانہ تصرفات کی قسم کی چیز ہے، اس سے پہلے جناب نیاز صاحب نے "نگار" میں آپ کے ذوق شعری پر تبصرہ کیا تھا، ابھی تک آپ کا وہ مقدمہ داغ جگر نظر سے نہیں گزرا، میں آج تک سمجھے بیٹھا تھا کہ نیاز صاحب نے سنجیدہ شوخی کی، اور پھر کبھی فرط ہیجان میں وہ ایسا کر بیٹھتے ہیں گو جب وہ شوخ سنجیدگی پر اُتر آتے ہیں تو اپنی مثال نہیں رکھتے۔

سید صاحب کا "تعارف" پڑھنے کے بعد میں دنگ رہ گیا، کیونکہ آج تک مجھے صرف یہ خبر تھی کہ لوگ ان کی علمی تحقیقات اور ادبی ذوق کے منکر ہیں، میرے اندر کبھی بھولے سے بھی یہ بدعقیدگی نہیں پیدا ہوئی کہ سید صاحب کے اخلاق و سلوک کی طرف سے بھی کبھی شک وارتیاب ہو سکتا ہے، مگر میں نے شعلۂ طور،، میں "تعارف،، کے یہ چند سطور پڑھے تو آپ یقین مانئے کہ خلاف معمول میری طبیعت میں سخت قسم کی برہمی پیدا ہوئی فرماتے ہیں :-

"اس وقت حاضرین میں مولانا مسعود علی ندوی، مولانا عبدالسلام صاحب ندوی اور دوسرے کمرے میں جہاں آواز جا سکتی تھی، پروفیسر عبدالباری صاحب ندوی تھے اور ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر سخن فہمی کا مدعی اور موجودہ شعرا کے عیب و ہنر سے واقف، ان عنایت فرماکے اس تعارف نے گدگدی پیدا کی اور جی چاہا کہ شاعر صاحب سے کچھ سُنا جائے اور ان کے اس دعوئ سخن وری کا امتحان لیا جائے، سب کی نظریں

ایک خاص نگاہ تبسم کے ساتھ شاعر کے چہرے کی طرف اُٹھیں، مگر اس نے اس ماحول سے بے پروا ہو کر ایک عجیب درد انگیز ترنم مست لہجہ اور سرشار انداز میں ایک غزل کا ترانہ چھیڑا ایک دو شعر پڑھے تھے کہ سب کو سنبھل جانا پڑا، ذہن کی رو کو ظرافت سے متانت کی طرف پھیرنا پڑا تبسم کی نگاہ میں تحیر ہوا" (شعلۂ طور صفحہ ۲-۳)

میں نہیں کہہ سکتا مولویانہ بطون کی اس سے بڑھ کر کوئی افسوسناک تشہیر ہو سکتی ہے میں پوچھتا ہوں، یہ نووارد شاعر جگر تھے، اُنھوں نے شبلی ہال کے دنگل میں سب کو پچھاڑ دیا، اگر کوئی معمولی درجہ کا انسان ہوتا، تو کیا آپ اپنے زعم کمال میں اس طرح کنکھیاں چلاتے، اس طرح پھبتیاں کرتے، یہ حال ہے اُس جماعت کا جو جلوۂ محراب و منبر کے وقت رو رو کر، "ان الذین اجرموا کانو من الذین آمنوا یضحکون واذا مرّوا بھم یتغامزون واذا انقلبوا الی اھلھم انقلبوا فکھین"، کا وعظ کہا کرتی ہے جو اپنے ظاہری تقدس اور مصنوعی ریزش جبیں کے صلہ میں قوم سے دست بوسیوں کی طلبگار رہے ؎

گرنہ بیند براں دیدہ کا ینجا نہ شود گریاں

آپ ہی جیسے حضرات کی کرامت نے تو علما کی شان برقرار رکھی ہے، سچ ہے صومعہ سے نکل کر جب کوئی مولوی صنم خانہ اور میکدہ میں پہونچتا ہے تو اُس کی گرم نگاہیاں اور دست درازیاں بڑے سے بڑے کہنہ مشق شاہد بازوں، اور بلانوش میخواروں کو بھی شرما دیتی ہیں۔ اسی "تعارف"، کے سلسلہ میں ہمارے مولانا فرماتے ہیں:۔

"آخر اعظم گڈھ اور شبلی منزل کی یہی تحسین و آفرین تھی، جو داغ جگر کی دل پذیر

شکل میں ملک کے سامنے آئی اور سب نے جگر کو جگر جانا،، میں اس پر صرف اس جملہ کا اضافہ کر دینا چاہتا ہوں کہ شبلی منزل کی اس جگر نوازی کی اشاعت میں حضرت نیاز نے بھی بہت بڑا حصہ لیا ورنہ دنیا جگر کے محاسنِ شعری کا احساس تو کبھی نہ کبھی ضرور کرتی مگر شبلی ہال کا ذوقِ سخن فہمی پردۂ کتمان ہی میں رہ جاتا سید صاحب جگر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں

،، جگر مست ازل ہے اس کا دل سرشارِ الست ہے، وہ محبت کا متوالا اور عشق حقیقی کا جویا، وہ مجاز کی راہ سے حقیقت کی منزل تک اور بتخانے کی گلی سے کعبہ کی شاہراہ کو اور خمخانہ کے بادۂ کیف سے خود فراموش ہو کر بزم ساقی کوثر تک پہونچنا چاہتا ہے،،

جی ہاں، مولانا سچ کہا وہ تو جگر نے خود ہی فرمایا ہے:-

قدم ڈگمگائے نظر بہکی بہکی ‏ ‏ ‏ ‏ جوانی کا عالم ہے سرشاریاں ہیں

اس وقت مجھے جناب نیاز کے یہ جملے بے طرح یاد آرہے ہیں کہ ،، جگر کی شاعری پر نقد و تبصرہ کرنے سے سید سلیمان ندوی کا مقصود یہ کچھ تھوڑا ہی تھا کہ جگر کے محاسن شعری پر روشنی ڈالی جائے، بلکہ خیال یہ تھا کہ اپنے ذوقِ سخن فہمی پر مہر توثیق ثبت کردی جائے،، اور میرے خیال میں سید صاحب نے یہ کر ڈالا،، فبای حدیث بعدہٗ یومنون،،۔ اب آیئے جگر کی شاعری پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے، یہ تو ظاہر ہے کہ جگر نے اصغر کی تربیت و اصلاح سے استفادہ کیا جس کا اعتراف خود اُنھوں نے شعلۂ طور میں کیا ہے، جگر کے بہت سے اشعار میں اُستاد کے رنگ کی جھلک پائی جاتی ہے، لیکن ہر جگہ جگر کی انفرادیت بھی قائم ہے، جگر نے اصغر کی طرح غالب و مومن کا گہرا مطالعہ کیا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

ان کے بعض اشعار سے جگر کے کلام کا توارد ہوگیا، جگر کا شعر ہے:۔

عشق کو مطمئن نہ رکھ حسن کے اعتماد پر
وہ تجھے آزما چکا تو اسے آزمائے جا

غالب کا مشہور شعر ہے:۔

حسن اور اس پہ حسنِ ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

دونوں شعر ایک ہی مرکزی تخیل کے پرتو ہیں۔

مومن کہتے ہیں:۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

جگر کا شعر ہے:۔

وہ ہمارے قریب ہوتے ہیں
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اس سے معلوم ہوتا کہ غالب و مومن کے مطالعہ نے جگر کے تخیل پر اپنے کافی نقوش چھوڑے ہیں، اس حد تک کہ بعض اوقات وہ غیر شعوری طور پر اُن کے کلام کو اپنا کلام سمجھنے لگتے ہیں۔

سید سلیمان صاحب ندوی نے "تعارف" میں ضمناً حافظ، خیام اور ابن یمین کا نام لیا ہے، لیکن یہ نہیں لکھا کہ اُردو میں حافظ کے رنگ کا کوئی شاعر ہوسکتا ہے تو وہ جگر ہے وہی سرشاری، وہی میخواری، وہی رنگینی و شاہد بازی جس پر تصوف کا دھوکہ ہوجائے جگر کے یہاں بھی ہیں، خواجہ حافظ کی شاعری نشاط و ابتہاج، رجائیت و تفاول (Optimism) کی شاعری ہو ان کے یہاں آرزو و تمنا کی ربوبیت بدرجۂ اتم ہے

یہاں تک کہ جب وہ اپنے شاہد کو "حبیب بادہ پیما" کے ساتھ بادہ نوشی کے لئے مستعد پاتے ہیں تو بھی "بہ یاد آر حریفانِ بادہ پیمارا"، کہہ بیٹھتے ہیں جو رجائیت کی انتہا ہے۔

جگر کی غزلیں پڑھنے والے کے دل و دماغ پر ایک کیف و مستی پیدا کر دیتی ہیں، ان کی بعض غزلیں جو بحر طویل میں ہیں عمدہ درجہ اثر آفریں ہیں، ان کا شعر ہے:۔

عجب انقلاب زمانہ ہے مرا مختصر سا فسانہ ہے

یہی اب جو بار ہے دوش پر یہی سر تھا زانوئے یار پر

پوری غزل پڑھ جایئے، اس کا ہر شعر ایک کیفیت و اثر میں ڈوبا ہوا ہے اسی طرح ان کی وہ غزل بھی بہت دلآویز ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے:۔

اسے حال و قال سے واسطہ نہ غرض مقام و قیام سے

جسے کوئی نسبت خاص ہو ترے حسن برق خرام سے

فانی۔ جس طرح شبلی اپنے عہد بلکہ اپنی صدی کے سب سے بڑے غزل گو کی حیثیت سے ہمیں میر سے قریب نظر آتا ہے، اسی طرح فانی اسکاٹ لینڈ کے مشہور ترین غزل گو رابرٹ برنس کے مثل معلوم ہوتے ہیں۔ اہل نظر ان کو عہد حاضر کا میر کہتے ہیں میرا خیال ہے ضیا اور فانی اور بڑی حد تک قائم میں بھی میر ہی کا سوز و گداز پایا جاتا ہے، ضیا تو بقول مصحفی، میر کے شاگرد ہی تھے، (تذکرہ ہندی گویان ذکر ضیا) فانی کے اندر میر کی شاعرانہ رفعت خیال تو نہیں لیکن والہانہ جذبات وہی ہیں، میر ہی کی طرح ان کے یہاں بھی غم سرمایہ نشاط بن جاتا ہے، فانی کے مشہور اشعار ہیں:۔

چلے بھی آؤ یہ ہے قبرِ فانی دیکھتے جاؤ　　　تم اپنے مرنے والے کی نشانی دیکھتے جاؤ
سُنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے　　　کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

حسرت اور فانی میں فرق یہ ہے کہ حسرت کی غمناکیوں کے اندر ایک جانکاہ کیفیت ہو اس کے برعکس فانی کے یہاں غم میں بھی ایک ولولہ ہے، وہ اس سے بھی ایک لذت انگیز کیفیت حاصل کرتے ہیں، فانی کا دوسرا شعر غالب کے اس خیال سے مل جاتا ہے

زمن بہ جرم تپیدن کنارہ میکردی　　　بیا بہ خاک من و آرمیدنم بنگر

یہ فخر صوبہ یو پی کو حاصل ہے کہ ہندوستانی ادب اور مسلمانوں کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کرنے کی خدمت اسی سرزمین کے ہونہار فرزندوں نے انجام دی۔ گو حالی نے اردو ادب میں ایک نئی زندگی پیدا کردی اور اُن کا مسدس اُردو ادب کا ایک غیر فانی شاہکار ہے لیکن اسمٰعیل میرٹھی نے بھی کم خدمت نہیں کی ہے۔ ان کی اخلاقی، قومی اور اصلاحی نظموں اور اکبر کی شوخ تنقیدوں نے نہ صرف مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں ایک عالمگیر آگہی و بیداری پیدا کردی بلکہ وہ اقبال، جوش، سیماب جیسے باقیات صالحات بھی چھوڑ گئے جنھوں نے ان کے مشن کو ترقی دی، اور نہیں کہا جاسکتا ارتقار کا یہ سلسلہ کس سطح پر جاکر تمام ہوگا۔ یہ بات لطف سے خالی نہیں کہ اُردو ادب کی اس نئی صنف کو ترقی دینے میں یو۔ پی ہی کے نوجوانوں اور پختہ کاروں نے زیادہ حصہ لیا، گو اُردو نظم کے بانی مولانا حالی پنجاب کے رہنے والے تھے، لیکن اسمٰعیل، جوش، سیماب اور احسان کا وطن یو۔ پی ہی ہے۔

جوش نے تغزل کی طرف سے گویا منہ موڑ لیا ہر چند ان کی کتاب "شعلہ وشبنم" میں ان کی قدیم غزلوں کے ساتھ جدید غزلیں بھی چھپی ہیں، اب انھوں نے نظم نگاری ہی کو اپنا طرۂ امتیاز بنا لیا اس صنف پر ان کی قابل قدر کتابیں "نقش ونگار" "شعلہ وشبنم" اور "فکر ونشاط" وغیرہ شائع ہو چکی ہیں ان کے مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ حالی نے اردو ادب میں جس صنف کی داغ بیل ڈالی تھی، اور جسے اقبال نے مغربی ادب کے امتزاج سے چمکایا، جوش بھی اسی نخل کی آبیاری کر رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جوش ابھی حکیمانہ ارشاد وپیام کے لحاظ سے اقبال کی سطح سے بہت نیچے ہیں اقبال نے یورپ جا کر اس صنف کا گہرا مطالعہ کیا اور جرمن اور انگریز شعرا سے کافی طور پر استفادہ کیا، اقبال اپنی علمی استعداد کے اعتبار سے انگریز شاعر گولڈ سمتھ اور ندرت فکر کے اعتبار سے گوئٹے کی ہمنوائی کرتے ہیں پھر اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ جوش کی نظموں میں اقبال سے زیادہ ادبی شگفتگی اور کشش پائی جاتی ہے۔ الغرض اقبال کے بعد نظم نگاروں میں اوّل درجہ جوش ہی کا ہے ان کی کتاب "شعلہ وشبنم" بہت سی اخلاقی اور قومی نظموں کی حامل ہے شعلہ وشبنم کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بائرن (Byron) سے بہت قریب ہیں۔ بائرن کی ہنگامہ زائیوں نے اسے عرفی کی طرح وطن سے ہجرت کرنے پر مجبور کیا میسزینی (Mazzini) کا بیان ہے کہ قریب تھا کہ یورپ سے اس کو نکالا جائے، جوش کی نظمیں "نازک اندامان کالج سے خطاب" اور "ذاکر سے خطاب" اسی نوع کی چیزیں ہیں۔

جوش کے بعد سیماب کے کارنامے نظر آتے ہیں آپ کی کتابیں "کلیم عجم" اور

"کارِ امروز" چھپ کر شائع ہو چکی ہیں، اقبال کی طرح داغ ہی سے تلمذ حاصل ہے۔

سیماب کی کتابوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں تخلیقی (Productive) سے زیادہ (Reproductive) رجحان کا غلبہ ہے "کلیم عجم" اور "کارِ امروز" میں ان کی بہت سی نظمیں ہیں لیکن ان میں بیشتر تقلیدی رنگ پایا جاتا ہے، آپ کی ایک نظم گوتم بودھ پر ہے اس میں فرماتے ہیں:-

روشنی جس کی نہ ہوگی ماند وہ مشعل ہے تو
سرزمینِ ہند کا عرفانی اول ہے تو

پہلے تو "عرفانی اول" کی ترکیب ہی کچھ غیر مانوس سی ہے، اس کے علاوہ آپ کا یہ دعویٰ بھی واقعات کے اعتبار سے صحیح نہیں گوتم بودھ سے پہلے جین مذہب کے چوبیس "تری تھنکر" پیدا ہو چکے ہیں اور یہ سب بہت بڑے زاہد مرتاض اور عارف باللہ گزرے ہیں خود گوتم بودھ کے معاصر مہاویر جی جن کا مولد صوبہ بہار کا ایک مقام "کنڈگام" ہے۔ "بودھ" سے زیادہ معمر تھے، اور گوتم سے پہلے مر گئے[1]۔

سیماب صاحب نے "مولدِ غالب" پر ایک نظم لکھی ہے، فرماتے ہیں:-

مولدِ غالب کی یہ ویرانیاں مٹ جائیں گی
نغمۂ سیماب اس پر زندگی برسائے گا

ویرانیوں کا مٹ جانا کچھ عجیب سی بات ہے[2] آثارِ باقیہ البتہ مٹا کرتے ہیں، اس کی

---

[1] The comparative study of Religion مرتبہ فارلنگ

[2] کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ شاعر کا مقصود یہی ظاہر کرنا ہے کہ میں اپنے نغمہ سے اس کی ویرانیاں مٹا دوں گا۔ (نیاز)

مقصود یہ نہیں کہ میں سیاب کی شاعری پر ایراد کروں بلکہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ شاعری سوز یا دہ جس کا وہ عہد صبوت سے خود کو شیفتہ بتاتے ہیں نثر نگاری ان کو زندگی میں کامیاب بناتی اور وہ مفید تر خدمتیں انجام دے سکتے، ان کے ادبی خطبے جو انھوں نے ہندوستان کے مختلف طول و عرض میں شرکت مشاعرہ کی تقریب میں پڑھے ہیں، نظموں سے زیادہ مفید ہیں، بالخصوص وہ خطبے جو انھوں نے مشاعرہ بزم ادب جہلم اور نائی منڈی آگرہ میں پڑھے

(کلیم عجم صفحہ ۱۴۱-۱۵۵- اور صفحہ ۱۶۱-۱۷۱)

ابھی تک تو "جدید لکھنؤ اسکول" کی شاعری پر انفرادی حیثیت سے بحث کی گئی ہے، اب آئیے قدیم لکھنؤ اسکول کی اُس خصوصیت پر بھی ایک طائرانہ نگاہ ڈال لی جائے جس نے بہ ہیئت مجموعی ایک مخصوص رنگ اختیار کیا اور جس کے علمبرداروں میں بعض ہماری نظروں سے ہمیشہ کے لئے او جھل ہو گئے اور کچھ تبرکات کی حیثیت سے ابھی قائم ہیں، جس طرح دہلی اسکول غالب اور مومن کے بعد فنا ہو گیا اور باوجودیکہ خاندان مومن میں تسیم خاندان غالب میں حالی اور خاندان ذوق میں داغ ہوئے لیکن انھوں نے اپنے اُستادوں کی شاہراہ سے الگ ہٹ کر شاعری شروع کی، اسی طرح لکھنؤ اسکول بھی خاندان ناسخ کے نام لیوا سید ضامن علی جلال اور خاندان اسیر کے چشم و چراغ امیر مینائی پر ختم ہو گیا اور اس کے بعد لکھنؤ اسکول میں عزیز، ریاض، صفدر، صفی، نوح، اثر ہوئے اور سب نے بہ اشثنائے حضرت نوح مختلف راہیں اختیار کیں، عرصہ ہوا آرہ میں ایک عظیم الشان مشاعرہ ہوا تھا، دہلی، اودھ اور بہار کے بڑے بڑے شعرا تشریف لائے تھے، میرے بچپن کا زمانہ تھا

صفدر اور نوح بھی رونق افروز بزم تھے، حضرت نوح نے اپنا کلام سنایا اس کے نقوش اس قدر گہرے تھے کہ اب بھی وہ نقشہ اور سماں پیش نظر ہے، اس کے بعد کبھی نوح کا کلام ان کی زبانی سننے کا اتفاق نہ ہوا، آپ کے کلام میں قدیم لکھنؤ کی شاعری کا پورا اثر ہے اُس وقت بھی میں نے یہی محسوس کیا کہ آپ نے صنائع لفظی سے زیادہ کام لیا تھا، اور اب بھی میرا خیال ہے کہ اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا ہے، ریاض پر داغ کا کافی اثر ہے، ان کی خمریات کے مطالعہ سے بے اختیارانہ — ابونواس کی یاد آتی ہے، ان کی طبیعت کی رنگینی اور شباب تا سرمستی دل کے اندر غیر معمولی ابتہاج، وہیجان پیدا کر دیتی ہے، عہد پیری میں ان کے کلام کے اندر اتنی شوخی ہے کہ ان کے بوڑھاپے پر جوانی کا دھوکہ ہوتا ہے، فرماتے ہیں :۔

ہم تو بس اس ادا پہ مرتے ہیں — منھ چھپائے جو کوستا جائے

اور یہ چھیڑ یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ اس پر طرہ یہ ہے :۔

کوئی منھ چوم لے گا اس نہیں پر — شکن رہ جائے گی یونہی جبیں پر

آپ کا ایک شعر ہے، اس کا تیور، اور انداز بیان قابل دید ہے :۔

بڑے پاک باطن بڑی صاف طینت — ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

الغرض، جرأت، داغ، ریاض زندگی کو ابیقورین فلسفہ کی طرح عیش و خرمی میں بسر کر دینا اپنا نصب العین سمجھتے تھے یہ شوخی، لذت و نشاط صاف بتا رہی ہے کہ ان کی طبیعت کا اٹھان ہی ایسا تھا کہ وہ زندگی کو ہنسی اور ٹھٹھول کے سوا کسی سوگ و برگ میں

ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے، بعض انسان طبعاً نشاط پسند ہوتے ہیں ریاض بھی انھیں لوگوں میں تھے۔

چند ماہ گزرے پوجا کی تعطیل میں جب میں پہلے پہل لکھنؤ آیا، تو یہاں کے بعض بزرگوں سے نیاز حاصل کیا۔ اسی سلسلہ میں حضرت صفی کے دولتکدہ پر بھی حاضری دی، آپ وضع قطع اخلاق، و طرز انداز بیان، الغرض اپنے صوری و معنوی خصوصیات کے لحاظ سے قدیم لکھنؤ کی تہذیب و شایستگی، کی باقیات میں سے ہیں، آپ سے درخواست کی گئی کہ اپنے کلام سے فیض یاب فرمائیں، آپ نے بزرگانہ محبت کے تبسم کے ساتھ اسے قبول فرمایا اور اپنی ایک غزل پڑھی سُن کر میں بڑی دیر تک سوچتا رہا کہ تذکروں میں لکھنؤ اسکول کی شاعری اور لکھنؤ کے شعرا کے کلام کا جو حصّہ نظر سے گزرا ہے اس سے ہٹ کر یہ دوسری چیز معلوم ہوتی ہے۔ میں آرہ واپس آیا، لیکن قیام لکھنؤ کے بعض تصورات مہینوں دل و دماغ پر مسلط رہے ان میں اُمید امیٹھوی کا فسانۂ غم اور حضرت صفی کی غزل کا ایک شعر بھی تھا، جب کبھی غم روزگار سے فرصت ملتی تو صفی کا وہ شعر جس کا صرف اب ایک مصرعہ یاد رہ گیا، "بلبل کی طرح نالہ یا اشک بہانا ہے" گنگناتا اور سر دھنتا صفی نے اس شعر میں یہ پیام دیا ہے کہ "اس منزل ہستی میں انسان کو چین کہاں نصیب، اس کی قسمت میں تو بلبل کی طرح نالہ کرنا یا شمع کی طرح اشک بہانا لکھا ہے"، حضرت نے اپنی تالیفات کا تذکرہ کیا جن میں ایک "تنظیم حیات" ہے اور بعض دوسری غیر مطبوعہ تصنیفات کا حال بیان فرمایا، الغرض میں آپ کی شاعری اور اخلاق دونوں سے بہت متاثر ہوا۔

یہاں تک تو تصویر کا ایک رُخ تھا، لیکن اس کے دوسرے رُخ پر اُس وقت نظر پڑی جب میں لکھنؤ آیا انجمن بہار ادب کے ارکان و منصب داروں کی علمی سرگرمیاں دیکھیں اور بزم مشاعرہ میں شعرائے لکھنؤ کا کلام سُنا۔ میں نے اس سے قبل جو کچھ لکھا تھا اس کا ماخذ مطبوعہ کتابیں تھیں، تذکرے تھے، اور بعض سُنی سنائی روایتیں، لیکن لکھنؤ میں آکر ایک دوسری دنیا نظر آئی، جو حد درجہ دلچسپ بھی تھی اور حیرت زا بھی، یقیناً میں نے عہد حاضر کے لکھنؤ اسکول کے متعلق جو کچھ لکھا تھا وہ بالکل سنگین حقیقت ہے اور خاص لکھنؤ والے اپنے تخیل کدہ کے کتنے ہی عجیب و غریب نقوش کیوں نہ پیش کریں، میری رائے میں ترمیم نہیں ہو سکتی۔

میں نے اپنے مقالہ میں لکھنؤ اسکول کی جدید شاعری کا معیار حسرتؔ، اصغرؔ، جگرؔ، فانیؔ، جوشؔ، سیمابؔ، صفیؔ، اثرؔ، آرزوؔ کے کلام کے مطالعہ کی بنا پر قائم کیا تھا، یقیناً ان حضرات نے قدیم لکھنؤ اسکول کی روش سے ہٹ کر غزلیں لکھیں، بعض حضرات کو شکوک ہونگے کہ حسرتؔ، اصغرؔ، جگرؔ، فانیؔ، سیمابؔ وغیرہ کو دہلی اسکول کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے، کیونکہ ان کے کلام میں دہلی اسکول کا رنگ پایا جاتا ہے اور انھوں نے دہلوی اساتذہ سے اصلاحیں لیں، حسرتؔ نے نسیم دہلوی و مومنؔ سے عقیدت کا اظہار کیا ہے سیمابؔ خود داغؔ کے شاگرد ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ خود ان کے اساتذہ کے یہاں دہلی اسکول کے محاسن نہیں پائے جاتے بلکہ دہلی اور لکھنؤ کے امتزاج سے ایک نئے اصول کی جلوہ گری ان کے اساتذہ کے یہاں موجود ہے حسرتؔ، اصغرؔ اور فانیؔ پر ان کے اساتذہ کا رنگ نہیں چڑھ لا

بلکہ اُنھوں نے اپنا انداز بیان ہی جداگانہ اختیار کیا، یہی وجہ ہے کہ حسرت و اصغر، جگر و سیاب صوبہ اودھ کے مشاہیر شعرا اور خاص لکھنؤ کے باکمال اساتذہ، اثر، آرزو و صفی کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد قدرتی طور پر میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ لکھنؤ اسکول کی شاعری میں انقلاب ہو گیا ہے اور اسی بنا پر میں نے اُسے "جدید لکھنؤ اسکول" سے تعبیر کیا، اگر بات یہیں ختم ہو جاتی تو کچھ مضائقہ نہ تھا لیکن انجمن بہار ادب نے اپنا تاریخی مشاعرہ کر کے دنیا کی نظروں سے عقیدت و ارادت کے بعض پردے اُٹھا دیئے، انجمن کی مجلس شوریٰ کے فیصلہ کے مطابق مجھے لکھنؤ آنے پر مجبور کیا گیا اور میں ۲۷ر فروری کو لکھنؤ پہونچا اور سرزمین اودھ کے اس مشہور جلوہ گاہ رنگ و نور میں قیام کیا جو اپنی آغوش میں عشرت ماضی کے بہت سے رنگین فسانے چھپائے ہوئے ہے۔ قیصر باغ کے ایک محل میں ٹھیرا احباب سراج، بدر الدین بدر اور احسان بن دانش سے بھی ملاقاتیں ہوئیں، تھوڑی دیر کے اندر پیاپے انجمن بہار ادب کے سرگرم ارکان نظم و نسق کے سلسلہ میں آئے، اور سب سے تعارف ہوا۔

"انجمن بہار ادب" کے اس تاریخی جلسہ میں مشاعرہ بھی تھا، اور مناظرہ و مناثرہ بھی اور سارے لائحہ عمل کو کامیاب بنانے کے لئے ارکان انجمن کی مستعدی قابل داد تھی، دہلی کانپور، لکھنؤ اور اس کے مضافات کے نامی شعرا آئے، اتوار کے دن شب کے وقت جب میں مشاعرہ میں شریک ہوا تو اتنا بڑا مجمع تھا کہ اتنا بڑا علمی مجمع میں نے صرف علیگڈھ میں اُردو کانفرنس کے موقعہ پر دیکھا تھا، قیصر باغ میں آخری شاہ اودھ کا دیوان عام سامعین کی کثرت اور علماء و فضلا، ادبا و شعرا سے بھرا پڑا تھا آلہ مکبر الصوت نصب کیا گیا تھا اور

اسی کے سامنے شعرا نے اپنی غزلیں و نظمیں اور ادیبوں نے اپنے مقالے پڑھے۔

مشاعرہ کی مختلف صحبتوں میں حاضر رہا اور شام سے دو اور تین بجے شب تک گرمی محفل دیکھا گیا۔ مشاعرہ کی پہلی صحبت میں جب شریک ہوا، تو طلبہ کی تمسخر انگیز تالیاں، سامعین کا قہقہہ نواز شور و فغاں اور سب سے بڑھ کر شعرا کا بکبر الصوت کے سامنے بے سُرتال کے لحن کے ساتھ نغمہ و ترنم دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ بار الٰہا یہ بزم مشاعرہ ہے یا کچھ اور؟ — شعرا اپنا کلام سُنا رہے ہیں یا موسیقی ذبح کی جا رہی ہے۔ یہ شاعرانہ ترنم ریزیاں جناب مجذوب کی بڑ سے لے کر جناب قتیل دمانی کی بلند پایہ غزلوں تک، اور جناب روش کی عشقیہ غزلوں اور احسان بن دانش کی اثر انگیز نظموں سے لے کر جناب سراج او رقدیر کے سقیم شعروں[۱] تک یکساں جاری و ساری تھیں، لکھنوی شعرا نے موسیقی کے پردوں میں خصایص شعریہ کو گم کر دیا، لکھنؤ میں آج وہی کامیاب شاعر ہے جو اچھا گویا ہے اور مشاعرہ میں اسی کو زیادہ داد مل سکتی ہے جو سب سے زیادہ الاپنے کی اہلیت رکھتا ہے، شعر و غنا کے اس لایعنی امتزاج نے اچھے اچھے شعرا کے کلام سے بھی لطف اندوز نہ ہونے دیا، جناب رضا و جناب ارم لکھنؤ کے خوش ذوق شعرا میں سے ہیں، جناب آرزو کی اصلاحوں نے ان کے اندر ایک مخصوص شاعرانہ اہلیت پیدا کر دی ہے، لیکن انھوں نے بھی اپنے شعر سے زیادہ اپنے نغموں کے ذریعہ لوگوں کو مسخر کرنا چاہا، اور مجھے اس کا اعتراف کرنے میں مطلق باک نہیں کہ

---

[۱] میں نے یہ غزلیں نہیں دیکھیں، لیکن یہ جانتا ہوں کہ سراج و قدیر یہاں کے خوش گو و خوش فکر شعرا میں سے ہیں۔ (نیاز)

جناب رضاؔ شعر بھی اچھا کہتے ہیں اور اچھا گاتے بھی ہیں رضاؔ صاحب کا وہ انداز شعر خوانی جس کا یہ اسٹیج پر مظاہرہ کرتے تھے، دل سے کبھی محو نہیں ہو سکتا، جب کبھی دماغ میں وہ نقوش اُبھرتے ہیں تو بے اختیار ہنسنے کو جی چاہتا ہے، رضاؔ صاحب اپنے پاکیزہ اخلاق کے لحاظ سے شاعر سے زیادہ انسان ہیں، اس لئے ان کی طرف سے دل میں ہر شخص ایک جذبۂ لطیف محسوس کرتا ہے، اسی سلسلہ میں جناب عرشیؔ بھی ایک خاص امتیاز کے مالک ہیں وہ نہایت نیک سرشت اور بلند اخلاق کے انسان ہیں اور شعر کا بہت پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں، وہ بھی گا کر پڑھتے ہیں، لیکن ایک خاص دلکش لحن میں کہ شعر کی خصوصیت بھی قائم رہتی ہے اور نغمہ کی دل آویزی بھی۔ ان سے مل کر مجھے بے انتہا مسرت ہوئی۔ انجمن بہار ادب کے اس مشاعرہ نے بہ حیثیت مجموعی میرے دماغ پر بہت بُرا اثر ڈالا، میں نے لکھنؤ اسکول کے دور جدید کے متعلق جو نظریہ قائم کیا تھا، اُس سے خود لکھنوی شعرا کی اکثریت بہت دور تھی، اس میں شک نہیں عہد حاضر میں لکھنؤ اسکول تعبیر ہے، حسرتؔ و اصغرؔ، جگرؔ و فانیؔ، آرزوؔ و اثرؔ صفیؔ و آسیؔ جوشؔ، روشؔ و احسانؔ کی ذات سے لیکن ان میں صفیؔ، آرزوؔ و اثرؔ کے سوا سب لکھنؤ سے باہر کے رہنے والے ہیں، لکھنوی شعرا میں جناب سراجؔ و قدیرؔ اور حضرت آشفتہؔ کے دوسرے تلامذہ[1] میں شاعرانہ ابتذال اور فنی وادبی خامیاں ہیں اور یہ لوگ زیادہ تر مرثیہ خوانی و غنا نوازی کی طرف رجحان رکھتے ہیں[2]۔ اسی بنا پر میں نے رائے قائم کی تھی کہ مشاعرہ میں لکھنؤ

---

[1] سراجؔ و قدیرؔ، آشفتہؔ کے شاگرد نہیں ہیں۔ [2] میری رائے میں عبدالمالک صاحب کا یہ فیصلہ صحیح نہیں — ہو سکتا ہے کہ اس مخصوص جلسہ کی غزلوں میں خامیاں ہوں (حالانکہ میں نے انھیں نہیں سُنا) لیکن عمومی طور پر یہ حکم لگا دینا کہ سوائے ابتذال و خامی یا مرثیہ و غنا کے ان کے کلام میں کچھ نہیں پایا جاتا زیادتی ہے (نیاز)

کے شعرانے جو غزلیں پڑھیں ان میں فنی و افادی خصوصیت تو خیر کیا، البتہ مرثیہ خوانی والا سوز وگداز ضرور پایا جاتا تھا، لکھنؤ کے یہ شعرا جدید لکھنؤ اسکول اور قدیم لکھنؤ دونوں سے بہت دور ہیں قدیم اسکول کی کم از کم یہ اہمیت تو ہمیشہ قائم رہے گی کہ یہ زبان اور فن کے اعتبار سے بہت بلند سطح کی چیز ہے عہد حاضر کے اکثر لکھنوی شعرا نے مرثیہ میں تغزل کا رنگ اور شعر خوانی میں غنا کی صورت پیدا کر دی ہے، انجمن بہار ادب نے احسانؔ و روشؔ کو بلا کر بہت بڑی کامیابی حاصل کی ورنہ مشاعرہ تو کم از کم بے کیف ضرور ہو جاتا، احسانؔ کاندھلہ کے رہنے والے ہیں جو غالباً مظفر نگر کے مضافات میں ہے، اسی طرح روشؔ کا وطن جوالاپور ضلع سہارنپور ہے، احسانؔ کے اندر مطالعہ فطرت کا بہت گہرا ذوق ہے اور وہ بہت عمیق نظر کے ساتھ مناظر کی جزئیات کا مشاہدہ کرتے ہیں، وہ احساسات کے اعتبار سے بہت ہی ذکی الحس اور جذبۂ الفت کے لحاظ سے مکمل انسان ہیں احسانؔ کے دل میں ایک لازوال ہوک ہے، وہ ہر منظر سے عبرت و بصیرت کا پیام حاصل کرتے ہیں وہ ہر درد انگیز سماں دیکھ کر اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ "غم" ان کی زندگی کا سرمایہ بن کر رہ گیا ہے، احسانؔ کو کس چیز نے اس بلند سطح تک پہونچایا، ہر چند ان کی نجی زندگی کے معمولی واقعات بھی ہمارے پیش نظر نہیں لیکن میرا خیال ہے جس ماحول میں ان کی پرورش ہوئی وہ ان کے لئے حد درجہ حوصلہ آزما رہا ہے ہر زمانہ اور اہل زمانہ نے اپنی کم نگاہیوں سے ان کو ہمیشہ دردمند اور سوگوار رکھا، جہاں تک میرا گمان ہے وہ اس خاندان میں پیدا ہوئے جس میں شرافت کی سربلندی تو ضرور تھی لیکن دنیا کی نظر میں دولت و ثروت اور اعزاز و تکریم کے اعتبار سے اس کا کوئی خاص مرتبہ نہ تھا، یہی وجہ ہو کہ احسانؔ نے اس

ماحول میں آنکھیں کھولیں تو خود اپنی زندگی ان کو سوگوار اور دردمند نظر آئی۔ اپنی پامالی اور زبوں حالی کے ساتھ ان کے اندر دنیا کے مصیبت زدہ انسانوں کے ساتھ سچی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے ان کی نظمیں مزدور کی عید اور مزدور کی موت وغیرہ حد درجہ اثر انگیز ہیں اُنھوں نے مشاعرہ میں اپنی نظم "مزدور کی موت" پڑھی تو سارا مجمع اشکبار تھا اور بے اختیار میرا جی چاہتا تھا کہ احسان سے لپٹ کر خوب روؤں، احسان کی یہ نظم ان کا شاہکار ہے اور میرا خیال ہے کہ اس کی نظیر اُردو ادب میں مشکل ہی سے کسی دوسری جگہ مل سکتی ہے اس میں شک نہیں، احسان اپنے مبلغ علمی کے اعتبار سے کسی خصوصیت کے مالک نہیں یہاں تک کہ وہ زبان اور فن کی عامیانہ غلطیاں بھی کر جاتے ہیں، لاہور کے قیام نے ان کی زبان پر پنجابی محاورہ کا اثر بھی ڈالا ہے لیکن ان تمام خامیوں کے باوجود ان کی نظمیں اس قدر اثر انگیز ہیں جب وہ مجمع کے سامنے پڑھتے ہیں تو مجمع پر ایک کیف بیخودی طاری ہو جاتا ہے احسان اپنی معصومانہ فطرت نگاری کے اعتبار سے انگریزی زبان کے مشہور شاعر ورڈسورتھ سے بہت قریب ہیں:-

جناب روشن نوجوان شاعر ہیں، غزل بھی کہتے ہیں اور نظم بھی، شعریت ان پر اس قدر طاری ہے کہ یکسر حال نظر آتے ہیں، صورت میں بھی ایک خاص دلکشی ہے، ژولیدہ مو، سادہ وضع، مضطرب الحال، نوجوان شاعر جب پہلی مرتبہ اسٹیج پر آیا تو میں اسے دیکھ کر بیحد متاثر ہوا اس کی غزلیں ایک خاص پایہ کی تھیں، اس کی عمر اور اس کا رنگ تغزل، اس کا دلنواز لحن دیکھ کر مجھے بے اختیار کیٹس اور عبدالحی تاباں کی یاد آگئی، خدا اسے چشم زخم سے بچائے

روشن نظمیں بھی اچھی کہتے ہیں، لیکن ان کی غزلوں کے عشقیہ رشحات سامعین کو بہت متاثر کرتے ہیں۔ جناب آسی مضافات میرٹھ کے رہنے والے ہیں اور شاعری کا نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں۔ ان کے تلامذہ میں شوکت، امین اور عمر انصاری ہیں۔ امین نے میرے سامنے غزل نہیں پڑھی، شوکت اور عمر انصاری نے غزلیں پڑھیں اچھی تھیں۔

مناظرہ اور مشاعرہ کے لئے ۲۸ فروری کا دن مقرر کیا گیا تھا۔ بلند پایہ ادیب و ماہرین فن تشریف لائے تھے، جناب پروفیسر مسعود حسن نے سنجیدہ پیرایہ میں لکھنؤ اسکول کے محاسن پر ایک بسیط مقالہ پڑھا؛ مسعود حسن صاحب بہت کم رو واقع ہوئے ہیں، اُنھوں نے مروت اور محبت میں بہت سی سطحی باتیں بھی کہہ ڈالیں۔ مشیر احمد علوی کا مضمون ادب و انشا کے لحاظ سے تو اچھا تھا لیکن اس میں ضعف استدلال اور معنوی لغویت کی بھی کمی نہ تھی، اُنھوں نے لکھنؤ اسکول کی تعریف و توصیف میں ہر وہ بات کہہ ڈالی جو ایک لکھنؤ پرست کے شایان شان تھی۔

قاضی خورشید حسنین اور ڈاکٹر عبدالعلیم (پروفیسر مُسلم یونیورسٹی) نے لکھنؤ اسکول کی مخالفت میں تقریریں کیں، قاضی صاحب جوش میں اتنے بے تکلف ہوگئے کہ لکھنؤ والوں کو، "آپ لوگ سخت نالائق ہیں" کہہ ڈالا، لیکن اُنھوں نے فنی خامیاں بھی دکھائیں ان کی بحث اچھی تھی، ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب کھڑے ہوئے تو لکھنؤ اسکول کی شاعری پر تنقید کرنے کی بجائے معاشیات اور سیاست مدن پر زور بیان صرف فرمانے لگے، آپ کے نزدیک شاعر کی یہ تعریف ہے کہ وہ اپنا کلام سنائے اور لوگ اس کو سُن کر عملی کارنامے پیش کریں، کوئی

شاعر مزدور پر نظم لکھے تو لوگ صرف رو ئیں نہیں بلکہ عمل بھی کریں، یا للعجب! آپ نے ایک سانس میں میرؔ سے لیکر تمام اُردو شعراء کو بے مایہ اور نا حقیقت شناس کہہ ڈالا میرؔ پر آپ نے عجیب و غریب تنقید کی، میرا تو قیاس نہیں یقین ہے کہ آپ نے آبحیات نہیں پڑھی، محمد حسین آزادؔ نے میرؔ کے متعلق یہ نہیں لکھا ہے کہ ایک کمرہ میں وہ بارہ سال تک بند رہے، لیکن اس کے دریچہ کے باہر کی چیز کبھی نہ دیکھی، اس سے آپ نے یہ استدلال کیا کہ میرؔ صاحب جب فطرت کے مطالعہ سے اس قدر بیگانہ تھے تو بھلا وہ حقیقی معنی میں شاعری کیا کرتے، چہ خوش!

آبحیات میں جو روایت ہے وہ میرؔ صاحب کی شعریت و شاعرانہ محویت پر دلالت کرتی ہے اگر محمد حسین آزادؔ کی روایت کا یہ مفہوم نہ ہو تا جب بھی ڈاکٹر صاحب کو سمجھنا تھا کہ دنیا میں بہت سے نابینا شاعر گزرے ہیں اور ان کے کمال سے تاریخ کے صفحات بھرے ہیں ایک ابو العلا معرّی کی مثال لے لیجئے یہ نابینا شاعر تھے، ہومرؔ بھی نابینا تھا۔ عہد حاضر میں مصر کا مشہور ادیب و نقاد ڈاکٹر طٰہٰ حسینؔ نابینا ہی ہے۔ ملٹنؔ بھی آخری عمر میں بصارت سے محروم ہو گیا تھا، کیا دُنیا اُن کے کمالات سے انکار کر سکتی ہے۔

اب دو حضرات اور باقی رہ جاتے ہیں ان میں ایک نے اپنے مزاحیہ مضمون اور دوسرے نے اپنی رنگین تقریر سے مجلس میں ہنسنے ہنسانے کا کافی سامان پیدا کر دیا۔ ان میں ایک تو جناب شوکتؔ ہیں اور دوسرے جناب بشیرؔ، جناب شوکتؔ کو میں نے ہمیشہ تیسرے درجہ کا مزاحیہ نگار سمجھا، ان کی ”منگنی“ بھی لوگ دیکھ چکے ہیں اور ”سودیشی ریل“ بھی، ان کے سارے مضامین میں ایک عامیانہ سطحیت کے سوا کسی بلند ذوقی کا پتہ نہیں، یہی وجہ ہے کہ

اہل نظر کے سامنے ان کی مزاحیہ نگاری کوئی وقعت نہیں رکھتی، رشید، فرحت، اور پطرس نے مزاحیہ نگاری میں نقد ادب و انشا کی خدمتیں انجام دی ہیں، وہ ہنساتے بھی ہیں اور کام کی بات بھی کہہ جاتے ہیں اس کے برخلاف شوکت صرف ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں ان کا کوئی مطمح نظر نہیں، یوں بھی جناب شوکت کا علمی پایہ بالکل سطحی ہے جو شخص اپنی کتاب کا نام "سیلاب تبسم" رکھے اور انجمن بہار ادب کی بھری مجلس میں "نسلاً بعد نسلاً" کی غلط ترکیب لکھ کر لوگوں کو سنائے اس سے کسی نوع کی علمی تنقید کی توقع کرنا بے محل سی بات ہے۔

سب سے آخر میں جناب بشیر کی تقریر کے متعلق کچھ عرض کروں گا۔ بشیر صاحب کی خوش روئی اور جامہ زیبی صحت و جوانی دیکھنے کے بعد لکھنؤ کے "بانکپن" کی یاد تازہ ہوتی تھی، انھوں نے دہلی اسکول پر ایراد کرتے ہوئے لکھنؤ اسکول کے محاسن پر روشنی ڈالی اور اس سلسلہ میں لکھنؤ کے تانگہ والوں کی پھبتی سے لے کر "عید تیسچے ٹر" کے واقعات پر تبصرہ فرمایا شاہان اودھ کی رنگین مزاجی، خوش ذوقی اور عشرت کامی کے فسانے بیان کئے اور اس شعر

آغا تقی کے باغ میں گچھا انار کا   چھاتی پٹک کے مرگیا لونڈا اسنار کا

سے بھی فلسفیانہ نتیجہ نکالا، میرا خیال ہے ان کی آزاد تقریر سے لکھنؤ والے کچھ خوش نہ ہونگے کیونکہ بیسویں صدی میں انھیں الزامات کو جو سرزمین اودھ پر دوسروں کی طرف سے عاید کئے جاتے ہیں اور وہ اپنے دامن عصمت پر داغ سمجھ کر ان واقعات کو دھونے کی کوشش کر رہے ہیں بانکے مقرر نے کچھ اس دلفریب انداز میں بیان کئے کہ چاہے کوئی

مانے یا نہ مانے میں جناب بشیر کی اس تقریر سے ان کے فلسفیانہ رجحان کا ضرور قائل ہوگیا
انھوں نے معمولی معمولی واقعات سے اچھے اچھے نتائج نکالے میرے خیال میں ان کی
تقریر بہت کامیاب تھی۔

مجھے آخری دن شب کے وقت مقالہ پڑھنے کا حکم دیا، مجھ سے قبل جن صاحب نے
اپنا مقالہ پڑھا تھا ان کا انجام دیکھ کر میں ہرگز اس کے لئے تیار نہ تھا لیکن اراکین انجمن
کے تقاضہ سے مجبور تھا، طلبہ غزلیں اور نظمیں سننے کے لئے سخت مضطرب تھے اور وہ
اپنے جماعتی اثر و اقتدار کے زعم میں وہ ساری حرکتیں کر رہے تھے جس کی بناء پر جرمن
ماہر نفسیات ایڈورڈ اشپرانگر نے لکھا ہے کہ نوجوانوں میں "منوانے" کی اہمیت بہت
زبردست ہوتی ہے، وہ تالیاں بجا رہے تھے پھبتیاں کس رہے تھے۔ ہال انکے
شور و شغب اور ہا ہا کا رہ ہنگامہ پروری سے گونج رہا تھا ایسی فضا میں کسی خشک علمی
بحث کا آغاز و انجام دونوں برابر تھا۔ مجھے طلبہ کی جماعت سے بڑا اُنس ہے، اسلئے
نہیں کہ میں نوجوانوں کے غیر مہذب طریق زندگی کو پسند کرتا ہوں بلکہ اس لئے کہ ان
کی نفسیات کے مطالعہ سے بعض دلچسپ حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔ بہر حال میرا
ارادہ نہ تھا کہ میں اپنا مقالہ پڑھوں اس لئے کہ یہ علمی مجلس طلبہ کی شر انگیزیوں سے
اس لائق نہ تھی کہ یہاں کسی سنجیدہ بحث پر ایک لمحہ بھی صرف کیا جائے لیکن خوف یہ تھا
کہ "انجمن بہار ادب" کے وہ افراد جو پہلے ہی بدگمان نظر آرہے تھے کہیں یہ نہ فیصلہ کر لیں

زاہد نہ یافت تاب جمالِ پری رخاں ۔۔۔۔ کنجے گرفت و ترس خدا را بہانہ ساخت

صفیر بلگرامی

آرہ اپنی علمی و ادبی مرکزیت کے لحاظ سے نہ صرف بہار بلکہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں معروف ہے، اس نے گذشتہ ڈیڑھ سو برس کے اندر اردو کی جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اُن کو ادب اُردو کی تاریخ فراموش نہیں کر سکتی، اُردو کا قدیم ترین شاعر جو آرہ میں گذرا ہے وہ مولانا انور علی یاس (متوفی ۱۲۶۲ھ) تھے، آپ شیخ غلام علی راسخ (متوفی ۱۲۳۸ھ) کے تلامذہ میں تھے آرہ کی ادبی زندگی کا یہ دورِ اولین تھا، اسی عہد ماموں میں مارہرہ و بلگرام کے اربابِ سخن آرہ میں تشریف لاتے تھے، چنانچہ یاس مرحوم نے حضرت سید سلطان عالم صاحب سجادہ نشین مارہرہ سید محمد عسکری، سید بندہ علی وغیرہ سے اپنے تعلقات کا ذکر کیا ہے۔

اس دور کے گذر جانے کے بعد ادبی قیادت کی عنان حضرت صفیر بلگرامی مرحوم کے ہاتھ میں آئی، اسی عہد میں اُردو کو بہت بڑا فروغ ہوا چنانچہ مطبع کا قیام، مشاعروں کی بنیاد، تصنیفات و تالیفات کا سلسلہ صحافت کی ترویج اسی زمانہ سے متعلق ہے اور اس کو ہم ادبی اصطلاح میں "خیر القرون" کہہ سکتے ہیں، اسی دور کی برکات کا یہ اثر ہے کہ آرہ میں سیکڑوں نامی و ماہر اساتذۂ اُردو پیدا ہوئے، شیخ محمد حسن نظیر

کر کے اسٹیج سے اُترا تو جناب پنڈت آنند نرائن مُلّا اور انجمن کے دوسرے اراکین نے مقالہ طلب کیا چونکہ انجمن غزلوں اور نظموں کے ساتھ مقالے بھی اپنے اہتمام سے شائع کرے گی، میرے مقالہ کا مسودہ صاف نہ تھا میں نے کہہ دیا کہ صاف کر کے اس کی نقل بھیجدوں گا۔

انجمن نے ملک کے مختلف اطراف سے لوگوں کو بُلایا تھا کہ وہ لکھنؤ اسکول کے جدید رنگ کے متعلق اپنی رائیں دیں تاکہ لکھنؤ اسکول کے تبعین کو استفادہ کا موقع ملے اور اس طور سے انجمن اپنی زندگی میں اپنی افادیت کا ایک غیر فانی نقش قائم کر جائے لہٰذا میں نے فیصلہ کیا میرے اختلافات اتنے سنگین ہیں کہ اراکین انجمن اپنے اہتمام سے اسے شائع کرنے کے لئے تیار نہ ہونگے اس لئے اب میں اسے اپنے "نگار" میں شائع کئے دیتا ہوں مجھے بیحد مسرت ہوگی اگر سنجیدہ حضرات اس کے خلاف آواز اُٹھائیں گے کیونکہ بہت ممکن ہے میں نے مشاہدہ کرنے اور نتیجہ نکالنے میں غلطی کی ہو۔

سید سجان حیدر نذیر، آغا حسن ظہیر، لالہ امرچند جمیل، چودھری ریاض الدین آرزو، برکت علیخاں سیفی، سید لقمان حیدر راسی بزور کے نکتہ سنج شعرا تھے۔

صفیر مرحوم کی قیادت کا سلسلہ ۱۳۰۷ھ میں ختم ہو گیا اور وہ اپنے بعد ایسے ایسے نونہالانِ ادب چھوڑ گئے جنھوں نے اُردو شاعری کو چار چاند لگا دیئے، مولانا اسمٰعیل مہر مولوی عظیم۔ شاہ ابراہیم فوق، مولانا ضمیر الحق قیس، قاضی واجد حسین وجد، سید امیر حسن بدر، مولانا ابوالفضل حشر، چودھری فخر الدین فخر، سید قمر الدین قمر، جے نند کمار جوہر نے اپنی نگارش جمیل اور ہدیۂ انشا سے اُردو نظم کو بڑا فروغ دیا۔ مولانا مہر بہت بڑے گلتراش اور صناع تھے، مولوی عظیم ظریفانہ شاعری میں بڑی مہارت رکھتے تھے آپ کے صاحبزادہ ابوالبرکات برق آرہ کے اُن اکابر شعرا میں ہیں جو مشاعرہ میں میر سوز کی شعر خوانی کے مناظر پیش کر دیتے ہیں شاہ ابراہیم فوق اس عہد کے بہت بڑے ماہر سخن تھے، مولانا ضمیر الحق قیس شمشاد لکھنوی کے شاگرد ہیں، آپ کو عروض میں پوری دستگاہ ہے، مولانا بدر مرحوم کے "خمخانہ" پر "مخزن" (لاہور) میں ایک بار لکھا جا چکا ہے۔

آج میں اپنے وطن کے مشہور شاعر حضرت صفیر کے حالات و کلام پر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں

نام و نسب ولادت و وطن

آپ کا نام فرزند احمد، تخلص صفیر ہے۔ ۱۲۴۹ھ میں بمقام مارہرہ اپنی ننہیال میں پیدا ہوئے، "شمس الضحیٰ" سے آپ کی تاریخ ولادت نکلتی ہے، ایک سال کے ہوئے تو بلگرام آئے جو آپ کا آبائی وطن تھا۔ چار سال کی عمر میں قصبہ آرہ میں وارد ہوئے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:-

مولد و مسکن وطن ہے اے صغیر   تین جا مارہرہ، آرہ، بلگرام

آپ کا سلسلہ نسب یہ ہے:۔

فرزند راحمد بن میر سید احمد، بن سید غلام یحییٰ، ابن سید بندہ علی، بن سید خورشید علی، سید خورشید علی کا سلسلۂ نسب سید ابوالحکیم بن سید ابوالقاسم بن سید خاں محمد بن محمود دہتہ کی وساطت سے سید محمد صغریٰ فاتح بلگرام اور حضرت صغریٰ کا نسب عیسےٰ موتم الاشبال بن زید شہید بن امام زین العابدین بن امام حسینؑ تک پہونچتا ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ سید محمد صغریٰ کے اخلاف میں سے ہیں، سید صاحب نے ۶۱۴ھ میں بلگرام کو فتح کیا تھا، اس کے بہت عرصہ قبل سید ابوالفرح واسطی اہل و عیال اور متعلقین کے ساتھ ہندوستان میں آباد ہو چکے تھے، یہی وجہ ہے کہ "سادات صغراوی" خود کو واسطی کہتے ہیں چونکہ ان کے جد امجد واسط سے ہندوستان میں آئے تھے۔

اکثر مثالوں میں پتہ چلتا ہے کہ انسان کی ذہنی ترقی اور تعمیر سیرت میں خاندان کو بہت بڑا تعلق ہوتا ہے، لیکن اس سے ہٹ کر اس کی کوئی اصلیت نہیں اگر ایک شخص علم و فضل کے ساتھ اچھے عادات و خصائل بھی رکھتا ہے تو پھر اس کے لئے خاندان کا فخر کوئی معنیٰ نہیں رکھتا، لیکن جہاں ہماری ادبیات میں بہت سے زہریلے جراثیم داخل ہو گئے وہاں خاندانی فخر و مباہات کا عنصر بھی شامل ہو گیا اور آج سیرت پر مشکل ہی سے کوئی کتاب دستیاب ہو سکتی ہے، جو اس قسم کے ترہات سے پاک ہو، سر سید، نذیر احمد، جیسے قومی فدائیوں نے بھی نہ کسی نہ کسی پیرایہ میں اپنی خاندانی عظمت کا تذکرہ کیا اور

"حیات جاوید" کے مصنف حالی نے تو سر سید کو بت بنا کر رکھ دیا۔

میں یہاں مختصراً سید فرزند احمد صاحب کے ان افکار پر ایک تنقید کرنا چاہتا ہوں جو انھوں نے اپنے نسب و حسب کے سلسلہ میں ظاہر کئے ہیں فرماتے ہیں:۔

بسکہ سادات صغرادی بلگرام کو حفظ نسب کا خیال سب خیالوں سے بڑھ کر ہے اور اس کی احتیاط اب تک کہ سات سو برس سے زیادہ ہندوستان میں آئے ہوئے، بڑے زور شور سے رہی ہے کہ دوسری قوموں کو جائے رشک اور باعث استعجاب اور وجہ رغبت ہے، اور اس حفظ نسب کی مشق یہاں تک کی گئی ہے کہ جس قدر قربت میں نسبت ملتی ہے وہ باعث فخر ہوتی ہے اور انتہا یہ ہو گئی ہے کہ احتیاط کرتے کرتے چار بھائیوں سے اگر بڑے بھائی کی اولاد سے سنجھلے اور منجھلے کی اولاد سے چھوٹے کی اولاد کو وصلت واقع ہوئی اور اس وصلت کو تواتر ہو گیا ہے تو وہ بھائی اسی کا ہو گیا گویا بڑے اور سنجھلے کو منجھلے اور چھوٹے سے اور چھوٹے اور منجھلے کو بڑے سے قرابت ہی باقی نہیں رہی

(تاریخ بلگرام ص ۱۳۵)

"یہ قصبہ (بلگرام) سادات ہی کی بود و باش کے سبب سے مشہور ہوا ہے اور اعلیٰ درجہ کے ساکنین سادات ہی شمار کئے جاتے ہیں اور ان سادات کی ناموری "خاندانی" کے لقب سے شہرت پذیر ہوئی، اور خاندانی ہونا خوبی اصلیت و نجابت و شرافت کی دلیل ہے، پس سادات صغراوی کی حفظ نسب

نے یہ جلوہ دکھایا کہ سب لوگ ان کی بزرگی کے قائل ہیں۔ (تاریخ بلگرام صفحہ ۱)

اگرچہ بفضل خدائے یکتا عاصی کے بزرگوار حسب و نسب میں نامور زمانہ اور علم و فن میں یگانہ ہوتے آئے ہیں (صفیر بلگرامی ص ۱۲۵)

صفیر مرحوم نے اسی طرح صفیر بلبل، تاریخ بلگرام، معراج الخیال اور جلوہ خضر کے کثیر صفحات رنگین کئے ہیں، میرا روئے سخن صفیر مرحوم کی طرف نہیں کیونکہ اب وہ دنیا میں باقی نہیں ہیں ان کو ایک بزرگ خاندان کا قابل رشک فرزند خیال کرتا ہوں انفرادی اعتبار سے جو کچھ صفیر نے اپنے نسب و حسب کے متعلق لکھا ہے وہ محل اعتراض نہیں، لیکن آپ نے سادات صغراوی کے عجیب و غریب تخیل نسبی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ نہ صرف نظریہ قومیت بلکہ اسلام کی روح تعلیم کے بھی منافی ہے۔

سادات صغراوی کو بروایت صفیر حفظ نسب کا جنون ہے، جیسا کہ ان کے سطور بالا سے پتہ چلا ہوگا، اب غور طلب امر یہ ہے کہ واقعتاً یہ سارا داعیہ فضل و شرف بقول غالب "رعایت مستی و ذوق" کا نتیجہ ہے یا اس کے اندر کچھ حقیقت بھی ہے؟

ہم نے یہ مانا کہ سید ابوالفرح ہندوستان میں اہل و عیال کے ساتھ تشریف لائے تھے اور اس لئے سادات صغراوی کی نسل میں کسی غیر عنصر کا شامل ہونا مستبعد ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ سید ابوالفرح اور حضرت امام حسینؑ کے درمیان جو پشتیں گزری ہیں ان میں کوئی غیر فاطمی خون شامل ہوا ہے یا نہیں؟ پہلے تو حضرت امام زین العابدین ہی کی والدہ ایرانی تھیں اس کے بعد حضرت زید شہید کی والدہ ام ولد (لونڈی) تھیں۔ پھر آپ کے

صاحبزادے عیسٰی موتم الاشبال ساری عمر خلیفہ منصور اور مہدی عباسی کے آدان حکومت میں مخفی رہے اور لوگوں کو اُجرت پر پانی پلایا کرتے تھے، اسی لئے آپ کا لقب "سقہ" ہوگیا چنانچہ ۱۶۶ھ میں بمقام کوفہ آپ نے اسی اختفائی حالت میں وفات پائی اس وقت آپ کی عمر چھیالیس سال کی تھی (ملاحظہ ہو صحاح الاخبار علامہ رفاعی ص ۳۵ و ۴۰) خلیفہ منصور ۱۳۶ھ میں تخت خلافت پر بیٹھا اور خلیفہ مہدی نے ۱۶۹ھ میں وفات کی چونکہ بروایت رفاعی حضرت عیسٰی موتم الاشبال نے ۱۶۶ھ میں بعمر ۴۶ سال وفات کی اس لئے ۱۲۰ھ آپ کی تاریخ ولادت قرار پائی، لہذا نتیجہ نکلا کہ منصور کے زمانہ خلافت میں آپ سولہ برس کے تھے، ظاہر ہے کہ آپ اس وقت مجرد ہوں گے اور آپ کو وطن سے دور مخفی طور پر اپنا عقد کرنا پڑا ہوگا، اس کے بعد آپ کے صاحبزادے زید احمد، محمد و حسین پیدا ہوئے۔ سادات صغرادی محمد کے اعقاب میں ہیں، کیا سادات واسطی بتا سکتے ہیں کہ حضرت عیسٰی موتم الاشبال نے اس بے بسی و آشفتگی کی زندگی میں کسی فاطمیہ سے رشتہ ازدواج باندھا تھا؟ ایسی صورت میں سادات صغرادی غور کریں کہ نسب و حسب کے پندار، اور رشتۂ ازدواج کے قیود میں وہ کہاں تک حق بجانب ہیں آج ہندوستان کے اندر سیکڑوں کی تعداد میں ایسے صغرادی سادات کے گھرانے موجود ہیں جن کو انکی برادری کے مجرمانہ قیود نے حد درجہ بے نام و ننگ بنا رکھا ہے، آپ کا علم و فضل مسلم آپ کی فاطمیت مصدق، لیکن یہ محشرستان رسوم کیسا؟ خدا کے لئے غور کیجئے، ساڑھے چھ سو سال کے اندر آپ کی دنیائے خیال نے آپ کی برادری کے اندر کیسی قیامت برپا

کردی اب آپ کے یہاں آزاد جیسا ادیب جلیل، عبدالجلیل جیسا لغوی، مبارک جیسا محدث، سید اسمٰعیل جیسا متکلم کیوں نہیں پیدا ہوتا، بہ استثنائے سید علی بلگرامی اور سید حسین اب کئی سو برس سے آپ کے یہاں سے علم وادب کا مہر درخشاں کیوں نہیں طلوع ہوتا، آپ جس کو موجب فخر سمجھ رہے ہیں وہ آپ کے جسمانی و ذہنی ادبار کا موجب ہے۔

صفیر کا خاندان علم و فضل کے اعتبار سے بہت بلند اور سر برآوردہ تھا، آپ کے اجداد پدری میں مسلسل کئی پشت تک شعروادب کا ذوق رہا۔ چنانچہ خورشید علی صاحب خورشید خود شاعر تھے، آپ کے فرزند بندہ علی بندہ اور پوتے غلام یحییٰ صاحب یحییٰ کو بھی شعروسخن کا مذاق تھا۔ صفیر کے والد سید احمد صاحب نے اُردو میں شعر کہنا شروع کیا یہی خاندانی شاعری صفیر مرحوم کو بھی ورثہ میں ملی۔

یہ تو دادھیال کی حالت تھی، آپ کے نانا سید صاحب عالم صاحب بہت بڑے ادیب اور شاعر تھے، غالب نے "اُردوئے معلیٰ" اور "عود ہندی" میں آپ کو جو خطوط لکھے ہیں اُن سے آپ کا پایۂ ادبی واضح ہوتا ہے۔ "صفیر بلبل" کے آخر میں حضرت صاحب عالم کی ایک تاریخ طبع بھی مرقوم ہے، غالب نے بھی صفیر مرحوم کی "رشحات" پر دیباچہ لکھا، جو "عود ہندی" کے آخری صفحات میں پایا جاتا ہے۔ الغرض صفیر مرحوم پشتینی شاعر تھے، آنکھیں کھولیں تو نانا اور دادا کی آغوش میں شعروادب کا درس لیا۔

تصنیفات | صفیر مرحوم نے اپنی ساری زندگی تصنیف و تالیف اور شعروسخن میں بسر کی آرہ میں سب سے پہلے آپ ہی نے اپنا مطبع "اسٹار آف انڈیا" قائم کیا جہاں سے اُردو میں

دو اخبار نکلے، آپ نے مختلف فنون پر کتابیں لکھیں ان میں بعض تو طبع ہو چکی ہیں اور بعض کا قلمی مسودہ آپ کے خاندان میں محفوظ ہے۔

"صفیر بلبل": یہ آپ کے منتخب کلام کا مجموعہ ہے جو ۱۲۸۰ھ میں آپ کے شاگرد شاہ حفاظت حسین مظہر کے اصرار سے شائع ہوا تھا، مقالہ ہذا میں یہی کتاب پیش نظر رکھ کر آپ کے کلام پر تنقید کی گئی ہے۔

"تاریخ بلگرام" اس کا ایک مطبوعہ حصہ میرے پاس ہے، تاریخ طباعت مذکور نہیں، آپ کے ابتدائی زمانہ کی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ اس میں سادات صغراوی کا شجرۂ نسب بلگرام کا جغرافیہ، محلات کی تفصیل اور برادری کے رسوم و رواج کا مفصل تذکرہ ہے

"رشحات صفیر" یہ آپ کا بہت بڑا ادبی کارنامہ ہے۔ اس میں آپ نے تذکیر و تانیث کے متعلق مبسوط علمی بحث کی ہے اور اساتذۂ قدیم کے اشعار سے استدلال کیا ہے، اسی کی تلخیص "خلاصہ فیض صفیر" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

"میلاد معصومین" یہ کتاب بہت زیادہ مشہور ہے، اس میں ائمہ اثنیٰ عشری کے حالات درج ہیں۔

"جلوۂ خضر" بھی آپ ہی کی تالیف ہے، ان کے علاوہ آپ نے اور بھی غیر مطبوعہ کتابیں چھوڑی ہیں جن کا حال "صفیر بلبل" اور تاریخ بلگرام سے معلوم ہوتا ہے بمصنف کا خود بیان ہے کہ انھوں نے بتیس مثنویاں لکھیں۔ اردو میں پانچ قصے لکھے "قصہ داستان خیال" کی اٹھارہ جلدوں کا فارسی سے اردو میں ترجمہ شروع کیا تھا، ۱۲۸۰ھ ہی میں غزلیات

کا اتنا بڑا مجموعہ تیار ہو گیا تھا کہ کئی دیوان مرتب ہو جاتے، اس کے بعد ستائیس سال اور زندہ رہے، خدا جانے کتنی غزلیں کہیں بسنہ ۱۲۸۱ھ میں لکھنؤ سے واسوخت کا ایک مجموعہ "شعلۂ جوالہ" کے نام سے شائع ہوا تھا، اس میں صفیر کا واسوخت بھی شامل ہے۔

رفقا و تلامیذ آرہ کے مہر، وجد، بدر، جمیل، نظیر، آرزو وغیرہ تو خیر ان کے تلامذۂ ارشد میں تھے ہی عظیم آباد کے بہت سے شعرا کے ساتھ آپ کے مراسم و روابط تھے، چنانچہ اس سلسلہ میں مفصلہ ذیل بزرگوں کے نام گنائے جا سکتے ہیں:۔ مرزا انور علی انور عظیم آبادی، مرزا یوسف بیگ یوسف عظیم آبادی، علی مرزا وفا عظیم آبادی، آغا مرزا عطا عظیم آبادی حامد حسین عرف میرن صاحب نجمت عظیم آبادی، علی محمد شاد عظیم آبادی وغیرہ، ان تمام حضرات نے "صفیر بلبل" کی تاریخ طبع لکھی ہے۔

اولاد آپ کی پہلی بی بی بلگرام کی تھیں، ان سے صرف ایک صاحبزادہ زندہ رہے، مثنوی معراج الخیال میں آپ نے ان کا تذکرہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

از من نور احمد است یک پور   روشن کن خانہ چشم را نور

نور احمد نے دو صاحبزادے چھوڑے سید عنایت احمد دلگیر اور سید وصی احمد فانی دونوں ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ دلگیر صاحب مشاعرے میں ایک خاص انداز سے پڑھتے ہیں، وصی احمد صاحب فانی بہت بڑے ادیب اور شاعر ہیں۔ نثر میں آپ نے بہت سی موقر خدمات انجام دی ہیں چنانچہ "نگار" میں "ملک خطا کے شہزادے" "گونڈہ گزٹ" میں دیر و حرم کا افسانہ" اور "ندیم" میں "جلترنگ کے تین بیٹے" شائع ہو کر فانی صاحب کو غیر فانی بنا چکے ہیں فانی صاحب

سے مجھے غائبانہ عقیدت ہے۔

صفیر مرحوم نے دوسرا عقد آرہ میں کیا تھا، اُن سے دو صاحبزادے، سیّد غنی حیدر اور حافظ سید ولی حیدر گہرؔ صاحب ہوئے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ غنی حیدر مرحوم رفتار و گفتار، عادات و خصائل، شکل و صورت میں حضرت صفیر مرحوم سے بہت مشابہ تھے، غنی حیدر صاحب نے پہلے آرہ میں ایک "مطبع مصطفائی" قائم کیا اس کے بعد کلکتہ تشریف لے گئے، وہاں "مطبع ستارۂ ہند" قائم کیا، یہ مطبع ہندوستان کے چند اعلیٰ مطابع میں ہے، یہاں کی اعلیٰ طباعت و کتابت ہندوستان و ایران میں مشہور ہو چکی ہے۔ غنی حیدر مرحوم نے آخری عمر میں حج کیا، آپ بہت بڑے خطاط ہفت قلم تھے، حافظ ولی حیدر صاحب "کتب خانہ حیدری آرہ" کے مالک اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، آپ کو شعر و سخن کا بہت بڑا شوق ہے گہرؔ تخلص کرتے ہیں اور آرہ کی "بزم ادب" کے صدر ہیں۔

صفیر کی شاعری

سطور بالا میں لکھا جا چکا ہے کہ صفیر مرحوم کے اجداد پدری و مادری میں نسلاً بعد نسلٍ شاعری چلی آتی ہے، اس لئے صفیر کو گہوارہ ہی میں شاعری کا درس ملا، پندرہ برس کی عمر سے آپ نے شعر کہنا شروع کیا۔ پہلے اپنا کلام چھپایا پھر دو تین سال کے بعد سیّد محمد مہدی متخلص بہ خبرؔ سے اصلاح لینی شروع کی، خبرؔ مرحوم صفیر کے دادا کے چچازاد بھائی تھے اس کے بعد صفیر کو لکھنؤ کا شوق ہوا، اپنا کلام شیخ امان علی سحرؔ کو دکھلایا مرثیہ گوئی کی طرف طبیعت راغب ہوئی، مرزا سلامت علی دبیرؔ سے اصلاح لی، سحرؔ مرحوم نے لکھنؤ چھوڑا، اور دبیرؔ کو عظیم آباد والوں نے مدعو کیا، وہیں آ کر رہے۔ صفیر مرحوم بھی

عظیم آباد میں نواب الطاف حسین خان بہادر کے یہاں قیام پذیر ہو گئے آرہ سے بماہ آمدورفت کا سلسلہ قائم تھا، مرزا دبیر نے محبت و رافت کے ساتھ آپ کی پذیرائی کی۔

صفیر کی شاعری ایک معجون مرکب کی حیثیت رکھتی ہے، ان کی شاعری پر خبر، سحر، دبیر کے علاوہ اور اساتذہ کا بھی اثر پڑا ہے، چنانچہ خواجہ وزیر، حیدر علی آتش، صبا، قدر بلگرامی وغیرہ کے کلام سے انھوں نے استفادہ کیا تھا بعض مقطعات میں صفیر نے ان لوگوں کا تذکرہ کیا ہے:-

شکر ہے، دل مرا مثل حضرت آتش صفیر — عاشق شیدا علی مرتضیٰ کا ہو گیا

طرز وزیر میں لکھی اچھی غزل صفیر — اب آپ کا کلام بھی پُرکار ہو گیا

اب دیکھئے بقول صبا کیا بنے صفیر — آئی بہار داغِ جنوں پھر ابھر چلے

صفیر قدر کا ہے اشتیاق مدت سے — ہمارا عزم سوئے بلگرام ہے بیشک

لیکن صفیر بلبل پر ایک نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے یہاں میر کا سوز و گداز غالب کی مضمون آفرینی و جدت طرازی، ناسخ کی محاورہ بندی، رعایت الفاظ، داغ کی رندانہ سیہ مستی و سلاست نگاری کی بھی کافی مثالیں موجود ہیں۔

طرزِ میر | ایک ایسے شاعر سے جس نے لکھنوی اساتذہ کی تربیت سے استفادہ کیا جو

لکھنؤ کی ناسخی فضا سے متاثر ہوا، جس نے داغ کی سی رنگ رلیوں کو سراہا، جس نے شاہانِ اودھ کے عشرت کدوں کے اُجڑنے پر ماتم کیا۔

صفیرؔ کھا گئی حاسد کی آنکھ لکھنؤ کو | کہاں وہ دن کہاں پریاں کہاں وہ قیصر باغ

کیا ہم اُمید کر سکتے تھے کہ وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں لذتِ غم اور پیامِ روح کا سرمایہ بھی رکھتا ہوگا لیکن جب اس کے کلام کا جائزہ لیا جاتا ہے تو اس کے یہاں بیشتر ایسے اشعار نکلتے ہیں جو میر کے سوگوارانہ اندازِ بیان سے مالا مال ہیں[1]۔

پھر کیا کروں نہ روؤں جو کہہ کے ہائے دل | اک درد رہ گیا ہے فقط اب بجائے دل

کیا شکوہ ہے اگر کہیں جاتے نہیں ہیں ہم | مدت سے اب تو آپ میں آتے نہیں ہیں ہم

تو نے تو بڑھ کے خاک میں مجھ کو ملا دیا | اے آرزوئے دل تو ہی ملجائے خاک میں

صاف ہم سے ہوا وہ گل اس وقت | ہائے جب موسمِ بہار نہیں

---

[1] نگار، اوّل تو صرف چند اشعار پر اعتماد کر کے یہ حکم لگانا کہ صفیر کے کلام میں میر کا سوز و گداز پایا جاتا ہے درست نہیں، دوسرے یہ کہ جو اشعار انتخاب کئے گئے ہیں وہ خود میر کے رنگ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے صفیر بلگرامی کو میر و غالب سے ممکن ہے بہت عقیدت رہی ہو، لیکن رنگِ سخن کو ان سے کوئی نسبت نہیں وہ خالص لکھنوی اسکول کے شاعر تھے اور اسی رنگ میں اُنھوں نے ہمیشہ شاعری کی۔

زندگی وہی جو ناکامیوں میں بسر ہو۔

آج آتا ہے شوخ غارت گر — دین و ایمان کا خدا حافظ

پھر ہمیں یاد آیا کوئے صنم — لے چلے ناصحا خدا حافظ

پائے بوس یار کی حسرت نہایت ہے صفیر — خاک میری کاش کہ منتی مکان نقش پا[1]

پھر گئے ہم سے یار کیا کہنا — یونہی کرتے ہیں پیار کیا کہنا

لباس سے ہیں نہ واقف نہ تاج سے واقف — تمہارے وحشی نہیں احتیاج سے واقف

اتباعِ غالب صفیر مبل میں بہت سے ایسے اشعار ملتے ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ غالب کے کلام نے صفیر کے دماغ پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں، صفیر نے غالب کو دیکھا تھا، حضرت صاحب عالم صاحب مارہروی کے نواسہ کی حیثیت سے غالب صفیر کو

---

[1] یہ شعر میر کے رنگ میں ہے تو ضرور، لیکن غالب کے ایک شعر سے مل جاتا ہے:۔

مشہد عاشق سے کوسوں تک جو اگتی ہے حنا — کس قدر یا رب ہلاک حسرت پابوس تھا

صفیر نے سادہ الفاظ میں جس آرزو کا اظہار کیا ہے، وہ غالب کی جدت تخیل اور بلند پروازی سے زیادہ اثر آفریں ہے یہی غالب اور میر میں فرق ہے ع۔م

نہ میر کا رنگ ہے نہ غالب کا۔ اڈیٹر نگار

بہت ہی محبت و رافت کی نظر سے دیکھتے تھے، چنانچہ "رشحات سفیر" کے دیباچہ میں غالب مرحوم لکھتے ہیں:۔

سیدی سندی نور بصر لخت جگر قرۃ العین اسد، مولوی سید فرزند احمد کی طول عمر، دوام دولت و بقائے اقبال کی دعا مانگتا ہوں، جنکو مبدء فیاض سے اس رسالہ کے لکھنے کی توفیق عطا ہوئی ہے، سبحان اللہ تانیث و تذکیر کی تقریر کہ وہ مطالب کی توضیح پر بھی مشتمل ہے کس لطف سے ادا ہوئی ہے۔ (عود ہندی ص ۱۹۳)۔

افسوس ہے کہ ہمارے وطن کے اس ہیرو نے بجائے دہلی، لکھنؤ کی طرف توجہ کی اور سحر مرحوم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اگر وہ غالب جیسے شفیق استاد سے اصلاح لیتے تو یقیناً آج صفیر بہار کے سب سے بڑے شاعر ہوتے، لکھنؤ کی شاعری کے اس صنف نے جو زلف و چوٹی شانہ و زلف سرمہ و مسی سے متعلق تھا ان کے اندر پریشان نظری و ادبی گمرہی پیدا کر دی، چنانچہ وہ اپنی فطری ودیعتوں سے کام نہ لے سکے مگر صفیر مرحوم کو زیادہ مورد الزام نہیں بنایا جا سکتا، کیونکہ اس عہد میں غالب کی مشکل پسندیاں کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھی جاتی تھیں، لیکن آج وہ دور بھی آ گیا جبکہ ہندوستان کا ہر ادیب غالب کے مختصر اردو دیوان کا حافظ ہے ہر انشا پرداز اُسکے بدلیہ شعری سے استدلال کرتا ہے، فلسفی اس کو فلسفہ طراز، نفسی اس کو ماہر نفسیات، مصور، اس کو اپنا موضوع تخیل بنائے ہوئے ہے اور مشرق کا یہ فاقہ مست شاعر اپنی ناکامیوں اور

حسرت سنجیوں کے بعد جب دنیا سے رخصت ہو گیا تو اہل دنیا اس کو چوم چاٹ رہے ہیں غالب کی ناکام زندگی اور کامیاب موت فطرت کی ستم ظریفیوں کی ایک عبرت آموز مثال ہے۔

صفیر مرحوم نے غالب کی تقلید میں جو اشعار کہے ہیں ان میں دقت معنی اور بلندی تخیل کے ساتھ غالب کے مخصوص طنزیاتی رنگ کا بھی تتبع کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

زاہدا حور تیری میری پری ‏ ‏ خلد تیرا ہے پرستان مرا

فرط دعا رجنت و حور و قصور سے ‏ ‏ خم ہو کے شیخ صورت محراب ہو گیا

غالب کا ایک شعر ہے:۔

پھر جی میں ہو کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں ‏ ‏ سر زیر بار منت احساں کیے ہوئے

صفیر کہتے ہیں:۔

محفل میں اسکی آئے بھی لوگ اور چلے گئے ‏ ‏ میں نامراد منت درباں میں رہ گیا

تخیل کے اعتبار سے دونوں شعر برابر ہیں البتہ غالب کے خاص اسلوب نے ان کے شعر میں زیادہ گداختگی و برشتگی پیدا کر دی ہے۔ صفیر کہتے ہیں:۔

نگاہ گرم رحمت سے نہیں کم زار کو تیری ‏ ‏ فروغ طالع اپنا شعلے کو، ہر خار و خس سمجھا

بالکل اسی معنی میں اور انھیں فقروں کے ساتھ غالب کے یہاں بھی ایک شعر ہے

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا ‏ ‏ فروغ طالع خاشاک ہو موقوف گلخن پہ

غالب نے تصوف کی چاشنی پیدا کر دی ہے۔ صغیر معشوق کی گرم نگاہوں کو رحمت بتاتے ہیں، لیکن دونوں کے یہاں اسلوب بیان ایک، مشبہ بہ، اور وجہ شبہ ایک، کیونکہ دونوں خار وخس کے جل اٹھنے کو "فروغ طالع" سے تعبیر کرتے ہیں۔

صغیر کا ایک مطلع ہے۔

عشق اور حسن کا چرچا رہا دیوانوں تک　　سب یہ سامان تھا تیرے بے سر و سامانوں تک

غالب فرماتے ہیں:۔

منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا　　ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد

اسی طرح جستجو کی جائے تو صغیر کے یہاں بہت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جن کا غالب کے کلام سے توارد ہو جاتا ہے۔ ذیل کے اشعار غالب کی پیروی کا نتیجہ ہیں۔

اڑتی پھرے گی خاک مری کوئے یار میں　　مجنوں ہی تھا جو تھک کے بیاباں میں رہ گیا
رندوں نے سمجھے معنی توحید و لاشریک　　زاہد تو بحث گبر و مسلماں میں رہ گیا

ہے یاد شور خندۂ دنداں نمائے یار　　میں نے نمک بھرا ہے دل چاک چاک میں

اٹھاؤں کس طرح دل اُس بت بے کافر سے　　کہ فرط لاغری سے خود جہاں سے اُٹھ چلا ہوں میں

دکھا دے لئے شمع، دکھ ڈھونڈوں میں　　ہجوم گریہ میں تار نظر نہیں ملتا

دارالشفائے عشق کی بجز ہم وراہ اور   اچھا وہی رہا کہ جو اچھا نہ ہو سکا

غالب کہتے ہیں:-

"میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا"

داغ کی پیروی "صفیرِ بلبل" کے اوراق کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک ناقد حیران رہ جاتا ہے کہ وہی شاعر جو میر و غالب کی زبان استعمال کر رہا تھا جس کے الفاظ میں خواجہ درد کے جذبات کارفرما تھے وہ یکایک اس ادنیٰ سطح پر کیونکر چلا آیا یہ نتیجہ ہے اسی بے راہروی کا جو مختلف اساتذہ کے تتبع سے کسی شاعر کے کلام میں پیدا ہو جاتی ہے۔ صفیر مرحوم نے پیاپے ایسے استادوں سے اصلاح لی جو مختلف بلکہ متضاد رجحان رکھتے تھے، سطور بالا سے پتہ چلا ہوگا کہ صفیر کی ننھیال کو غالب کے ساتھ گہرے مراسم تھے، حضرت صاحب عالم صاحب اور غالب دونوں کا کلام اُنھوں نے مطالعہ کیا، پھر لکھنوی اساتذہ کے دواوین دیکھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک معجون مرکب بن گئے، ذیل کے اشعار داغ کے رنگ کے ملاحظہ ہوں:-

رشک انگیز آج کیسا ماجرائے آب تھا   ان کے سینہ پر جو دریا میں کفِ سیلاب تھا

یعنی معشوق نہا رہا ہے، اور کفِ سیلاب اُس کے سینہ سے گزر رہا ہے، یہ دیکھ کر ہمارے شاعر کو پانی پر رشک آتا ہے۔

اِن دنوں بوسوں کی باتیں ہو لگا تے جاتے   ورنہ سابق میں حساب آپ کا بیباق رہا

گد گدائے تھے جو ہم کہتے تھے وہ   دیکھیے اب یہ مرا ہاتھ آیا

صفیر کے یہاں اس رنگ کے اشعار کی کمی نہیں، وہی سطحیت، وہی بوالہوسی، وہی جذبات پست کی ترجمانی جو لکھنوی اسکول کے ایک خاص دور میں مایۂ نازش تھی ان کے یہاں بھی ہے ملاحظہ ہو:۔

نہ ڈرو میں ابھی رکھے ہوں کنارے عارض کون عارض سے ملاتا ہے تمہارے عارض

اور یہ مرحلہ یہیں تک ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کا انجام یہ ہوتا ہے:۔

دیکھو تو ہو گئے نیلے مرے سارے عارض آرسی دیکھ کے یہ وصل میں کہنا اُن کا

اس نے بھی ایک پُر لطف شعر سنئے اور شاعر کے حساس دل اور ذہن رسا کی داد دیجئے

یہ اس نے خاتمہ بالخیر اپنے پال ڈالے ہیں رنگا کر کاہے انگیا اپنی چھاتی پر جمائی ہے

شاعر نے اپنی روایاتی تہذیب سے ہٹ کر یہاں محض تفنن شعری کی بنا پر وہ سب کچھ کہہ ڈالا جس کو نثر میں ادا کرنا "غیر مہذب" سمجھا جاتا ہے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ شاعر کی محبوبہ نے رنگین انگیا پہنی ہے وہ اس کو دیکھ کر سمجھ رہا ہے کہ اس کی محبوبہ نے "خاتمہ آم" کا پال ڈالا ہے۔ اسی قسم کی ایک اور شوخی ملاحظہ ہو:۔

سینہ سپاٹ ہے ابھی ہموار کیا کریں سودائے خام ہی طمع اس نونہال سے

دیکھئے اُبھرے پر یہ تیرا جوبن کب تک پھل جوانی کا لے غیرتِ گلشن کب تک

الغرض "صفیر بلبل" کے صفحات میں اس نوع کی سطحی اور سوقیانہ شاعری کے بہت سے نمونے موجود ہیں۔

ناسخ اسکول | صغیر کے یہاں ناسخیت بھی پائی جاتی ہے، محاورہ زبان، رعایت الفاظ، نازک تشبیہات واستعارات ان کے یہاں بھی ہیں:۔

چڑھ گیا جب سے نظر پر آپ کی
اپنی نظروں سے بھی بندہ گر گیا

رات دن سرمست رکھتے ہیں خیالات صغیر
دل بغل میں ہے کہ شیشہ بادۂ گلفام کا

ڈوب مرنے پر بھی سودائی اسیر آب تھا
موجیں تھیں زنجیر پا طوق گلو گرداب تھا

ان کے ہونٹوں نے قہقہوں پر ایسا دھر لیا
کٹ کٹ کے رنگ لعلِ بدخشاں میں رہ گیا

بے وجہ نہیں آپ الگ پھرتے ہیں ہم سے
کچھ جوڑ مقرر کسی اُستاد نے مارا

دھیان اس محیط حُسن کا آنکھوں میں آ گیا
دیکھو کہ دو حباب میں دریا سما گیا

دعائیں پڑھنے لگے پاؤں جلد اُٹھانے لگے
کبھی جو بھول پڑے عاشقوں کے مدفن میں

باتیں سُن سُن کے اُسکی جیتے ہیں
چشمۂ خضر ہے دہن ہم کو

اساتذہ فارسی سے استفادہ صفیر مرحوم کے بہیترے اشعار جامی، عرفی، حزیں اور شعرائے متاخر کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں، یہ بھی نتیجہ ہے فارسی دواوین کے زیر مطالعہ رہنے کا۔ صفیر کا ایک شعر ہے:۔

شکر ہے کام مرا گردشِ ایام بنا ان لبوں کیلئے مٹی سے مری جام بنا

شیخ علی حزیں لاہجی یہی خیال ادا کر گیا ہے:۔

شاید دل حسرت کش لب را بہ لبے دارد در میکدہ خاکم را پیمانہ کنی یارب

صفیر اور حزیں میں کوئی فرق ہے تو صرف اس قدر کہ ایک نے اُردو میں کہا ہے اور دوسرے نے فارسی میں۔ صفیر کی مٹی سے زمانہ نے پیمانہ بنا کر ان کو معشوق کے لب لعلیں سے ملا دیا اور حزیں ابھی اس کی تمنا میں ہیں۔ صفیر فرماتے ہیں:۔

اب تو الف سا قد ترا ہمشکل نوں ہوا یہ نونِ نیستی کی خبر پیری میں ہے شیخ

مطلب یہ ہے کہ شیخ کو پیری نے سرو قد سے جو حرف الف کے مشابہ تھا اب جھکا کر نون کی شکل بنا دیا اور یہ "نون" گویا "نیستی" کا حرف اول ہے اس سے شیخ کو سمجھنا چاہیے کہ اس کے آخری دن آگئے، اس سے قبل بیدل یوں کہہ گیا ہے:۔

صورت قد دوتا آئینہ ترکیب لاست نقش پیری نفی ہستی می کند ہشیار باش

یعنی بوڑھاپے میں جھک جانا گویا لفظ "لا" کی صورت بن جانا ہے، اس لئے پیری کا جھکا ہوا قد ہستی کی نفی ہے۔ صفیر کا ایک شعر ہے۔

او خانماں خراب بتا اب کدھر چلا اے دل مجھے تو عشق میں تو خاک کر چلا

عرفی کہتا ہے :۔

بلائے دیدۂ دل راز پے شناسا نم　　　کسے نہ گویدم اے خانماں خراب کجا

کسی قدر رد و بدل کے ساتھ صفیر اور عرفی کا مرکزی تخیل اور بعض فقرے باہم مل جاتے ہیں۔ صفیر کا ایک مطلع ہے۔

سرد تیرے چہرے سے ہے گرمی بازار شمع　　　اک گل پژمردہ ہے گویا گلِ بے خار میں

صفیر شمع کی ضوفشانیوں کو محبوب کے چہرے کے آگے ماند بتاتے ہیں گویا شمع کی روشنی محبوب کے چہرۂ منور کے نزدیک ایک "گلِ پژمردہ" ہے۔ بالکل یہی تخیل حزیں کے ایک شعر میں بھی موجود ہے :۔

گرہ ساز د زبان شعلۂ شمع انجمن پیرا　　　دراں محفل کہ حرفے زاں عذار آتشیں باشد

لیکن قبل اس کے کہ یہ مضمون ختم کیا جائے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ انکی غزل جو "موج مے" کی ردیف میں ہے اُردو لٹریچر میں اپنی نوع کی یگانہ چیز ہے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ سید امیر حسن بدر مرحوم ہی اس مستانہ غزل کے موجد ہیں جس کی مثال خمریات ابونواس اور میکدۂ خیام میں بھی مشکل ہی سے دستیاب ہو سکتی ہے لیکن صفیر بلبل کے دیکھنے سے پتہ چلا کہ بدر مرحوم نے اپنے استاد کی اختراع فائقہ اور بدیعہ نگارش سے استفادہ کیا ہے۔

بدر	صفیر
گاہ خم میں گہہ سبو میں شیشہ و ساغر میں گہہ	جستجو اس کو ہے کسی کے یوسف گم گشتہ کی
منزلیں طے کر رہا ہے کاروانِ موجِ مے	گردشوں میں رات دن ہے کاروانِ موجِ مے

صفیر مرحوم نے "کار وان موج مے" کی گردشوں کا ثبوت نہیں دیا تھا، حضرت بدر نے اس کے لئے خم، سبو، شیشہ، ساغر کے ارتقائی منازل بیان کئے اور واقعتہً بتادیا کہ "موج مے" منزلیں طے کر رہی ہے، اور ایک وقت ایسا آئے گا جبکہ کسی کے لب میگوں سے مل جائیگی۔ حضرت صفیر کے یہاں "یوسف گم گشتہ" کا فقرہ بہت معنی خیز ہو مولانا بدر اگر یہی فقرہ اپنے مصرعہ ثانی میں چسپاں کردیتے تو اُن کا شعر زیادہ بلند ہو جاتا۔ پھر بھی بدر کا شعر صفیر سے بڑھا ہوا ہے، کیونکہ صفیر "موج مے" کو نہ تو "کارواں" کہنے کی کوئی توجیہہ پیش کرتے ہیں اور نہ "گردش" کا کوئی ثبوت۔

صفیر	بدر
چشم مست ساقی خود ہیں ہو کیا موجِ شراب	آسمان خم مے شفق ساغر مہ و خورشید ہیں
آنکھ کے ڈوروں پہ مجھ کو ہی گمانِ موجِ مے	کہکشاں پر مجھ کو ہوتا ہو گمانِ موج مے

تشبیہات کے میدان میں حضرت بدر اپنے اُستاد سے بڑھ گئے ہیں۔

صفیر	بدر
ہو ترے مینوش کے لب پر بیانِ موج مے	بوسے کیا کیا میں لبِ ساغر کے لیتا جھوم کر
چوستا ہوں رات دن ساقی زبانِ موجِ مے	لب بہ لب مجھ سے اگر ہوتی زبانِ موجِ مے

بہار کا ایک دل والا شاعر قعرِ گمنامی میں

ایک ماہر سیاح جب سرحدِ بہار میں قدم رکھتا ہے تو یہاں کے گوناگوں مناظر عجائبِ قدرت کا ایسا دلکش مظاہرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ بے اختیار اُس کی زبان سے نکل ہی جاتا ہے ،، جمالِ یوسفی دفترِ بہمنی دارد" زندگی کے ہر ہر شعبہ سے قدیم تہذیب عریاں نظر آتی ہے - سلاطین اور فقرا کے مقبرے، کہنہ اور فرسودہ عمارات کے قدیم کتبات، ایک ماہرِ آثار کو اپنی طرف کھینچتے ہیں، شیر شاہ اور حسن سور کے روضے (سہسرام) دولت شاہ کا مقبرہ (منیر) اور بودھ گیا کی زیارت گاہیں، نالندہ کالج (بہار) کے جدید اکتشافات اور راجگیر میں فقرا کے معابد کوہ رہتاس کا عجیب غریب قلعہ، اور عظیم آباد کی ہندو اور اسلامی تہذیب کی یادگاریں اس کے لئے ایک ،،حسن رہگزر،، بن کر رہ جاتی ہیں اور وہ ایک عالمِ محویت و بیخودی میں کھو جاتا ہے یہاں کے قدرتی مناظر، بڑے بڑے دریا، اور آبشاریں، گھنے جنگل اور مرتفع پہاڑوں کے سلسلے شاعروں اور ادیبوں کے لئے کافی سامانِ بصیرت رکھتے ہیں۔ آئیے آج کی صحبت میں اپنے بہار کو اسی ادبی زاویہ نظر سے دیکھیں۔

یہاں کے ایک ممتاز ترین اُردو شاعر مولانا شیخ غلام علی راسخ میر تقی میر کے

بمعصر تھے، آپ ایک مرتبہ مرزا آسود اسے ملنے گئے اور مرزا صاحب کو اپنا یہ شعر سنایا۔

ہوئے ہیں پیر ہم اب دیدنی رونا ہمارا ہے　　پلک پر اپنی آنسو صبح پیری کا ستارا ہے

مرزا نے آپ کو پٹا لیا، راسخ مرحوم کے شاعرانہ نوادر ادب آج زبان اُردو کے جواہر پارے سمجھے جاتے ہیں۔ اُسی اُستاد سخن کے ایک تربیت یافتہ مولانا انور علی یاسؔ تھے

کچھ دن ہوئے میرے عزیز دوست محمد امیر صاحب امیرؔ نے یاسؔ مرحوم کا ایک مطبوعہ دیوان مجھے دیا۔ یہ دیوان اب نایاب ہے۔ مولوی محمد سعید صاحب رئیس عظیم آبادی اور مفتی علی اکرم صاحب آروی نے پہلے پہل ۱۲۸۸ھ میں مطبع نظامی واقع کان پور میں اس کو چھپوایا۔

آرہ کے معمر لوگوں سے آپ کے حالات دریافت کئے لیکن دو ایک بات کے سوا کوئی بات معلوم نہ ہو سکی اسی عرصہ میں مجھے نگرنہسہ (مضافات بہار) جانیکا اتفاق ہوا۔ یہاں ایک عزیز نے مولوی محمد سعید حسرتؔ کا کلیات فارسی دیا[1]۔ یہ نسخہ بھی اب نایاب ہے۔ حسن اتفاق سے اثناے مطالعہ میں کلیات کے اندر آرہ کے بعض لوگوں کا

---

[1] یہ کتاب میرے عزیز بھتیجہ ابوالخیر سلمہٗ کے پاس تھی، آپ کے پردادا سخاوت علی (صدیقی پھلواری) صاحب بڑے خطاط تھے آپ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے "کشف الخلاصہ" مصنفہ مولانا حافظ شجاع الدین حیدر آبادی اور "مقدمۃ الصلوٰۃ" (نام حق) مصنفہ حضرت شرف بہاری کے قلمی نسخے میرے پاس ہیں۔ میرے دادا مرحوم عبدالعلی صاحب سخاوت علی صاحب کے حقیقی بھائی تھے۔ ع۔م

تذکرہ مل گیا، مزید تفتیش کی تو انور علی یاسؔ مرحوم کا مفصل تذکرہ پایا۔ حسرتؔ مرحوم یاسؔ آروی کے داماد تھے۔ اور آج محض حسرتؔ کے کلیات کی بدولت یاسؔ کا تذکرہ محفوظ ہے، ورنہ شاید اس کے تلف ہو جانے کے بعد یہ بھی کوئی نہیں جانے گا کہ یاسؔ کون تھے اور کب وفات پائی[1]؟

ابتدائی حالات و تعلیم بعض معمر لوگوں نے بتایا تھا کہ یاسؔ مرحوم کا وطن اصلی موضع بھورہ ضلع پٹنہ تھا لیکن مولانا حسرتؔ نے اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے، بلکہ وہ آپ کا وطن آرہ بتاتے ہیں۔ ملکی محلہ میں بودوباش تھی، آپ کے بعض رشتہ دار اب بھی موجود ہیں۔ امیر صاحب کے والد مولوی محمد سعید صاحب رجسٹرار مرحوم کو بھی یاسؔ سے ننھیالی رشتہ داری تھی۔ آپ کے والد ماجد کا نام شیخ محمد حیات تھا جنھوں نے ۱۲۳۰ھ میں وفات کی، یاسؔ ۱۲۰۱ھ میں پیدا ہوئے۔ لفظ "چراغ" سے آپ کی تاریخ ولادت نکلتی ہے، ابتدائی تعلیم کے سلسلہ میں عظیم آباد میں رہتے تھے قاضی عباس علی مرحوم اور حسین خاں ریاضی داں سے فنون متداولہ کی چند کتابیں پڑھیں، اس وقت شیخ غلام علی راسخؔ کی شاعری کی شہرت تھی، یاسؔ کو علوم عربیہ کے علاوہ شعر و سخن کا بھی ذوق تھا، راسخؔ مرحوم میر تقی کی صحبت دیکھے ہوئے تھے، یاسؔ نے اردو غزلوں میں راسخؔ مرحوم سے اصلاح لی۔ فنون جمیلہ کا شوق کافی تھا، بعض ماہروں سے فن موسیقی و

---

[1] وزیر علی عبرتیؔ عظیم آبادی (متوفی ۱۲۸۵ھ) نے اپنے تذکرہ معراج الخیال میں یاسؔ کے حالات لکھے ہیں ۱۲

آلاتِ موسیقی کا استعمال سیکھا۔ آپ کے بڑے بھائی مولوی کرامت علی نے جو ۱۲۳۹ھ میں عدالت آرہ میں مفتی مقرر ہوئے تھے، انتقال کیا تو حاکموں نے آپ کو نوازا اور عدالت کا مفتی اور صدر امین بنادیا۔

صاحبان بلگرام و مارہرہ سے تعلقات

یاسؔ کو فارسی ادبیات سے گہری دلچسپی تھی۔ بلگرام اور مارہرہ اس زمانہ میں فارسی کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔ یاسؔ کو میر افتخار علی ذرہؔ، میر امامیؔ، میر محمد عسکری، سیّد سلطان عالم، اور سیّد صاحب عالم مارہروی کے ساتھ گہرے تعلقات تھے۔ سیّد عالم صاحب سجادہ نشین مارہرہ نے ۱۲۵۳ھ میں انتقال کیا تو یاسؔ نے عربی میں ایک نہایت پُراثر تاریخ کہی:۔

توفی ربہ سلطان عالم　　وقد اعطاہ فی الجنات جاہا

سالت الناس عن تاریخ فوتہ　　لتحصیلی علیہ انتباہا

فقالوا آہ و وا ویلاہ آہا　　فآہا ثم آہا ثم آہا

(ترجمہ) ہمارے آقا سلطان عالم نے وفات کی اللہ تعالیٰ نے آپ کو جنت میں مرتبہ عطا فرمایا۔ میں نے لوگوں سے آپ کی تاریخ وفات کے متعلق سوال کیا تاکہ مجھے معلوم ہو، لوگوں نے کہا، آہ! واویلا! آہ! آہ! آہ!۔

یاسؔ عربی زبان پر پوری قدرت رکھتے تھے، اُنھوں نے فیضی کی تفسیر بے نقطہ "سواطع الالہام"... کے تتبع میں ایک مطول خط لکھا تھا۔ اسی طرح میر امامی نے اپنی مثنوی "ثمر مراد"، لکھی تو یاسؔ نے تاریخ کہی:۔

میرامامی کہ در زمانۂ خود — بایدش جامی و نظامی گفت
مثنوی لطیف و پاکیزہ — ہمہ چوں شاعران نامی گفت

سال اتمام آں دل من یاسؔ
طاقت خامۂ امامی گفت ۱۲۴۸

جوانامرگ فرزند

یاسؔ کے ایک لڑکا مولوی منور علی اور ایک لڑکی تھی۔ لڑکی مولانا محمد سعید حسرتؔ عظیم آبادی سے بیاہی ہوئی تھی۔ لڑکا علوم متداولہ سے فارغ ہو چکا تھا لیکن زمانہ نے فرصت نہ دی۔ عین عالم شباب میں ایک سال تک بیمار رہ کر ۱۲۶۲ھ میں وفات کی۔ بوڑھے باپ کے دل و جگر پر اس کا گہرا اثر ہوا، چنانچہ سید صاحب عالم صاحب مارہروی نے تعزیت میں یاسؔ کو جو خط لکھا تھا اُسکے جواب میں یاسؔ فرماتے ہیں:۔

نامہ ہر دو بزرگواران بیک قرطاس بہ پرسش عزائے فرزند مغفرت

لہ سید بندہ علی بندہ مارہروی جو صغیرؔ بلگرامی آروی کے پرداداتھے۔ میرامامیؔ کے چچا ہوتے تھے، زندگی نے وفا کی تو صغیرؔ مرحوم کے حالات زندگی اور شاعری پر بھی ریویو کیا جائے گا۔ صغیرؔ مرحوم کا خاندان علم و ادب اور معارف و رشاد کا گھرانہ تھا۔ یاسؔ کے اکثر دوست جن کا مولانا حسرتؔ نے ذکرہ کیا ہے۔ صغیرؔ مرحوم کے بزرگ تھے۔ شاعری صغیرؔ کی موروثی چیز تھی۔ وہ خود بھی ایک باکمال شاعر گذرے ہیں آرہ کے اکثر اساتذہ سخن مولانا سید امیر حسن بدرؔ، مولوی اسمٰعیل مہرؔ، قاضی واجد حسین وجدؔ سبھوں نے آپ سے فیض حاصل کیا۔ (ع۔م)

لباس ایں فقیر ماتم اساس رسیدہ رہین اخلاق کریانہ گردانیدہ درحقیقت
دریں مدت عمر رسیدن ایں چنیں غم ظاہراً البتہ صعوبتے دارد کہ قوائے
ہمچوں ما ضعیفان و پیراں تاب تحمل آں نمی آرد وخود غم پیری مشہور است
کہ اصعب می شود۔

آخر کار وہی ہوا، جس کا یاسؔ مرحوم کو کھٹکا تھا۔ جوان بیٹے کی وفات سے دل بیٹھ گیا، جذبات میں اُمنگ نہ رہی، دنیا سے دلچسپی کم ہوگئی یاد الٰہی کی طرف طبیعت مائل ہوئی ۱۲۱۲ھ میں ایک مرتبہ حج کر چکے تھے، دوبارہ حج کا ارادہ کیا، آپ کو حضرت سید شاہ احمد پھلواروی قدس سرہٗ سے بڑی عقیدت تھی۔ آخر عمر میں حضرت مولانا شاہ فصیح صاحب غازیپوری کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئے اور ہمیشہ ذکر وشغل میں مصروف رہنے لگے۔ ۱۲۶۲ھ میں حج کے ارادے سے اہل وعیال کو لیکر پٹنہ پہونچے تاکہ کلکتہ سے جہاز پر سوار ہو کر بیت اللہ کی طرف روانہ ہوں لیکن حیات نے وفا نہ کی اور ۲۵ ذیقعدہ منگل کی شب کو ۱۲۶۲ھ میں ہیضہ کے عارضہ سے انتقال کیا انا للہ الخ آپ کا مزار پٹنہ میں مولانا سید حسرتؔ کے والد منشی حاجی واعظ علی صاحب کے مکان کے اندر ایک باغیچہ میں واقع ہے۔

خصوصیاتِ کلام

یاسؔ کے بعد بہار میں اُردو اور فارسی کے بڑے بڑے شعرا گذرے ہیں۔ شاہ ابوالحسن فردؔ، شاہ علی حبیب نصرؔ، محمد سعید حسرتؔ، ظہیر احسن شوقؔ (نیموی)، میر علی محمد شادؔ عظیم آبادی، سید فرزند احمد صفیرؔ بلگرامی (آردی)، کی شاعرانہ نکتہ سنجیوں سے کس کو انکار ہو سکتا ہے، یہ لوگ صرف شاعر نہ تھے

بلکہ عالم اجل اور فنی مہارت میں یگانہ تھے، شاہ نصر پھلواری کا پورا دیوان رومی کے تاثرات حزیں اور سوز و درد سے مملو ہے، نصر کی شاعری کیفیات و جذبات کی شاعری ہے۔ آپ کے یہاں معنیٰ آفرینی اور لفظی صناعیاں کم ہیں مگر اپنے سیلاب جذبات میں پڑھنے والے کو بھی بہالے جاتے ہیں۔ نعت میں کچھ اس انداز کے اشعار کہے ہیں کہ ہر ہر لفظ سے خلوص اور آشفتہ آرزؤں کا اظہار ہوتا ہے، یہ مناقب شعری حُبِ رسول کا نتیجہ تھے، جو صوفی گھرانے کی خاص چیز ہے اور ذوق عامہ کا وہاں تک گزر نہیں۔ فرماتے ہیں ؎

چہ عشق است عشق احمدؐ یارب ایں راہ زماں افزا

چہ درد است درد احمدؐ کاں دل با کم نہاں دارد

کیا کوئی رسمی نعتیہ نگار شاعر اس قسم کا بلند پاکیزہ خیال پیش کرسکتا ہے؟

مولانا حسرت اور شوق نیموی دین کے بلند پایہ عالم گذرے ہیں۔ حسرت نے حافظ اور بابا فغانی، جامی اور عرفی کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں اور حق یہ ہے کہ ان کی بہتیری غزلیں کامیاب رہی ہیں، عرفی کی مشہور غزل ہے۔

گرکام دل بہ گریہ میسر شدے زدوست — صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

حسرت مرحوم نے بھی اس پر غزل کہی جس کا یہ شعر مجھے پسند آیا۔

ماند بہ خندۂ چمن و گریہ سحاب — از یار خندہ کردن و از ما گریستن

یار کے نوشخند اور اپنی گریہ و زاری کو خندۂ چمن اور گریۂ سحاب بتانا حسرت کی

تمثیل نگاری اور شاعرانہ جستجو کا پورا ثبوت پیش کر رہا ہے۔

شوق نیموی کی شاعرانہ قدرت، عذوبتِ بیان، بدائع شعری اور معاملہ بندی، ان کی مثنوی "سوز و گداز" سے ظاہر ہوتی ہے، آپ کی غزلوں میں وہ جوش و خروش نہیں جو مثنوی میں ہے۔ پھر بھی آپ کی بہت سی غزلیں کامیاب کہی جا سکتی ہیں، مجھے آپ کا یہ شعر بہت پسند ہے۔

دیکھ کر خلد دل بھر آیا شوق
یاد آئی کسی کے گھر کی طرح

اسی غزل کا یہ شعر بھی ہے جو اثر اور کیفیت سے لبریز ہے۔

یاس وحسرت کی خاک اُڑتی ہے
بے ترے دل ہے اُجڑے گھر کی طرح

گو یاس مرحوم ان اساتذۂ سخن سے بہت قبل گذرے ہیں آپ کا زمانہ میر کے قریب تھا پھر بھی آپ کے کلام میں زبان کی لطافت و صفائی کے اعلیٰ نمونے پائے جاتے ہیں۔

یاس نے اُردو میں راسخ مرحوم سے اصلاح لی، خود راسخ بھی یاس کی قدر کرتے تھے اور اُن کا کلام سُنا کرتے تھے۔

دریائے اشک یاس ہو چشم سے رواں
آیا جو ذکر راسخِ غفراں مآب کا

اے یاس قدرداں تھے ہماری سخن کے وے
کرتے ہیں یاد راسخِ غفراں مآب کو

اب یاں طرزِ سخن ہیں اے یاسؔ رَاسخ کے یادگار ہیں ہم

معلوم ہوتا ہے اُستاد اور شاگرد کے تعلقات بہت گہرے تھے، دونوں طرف سے خلوص و محبت کا برتاؤ تھا لیکن یاسؔ نے بعض مقطعات میں شاہ نصیرؔ کا بھی تذکرہ کیا ہے

ہیں قدر شناس سخن اے یاسؔ نصیرؔ اب خدمت میں جو اُن کی یہ غزل جائے تو اچھا

معلوم ہوتا ہے رَاسخؔ کی وفات ۱۲۳۸ھ کے بعد یاس نے شاہ نصیرؔ دہلوی سے مشورۂ سخن کرنا شروع کیا تھا، اور یہ نظریہ اس لئے اور بھی محکم ہوتا ہے کہ شاہ نصیرؔ کے تتبع میں یاسؔ نے بھی بعض غزلیں لکھیں۔

ٹیکا و طوق و بالی ہیں مل کر ہلال چار ہیں گرد بدر عارض دل پر ہلال چار

شاہ نصیر اور آپ کے پیرؤں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اَدق قوافی و ردیف اور مشکل زمینوں میں کامیاب غزلیں نکالتے ہیں ظفرؔ کے یہاں سنگلاخ زمینوں میں جو غزلیں پائی جاتی ہیں، وہ شاہ نصیرؔ ہی کی مشکل پسندیوں کا نتیجہ ہیں۔ ظفرؔ پہلے شاہ نصیر سے اصلاح لیا کرتے تھے، خود اُستاد ذوق بھی شاہ نصیر کے شاگرد تھے، اس "ہلال چار"، کی ردیف میں شاہ نصیر کی غزل ہے، یاسؔ شاہ نصیرؔ کے ہمعصر تھے، اُنھوں نے بھی شاہ صاحب کی دقّت پسندی کی تقلید میں یہ نظم لکھ ڈالی اور کون کہہ سکتا ہے کہ یاسؔ نے شاہ نصیرؔ سے کم جگر کاوی کی ہے یا ان کی غزل شاہ صاحب کی غزل سے رتبہ میں کم ہے، فرماتے ہیں:-

لے تیغ پیش ابرو وہ دیکھے تھا ماہ صوم تھی ایک خلق دیکھ کے ششدر ہلال چار

اس "ہلال چار" کو پورا کرنے کے لئے یاس مرحوم نے نزاکتِ خیال کی کتنی وادیاں طے کیں، تیغ، ابرو، ساعدِ سیمیں اور اصل "ہلال آسمانی"، ان چاروں کا اجتماع ہوگیا۔ مشکل ردیف کو کس خوبی سے نباہا۔

دو چوڑیاں دو ٹکڑے جو اس مہ کی شب ہوئیں — وقت سحر تھے بر سرِ بستر ہلال چار

الغرض اسی قسم کے "کوہ کندن" سے کام لے کر یاس نے پوری غزل تمام کی ہے اور میرا خیال ہے شاہ نصیر کے اسکول کی یہ بہترین چیز کہی جاسکتی ہے۔

دیکھو ہر جا نذر ات میری نیاز — میں ہوں کشتہ ہلال ابرو کا

بالکل شاہ نصیر کے تتبع کا نتیجہ ہے، مگر غور سے پورے دیوان کا جائزہ لیا جائے تو میر کے اسکول کی پوری حسیات کارفرما نظر آتی ہے۔ وہی سوز و درد، وہی معصومانہ اندازِ بیان، وہی دردمندانہ لہجہ ادا، وہی گداختگی و برشتگی، وہی حزن والم، جو راسخ کو میر سے ورثہ میں ملا تھا، یاس کے یہاں بھی موجود ہے۔ یہ غزل ملاحظہ ہو:۔

سامنے کب وہ یار گزرے ہے — یوں تو دل میں ہزار گزرے ہے

تا دمِ زیست تھے سبھی ہمدم — کون سوئے مزار گزرے ہے

یاس رہ رہ جو آہ کرتے ہو — تیر سا ہے کہ پار گزرے ہے

اس میں شک نہیں آخری مصرع قدسی کے شعر سے مستفاد ہے، جس کو پہلے مرزا سودا نے اردو کا جامہ پہنایا۔

قدسی کہتا ہے :-

بہار بے سپر جام دیار می گذرد   نسیم ہمچوں خدنگ از کنار می گذرد

دہلی کے ایک مجمعِ علم و ادب میں سودا نے قدسی کے اسی خیال کو اُردو میں پیش کیا۔

بہار بے سپر جام دیار گذرے ہے   نسیم تیر سا سینہ کے پار گذرے ہے

اس عہد کا بہت بڑا نقاد ادب، شیخ علی حزیں کا حریف اور مجمع النفائس (تذکرہ شعرائے فارسی) کا بلند پایہ مصنف خان آرزو مجلس میں موجود تھا فوراً بول اُٹھا۔

شعرِ سودا حدیث قدسی ہے   چاہیئے لکھ رکھیں فلک پہ ملک

لوگوں نے سمجھا کہ "حدیث قدسی" کہہ کر آرزو نے تعریف کی۔ سودا ابھی دکھانے کو خان آرزو سے گلے ملے کہ واقعتاً ان کا شعر بمنزلہ حدیث قدسی تھا اور اس لئے لائق ہے کہ ملائکہ اس کو آسمان پر لکھ رکھیں حالانکہ دل میں سمجھا کہ وسیع النظر ناقد کیسی بے لاگ تنقید کر گیا۔

یاس کے اشعار بالا میں جو کیفیت الیہ ہے، وہ تشریح کی محتاج نہیں۔ میر تقی کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے، فرماتے ہیں :-

ہلکی درد تھے ہم یاس ڈلے آہ نہ کی   یاں تلک دردِ محبت تو چھپایا ہم نے

یہ انداز بیان راسخ مرحوم کے فیوض کا نتیجہ ہے۔

سینہ میں ایک مونس تھا قلبِ خستہ اپنا   سو خون ہو کے ہمدم آنکھوں میں آ رہا ہے

صبر و قرار و تسکین دل سو تو لے گئے سب — کیا ڈھونڈتے ہو تم اب اس گھر میں کیا رہا ہے

اسی غزل کا یہ شعر ہے۔

ہاتھوں کو اپنے لپکا ہے چاک پیرہن کا — ناصح مرا گریباں کیا تو سلا رہا ہے

غالب آپ کے بعد گذرے ہیں اُنھوں نے اسی خیال کو کسی قدر اضافہ کے ساتھ یوں کہا ہے:-

دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

الغرض یاس حقیقتاً میر کے اسکول کے پیرو تھے اور قدرتی طور پر دل بھی ایسا ہی لیکر آئے تھے، اس پر زمانے نے جوان بیٹے کو فنا کے گھاٹ اُتار کر اور بھی غمزدہ بنا دیا، اُن کی کامیاب غزلیں اسی دورِ حرمانی و حزن کی یادگار ہیں۔

ذیل میں آپ کے کلام کا مختصر سا انتخاب دیا جاتا ہے:-

عشق میں حالِ دل و دیدہ نہ پوچھ — ایک صحرا ایک دریا ہو گیا

کر گذرتے جو جی میں تھا صد حیف — نہ ہوا ان تلک گزار اپنا
منتیں ان کی کیں تمہارے لئے — بات کرنا تھا جن سے عار اپنا
ہائے نکلے وہ دشمنِ جانی — جن کو جانا تھا دوستدار اپنا

اے یاسؔ رقیبوں کو ہوا روزِ قیامت
اس شمع کو جب میرے شبستاں میں ہوئی صبح

ہم نے اس سروِ کو دیکھا تھا خراماں اک دن
پھرتی آنکھوں میں ہے وہ خوبیِ رفتار ہنوز

ارتباطِ شمع سے روشن ہے پروانہ کا حال
کیا کرے کوئی کسی سے آشنائی کی ہوس

سوزاں ہیں اشکبار ہیں ہم
محفل میں شمع دار ہیں ہم
چشم عالم کے توتیا ہیں
کس کے در کے غبار ہیں ہم
جن کی خاطر سبک ہوئے آہ
ان کی خاطر کے بار ہیں ہم

بند سب کے کھلے بازو رہے پر اپنے بندھے
فصل گُل کے ہوئے اس رنگ سے ایام تمام

اک عمر کے بعد ان کا میرے پاس یہ پیغام
آیا ہے کہ اس کوچہ میں جایا نہ کروں میں

سیر گلشن سے بافراغ ہوں میں — ہمہ تن یعنی داغ داغ ہوں میں
سر میں شورِ جنوں و دل میں طپش — طرفہ رکھتا دل و دماغ ہوں میں
کھویا جاتا ہوں دل میں سو سو بار — کس کا یوں در پئے سراغ ہوں میں

اعجازِ عیسوی سے توقع بریدہ ہوں — جادوئے چشمِ یار کا آزار دیدہ ہوں
وضعِ جہاں سے نفرتِ دل کا معاملہ — یاں تک کھنچا کہ آپ سے بھی اب کشیدہ ہوں
بزمِ جہاں میں سوزِ دروں سے برنگِ شمع — جس دن سے میری آنکھ کھلی آبدیدہ ہوں
رونے کی جا ہے پاس یہ افتادگی مری — حسرت بھری نگاہ کا اشکِ چکیدہ ہوں

غالبؔ کی اخلاقی کمزوریاں

نگار میں آپ نے مصحفی کے تذکرۂ "عقد ثریا" پر میرا تبصرہ پڑھا ہوگا لیکن بہت بڑا ادبی ظلم ہوگا اگر کوئی شخص عقد ثریا پر کچھ لکھے اور غالبؔ کے ان خطوط کا تذکرہ نہ کرے جو عود ہندی میں پائے جاتے ہیں، یا قاطع برہان یا اسی نوع کی دوسری تحریروں میں موجود ہیں جن میں مرزا صاحب نے اپنی بلند ذوقی اور "ایران نوازی" کا ثبوت دیا ہے۔ عقد ثریا میں انسان بیدلؔ و آرزوؔ، قتیلؔ و واقفؔ، فاخرؔ و مظہرؔ، کے حالات و کلام کا مطالعہ کرتا ہے اور وہ ہندوستانیوں کے اکتسابات شعر و ادب پر فخر کرتا ہے لیکن جب عود ہندی میں غالبؔ کی لن ترانیاں دیکھتا ہے تو اس کے حوصلے بڑی حد تک پست ہو جاتے ہیں، ایک طرف کلمات الشعرا[1]، سرو آزاد عقد ثریا، گلِ رعنا، سفینۂ خوشگو، مجمع النفائس رکھیے اور دوسری طرف مرزا صاحب کی ان طنزیات پر غور کیجئے اور فیصلہ کیجئے کہ غالبؔ جیسے فرزندانِ ہند کی ذہنیت نے شعر و ادب کے ذریعہ ملک و ملت کے مفاد کو کس حد تک نقصان پہونچایا ہے، کاش مرزا صاحب زندہ ہوتے اور میں پوچھتا کہ حضرت! قتیلؔ و واقفؔ، ممتاز

---

[1] مرزا افضل سرخوش۔

وغیاثؔ بے مایہ سہی، ناصر علی و بیدلؔ، آرزو و مظہر فارسی دانی سے نابلد سہی لیکن جس رنگ کے فارسی شعر اُنھوں نے کہے ہیں کسی ایرانی کا ایک بھی اُردو شعر اس پایہ کا دکھا دیجئے، اگر ہندوستان میں فارسی زبان کے ایسے شعرا نہ گزرے جن کا مثل ایران بھی نہ پیدا کر سکا، جن کی ادبیت و فارسی دانی کو ایرانیوں نے بھی تسلیم کر لیا تو بھی ہندوستانیوں کے لئے یہی بات کیا کم باعث فخر تھی کہ ہندوستان خسروؔ و فیضیؔ، بیدلؔ و ناصر علی پیدا کر سکا اور ایران زبان اُردو کا کوئی ایسا شاعر بھی پیش نہیں کر سکتا جو کم سے کم جعفر زٹلی کا ہی ہم رتبہ کہا جا سکے۔ تذکروں میں بعض ان ایرانی شعرا کا حال ملتا ہے جو ہندوستان آئے اور ریختہ کی طرف بھی مائل ہوئے، انھیں میں مرزا معز فطرتؔ اور قزلباش خاں اُمیدؔ بھی ہیں۔ فطرتؔ معاصر تھے بیدلؔ، ناصر علی، سرخوشؔ وغیرہ کے۔ مرزا افضل سرخوشؔ کو ان سے بڑی عقیدت تھی، وہ یہاں تک لکھ جاتے ہیں کہ "قرارداد جمیع مستعدان زمان است کہ آں زمان ہیچ یکے بہ قابلیت و کمالات میرا از ولایت نیامدہ"[۱]، لیکن جب اُنھوں نے ریختہ میں شعر کہا تو یہ:-

از زلف سیاہ تو بہ دل دھوم پڑی ہے   در گلشن آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

اُمیدؔ بھی ایران سے آئے تھے اُن کی طرف بھی ریختہ کے اشعار منسوب ہیں میرؔ اور قائمؔ کے علاوہ ان کے یہ اشعار گردیزی اور میر حسنؔ نے بھی لکھے ہیں، میرؔ

---

[۱] کلمات الشعرا۔

کے معاصر تھے. میر صاحب کا بیان ہے:۔

داخل ذیل امرا بود در ہر سیر و تماشا می رفت و صحبتہا می داشت چنانچہ یک روز در عرس سید حسن رسول نما صاحب قدس سرہ بندۂ نیز بہ تحریک یاران موافق رفتہ بود او ہم تشریف می داشت چوں مرا از دور دید، گفت کہ خوش باشد کہ من ہم دریں ایام دو شعر ریختہ موزوں کردہ ام، بشنوید۔[1]

اس کے بعد میر صاحب نے اُمیدؔ کے وہ دونوں شعر نقل کئے ہیں جو یہ ہیں:۔

یار بن گھر میں عجب صحبت ہے | در و دیوار سے اب صحبت ہے
الحفیظ الحفیظ کرتا ہوں | تیری آنکھوں کو دیکھ ڈرتا ہوں

فطرتؔ کے مقابلہ میں اُمیدؔ کے یہ شعر، صاف، سلیس اور محاورہ سے قریب ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ شاعری کا وہ دور ہے جبکہ اُردو اپنے شباب کو پہونچ چکی تھی، تو دردؔ، آثمؔ، دردؔ، سوداؔ اور میر تقی جیسے نقادانِ سخن کے سامنے آمیہ کے ان شعروں کی کوئی حقیقت ہے؟ ایرانی شعرا نے بہت سر مارا تو یہ چند شعر کہے۔ اسی کے مقابلہ میں بیدلؔ کا ضخیم فارسی کلیات دیکھئے، ناصر علی کا دیوان پڑھئے اور فیصلہ کیجئے کمال کے اعتبار سے شعرائے ایران قابل داد ہیں یا شعرائے ہند!

اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہی غالبؔ جو خود ہندی ہیں یہ کچھ لکھتا ہے "اُردوئے معلیٰ" میں فارسی زبان کے بہت سے ایسے شعرا کی مدح کرتا ہے جو اہل

---

[1] نکات الشعرا صفحہ ۸

عہد میں سجادہ نشینی یا کسی بلند منصب پر فائز تھے، ان کی اکثر تحریریں پھلواری اور بہار میں محفوظ ہیں۔ خود آرہ کے مشہور شاعر باقر کی فارسیت کی مرزا صاحب نے ستائش کی ہے۔[1]

اب آیئے کسی قدر تفصیل کے ساتھ مرزا صاحب کے ترہات پر بحث کریں مرزا صاحب چودھری عبد الغفور سرور کے نام خط لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں:۔

فارسی کی تکمیل کے واسطے اصل الاصول مناسبت طبیعت کی ہے پھر تتبع کلام اہل زبان، لیکن نہ اشعار قتیل و واقف و شعرائے ہندوستان کو یہ اشعار سوائے اس کے کہ ان کو موزونی طبع کہئے اور کسی تعریف کے شایان نہیں ہیں نہ ترکیب فارسی نہ معنی نازک ہاں الفاظ فرسودہ عامیانہ جو اطفال دبستان جانتے ہیں اور جو متصدی نثر میں درج کرتے ہیں وہ الفاظ فارسی یہ لوگ نظم میں خرچ کرتے ہیں جب رودکی و عنصری و خاقانی و رشید و طواط اور اُن کے امثال و نظایر کا کلام بالاستیعاب دیکھا جائے اور ان کی ترکیبوں سے آشنائی بہم پہونچے اور ذہن اعوجاج کی طرف نہ لے جائے تب آدمی جانتا ہے کہ ہاں فارسی یہ ہے۔[2]

مرزا صاحب نے ایک سانس میں ہندوستانی فارسی کے سارے ذخیرہ کو زباندانی اور نزاکت معنی کے اعتبار سے بے مایہ کہہ دیا، اسی کے ساتھ فارسی کی تکمیل کے لئے تتبع کلام اہل زبان اور مناسبت طبیعت کو لازمی ٹھیراتے ہیں۔ آگے چل کر جب مرزا صاحب نے

---

[1] مقدمہ دیوان باقر سید عطا حسین

[2] عود ہندی صفحہ ۸

خود ہی قتیلؔ و واقفؔ اور شعرائے ہند کی ،، موزونی طبع ،، کو تسلیم کرلیا ہے تو پھر ،، مناسبت طبیعت ،، کی بحث ہی ختم ہو جاتی ہے اور اگر ،، مناسبت طبیعت ،، سے ان کی مراد شعریت وادبیت کے علاوہ کچھ ہے تو اس اہمال سرائی اور ایہام طرازی کی تشریح بھی کرنی چاہئے تھی، رہ گیا تتبع کلام اہل زبان، تو اس کے متعلق تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ قتیلؔ و واقفؔ نے کس اہتمام کے ساتھ حصول زبان اور تتبع اہل زبان کی طرف توجہ کی، قتیلؔ نے مرزا محمد باقر شہیدؔ اصفہانی کی ظل عاطفت میں تربیت پائی، شہیدؔ ہی نے مرزا صاحب کیلئے قتیلؔ تخلص پسند کیا[۱]۔

واقفؔ کے لئے بھگوان داسؔ کی شہادت سنئے :-

،، خودش می گفت کہ در اوایل از بندر ابن ،، خوشگو ،، و آفرین لاہوری رشاہ فقیر اللہ) اصلاح شعر گرفتہ ام آخر وضع کلام ایشان مطبوع طبع من نہ افتاد دیوان سعدیؔ و خسروؔ را پیش نہادہ بہ مشق سخن پرداختم[۲] ،،

واقفؔ نے سعدیؔ اور خسروؔ کا کلام پیش نظر رکھ کر مشق کی، سعدیؔ تو مسلمات میں سے ہیں، رہ گئے خسروؔ تو ان کی اہلیت و عظمت، ان کی زبان دانی و نکتہ سنجی کا اعتراف مرزا صاحب کو بھی ہے[۳]۔ جہاں تک اصول انتقاد کا تعلق تھا، مرزا صاحب کے معیار پر قتیلؔ و واقفؔ پورے اترتے ہیں، اب آپ ہی فیصلہ کیجئے ہم ان ترہات کو مرزا صاحب

---

[۱] عقد ثریا [۲] سفینۂ ہندی مخطوطہ پٹنہ لائبریری

[۳] عود ہندی صفحہ ۴۳

کی زبان دانی کا نتیجہ سمجھیں یا زبان درازی کا۔

رودکی وعنصری، خاقانی و وطواط کی مثال دیکر اُنھوں نے جیسی تنقید کی ہے، اور پھر شہادت و توضیح سے جس طرح گریز کیا ہے اس سے سوائے اس کے کہ مرزا صاحب کا تعصب ظاہر ہو اور کوئی انتقادی نظریہ واضح نہیں ہوتا۔ اس لیئے ہم بھی اس پر التفات کرنا پسند نہیں کرتے، ہاں دوسری جگہ مرزا صاحب نے اس کی وضاحت کی ہے آگے یہ بحث آتی ہے، ہم مرزا صاحب کے اُس دعوے پر نقد و نظر کرینگے ایک اور لن ترانی سُنیئے، حضرت صاحب عالم صاحب کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

نظامی ایسا ہوا کہ جب تک فرید آباد کا کھتری دیوانی سنگھ متخلص بہ قتیل جس کو حضرت نے مرحوم لکھا ہے، اُس کی تصدیق نہ کرے تب تک اُس کا کلام قابلِ استناد نہ ہو، قتیل اساتذہ سلف کے کلام سے قطعاً آشنا ہی نہیں اس کے علم فارسی کا ماخذ ان لوگوں کی تقریر ہے کہ نواب سعادت علی خاں کے وقت میں ممالک مغربی کی طرف سے لکھنؤ آئے اور ہنگامہ آرا ہوئے، بیشتر ان میں کشمیری یا کابلی و قندھاری تھے اور اگر احیاناً کوئی عامہ اہل ایران سے بھی ہو، تو تقریر اور ہے اور تحریر اور ہے۔ اگر تقریر بعینہ تحریر میں آیا کرے تو خواجہ بقراط سے اور شرف الدین علی یزدی اور ملا حسین واعظ کاشفی اور طاہر وحید یہ سب نثر میں کیوں خون جگر کھایا کرتے، وہ سب طرح کی نثر میں جو لالہ دیوانی سنگھ قتیل متوفی نے

بہ تقلید اہل ایران لکھی ہیں نہ رقم فرمایا کرتے یہ شخص مدعی ہے کہ کدہ کا لفظ سوائے چار پانچ اسم کے اور اسم کے ساتھ ترکیب نہیں پاتا، پس آرزو کدہ اور دیوکدہ اور نشتر کدہ اور امثال اس کے جو ہزار جگہ اہل کلام میں آیا ہے وہ نادرست ہے، میں اور آپ بیٹھیں اور اس کے خرافات پڑھے جائیں اور جو میں عرض کروں اس پر حضور غور فرمائیں۔ تب معلوم ہو کہ یہ کتنا نحو اور فارسی دانی سے کتنا بیگانہ ہے[1]

مرزا صاحب کے سطور بالا پڑھئے اور تضاد بیان، اور انحراف اصول پر ٹھنڈے دل سے غور کیجئے، غریب کو یاد نہ رہا کہ زبان کے باب میں انھوں نے جو اصول قائم کیا ہے، اس سے انحراف تو نہیں کر رہے ہیں، مرزا صاحب بڑے طنطنہ کے ساتھ عود ہندی میں ایک جگہ عرفی اور ابو الفضل کا مناظرہ نقل کرتے ہیں اور اپنے زعم میں عرفی کی فتح تسلیم کرتے ہوئے یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ عرفی نے جب سے ہوش سنبھالا ایران کے بڈھوں اور بڈھیوں سے فارسی سنی یہاں پر انھوں نے سنی ہوئی تقریروں کو زباندانی کے لئے لازمی قرار دیا[2]۔ اور پھر سطور بالا میں یہ بھی فرمانے لگے "تقریر اور ہے تحریر اور ہے"۔ اگر یہی کلیہ ہے تو پھر مرزا صاحب کا سارا قصر بیداد ہی سرنگوں ہو جائے گا، کیونکہ اہل ایران کی تحریروں ہی نے خسرو و فیضی، بیدل و ناصر علی، ماہر و سرخوش پیدا کئے۔

اب رہ گئی یہ بحث کہ قتیل پر قندھاری و کابلی ماہرین فارسی نے اثر ڈالا تھا، جو

---

[1] عود ہندی صفحہ ۱۴ - ۱۵ [2] عود ہندی صفحہ ۴۳

نواب سعادت علی خاں (والی اودھ) کے زمانہ میں لکھنؤ آ گئے تو یہ بھی مرزا صاحب کی قلت مطالعہ و عدم واقفیت کا نتیجہ ہے، مرزا قتیلؔ جب دیوانی سنگھ تھے اسی وقت فیض آباد میں میر باقر شہیدؔ اصفہانی جیسے شاعر با کمال اور ماہر اہل زبان کا سایہ نصیب ہوا۔ قتیلؔ کی عمر اس وقت ۱۸ سال کی تھی؛ بالکل نوجوان تھے، شہیدؔ ہی نے بقول مصحفی ان کو مسلمان کیا۔

اس انتقاد کے سلسلہ میں مرزا نے نظامی کا بھی نام لیا ہے، شاید انھیں معلوم نہیں کہ نظامی کی شہرت اور سربلندی کا سبب ان کی زباں دانی اور فارسیت نہیں بلکہ صوفیانہ ارشادات و معارف نے ان کو یہ عزت بخشی ہے، ورنہ زبان دانشا کے لحاظ سے شعرائے اصفہان اور شیراز نظامی، رومی، اور عطار وغیرہ کو قابل استناد نہیں سمجھتے، اسی طرح جس طرح دہلی اور لکھنؤ والے دکن و بنگالہ کے سخنوروں کو نظر میں نہیں لاتے

حضرت صاحب عالم صاحب کو ایک خط لکھتے ہیں اور سجع اور ایطا کے متعلق طویل بحث کرتے ہوئے عبدالواسع، غیاث الدین (صاحب غیاث اللغات)، اور محمد حسین (قتیلؔ) کی شان میں جو نا ملائم کلمات استعمال کئے ہیں، وہ مرزا صاحب کے اخلاق تربیت و تہذیب کے بہت کچھ آئینہ دار ہیں، سنیئے اور داد دیجئے:۔

میرے بیان پر غور کرو، اور جو عبدالواسع اور غیاث الدین اور عبدالرزاق ان ناموں کی شوکت نظر میں ہے تو تم جانو ایک شخص بھیک مانگتا ہے باپ نے اس کا نام میر بادشاہ رکھ دیا ہے، اصل فارسی کو اس "کھتری بچہ" قتیلؔ علیہ ما علیہ نے

تباہ کیا رہا سہا غیاث الدین رام پوری نے کھو دیا، ان کی سی قسمت کہاں سے لاؤں جو صاحب عالم کی نظر میں اعتبار پاؤں، خالصاً للہ غور کرو کہ وہ "خران نامشخص" کیا کہتے ہیں اور میں خستہ دردمند کیا بکتا ہوں، واللہ نہ قتیل فارسی شعر کہتا ہے اور نہ غیاث الدین فارسی جانتا ہے، میرا خط پڑھو یہ نہیں کہتا کہ خواہی نہ خواہی پڑھو، قوت ممیزہ سے کام لو، "ان غولوں پر لعنت کرو" سیدھی راہ پر آجاؤ اگر نہیں آتے تم جانو تمہاری بزرگی پر اور مرزا تفتہ کی نسبت پر نظر کرکے لکھا ہے نہیں کہتا کہ خواہی نہ خواہی میری تحریر کو مانو مگر اس "کمتری بچہ" سے اور اس "معلم" سے مجھ کو کمتر نہ جانو، عربی کا حرف اور ہے، فارسی کا قاعدہ اور ہے سمجھو نہ سمجھو تم کو اختیار ہے، عقل کو کام فرماؤ، غور کرو، سمجھو، عبدالواسع پیغمبر نہ تھا، قتیل برہما نہ تھا، واقف غوث الاعظم نہ تھا، میں یزید نہیں ہوں، شمر نہیں ہوں، مانتے ہو مانو نہ مانو تم جانو۔[1]

یہ ہے اخلاقی مرتبہ اس عظیم الشان شاعر کا، جو ہماری زبان و ادب کا ہیرو سمجھا جاتا ہے، یقیناً کسی انسان کی ادبی زندگی اس کی اخلاقی خصوصیات سے بالکل الگ چیز نہیں کہی جا سکتی، لیکن غالب کی اخلاقی کمزوریوں نے ان کی شعریت اور ادبیت کا پلہ بہت کچھ سبک کر دیا اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی فلسفہ طرازیوں اور شاعرانہ نکتہ سنجیوں کے لحاظ سے اگر ایک طرف احترام کا مستحق ہے تو دوسری طرف اپنی بدزبانی، اعوجاج طبع

---

[1] عود ہندی صفحہ ۲۱

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اور خود پرستی کے باعث حد درجہ قابلِ الزام بھی ہے قتیل و واقف، عبدالواسع و غیاث الدین اس کے ہمعصر نہ تھے اور اس لئے غالب کی ہرزہ سرائیوں کو معاصرانہ رقابت کا نتیجہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، معاصرین کے ساتھ رشک و رقابت کے واقعات سے شعراء علماء کے علاوہ صوفیہ کے تذکرے بھی بھرے ہوئے ہیں۔

شیخ نجم الدین صغری کا حضرت قطب الدین بختیار کاکی سے کشیدہ ہونا، علامہ رازی اور حضرت بہاؤ الدین کی کشاکش، بدایونی و فیضی کی شکر رنجیاں، معاصرانہ چشمک کا نتیجہ ہیں۔ اگر صورت حالات یہی ہوتی تو ہم مرزا صاحب کو معاف کر دیتے لیکن ایسا نہیں، ان کو اپنی فارسی دانی کا بڑا پندار تھا، وہ اپنے سامنے کسی کو نظر میں نہ لاتے تھے، اللہ اللہ وہی شخص جو ایسا بلند شعر کہے:۔

ندارد بت پرستی عیب عار خود پرستیدن   خدا توفیق کیش کفر بخشد دیں پناہاں را

وہی شخص خود پرستی کے قعر مذلت تک نظر آئے۔ وہی شاعر جو ایک اسلامی فرماں روا کے سامنے یوں سر نیاز خم کرے۔

خانہ زاد اور مرید اور مداح   تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر   نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

یا مجھ نثر کی شان میں یوں کہے:۔

آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا   ہے فخر سلیماں جو کرے تیری وزارت

اور یہیں پر ختم نہیں شاہزادہ جواں بخت کی تقریب شادی میں سہرا لکھے اور اس پر فخر

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ میں نے ممتاز و اختر کی شاعری کو ناقص کہا تھا، اس رقعہ میں ایک میزان عرض کرتا ہوں، حضرت صاحب ان صاحبوں کے کلام کو یعنی ہندیوں کے اشعار کو قتیل و واقف سے لیکر بیدل ناصر علی تک اس میزان میں تولیں میزان یہ ہے، رودکی و فردوسی سے لیکر خاقانی و سنائی و انوری وغیرہم تک ایک گروہ ان حضرات کا کلام تھوڑے تفاوت سے ایک وضع پر ہے، پھر حضرت سعدی طرز خاص کے موجد ہوئے، سعدی و جامی و ہلالی یہ اشخاص متعدد نہیں، فغانی اور ایک شیوۂ خاص کا مبدع ہوا۔ خیالہائے نازک و معانی بلند اس شیوہ کی تکمیل ظہوری، و نظیری، عرفی و نوعی بھی سبحان اللہ قالب سخن میں جان پڑ گئی اس روش کو بعد اس کے صاحبان طبع نے سلاست کا چرچا دیا، صائب و کلیم و سلیم و قدسی و حکیم شفائی اس زمرہ میں ہیں، رودکی و اسدی و فردوسی، یہ شیوہ سعدی کے وقت میں ترک ہوا اور سعدی کے طرز نے بہ سبب سہل ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا فغانی کا انداز پھیلا اور اس میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے گئے، تو اب طرزیں تین ٹھہریں ہیں، خاقانی اور اس کے اقران، ظہوری اس کے امثال، صائب، اس کے نظایر۔ خالصاً للہ ممتاز و اختر وغیرہم کا کلام ان تین طرزوں میں سے کس طرز پر ہے۔ اچھی طرز ہے مگر فارسی نہیں ہے، ہندی ہے، دار الضرب شاہی کا سکہ نہیں ہے، ٹکسال باہر ہے داد داد، انصاف انصاف[۵]

---

[۵] عود ہندی صفحہ ۴۵، ۴۶

مرزا صاحب کی یہ "میزان"، اگر کسی یورپین مستشرق کے سامنے رکھدی جائے، تو معلوم نہیں وہ ان کی "مہر نیمروز" اور کلیات نظم کو ان کی تراوش فکر کا نتیجہ بھی سمجھنے کے لئے تیار ہوگا یا نہیں، جو شخص تاریخ و تذکرہ سے اس حد تک ناآشنا ہو کہ فارسی شاعری کی تین طرزیں قرار دے اور خاقانی کے ساتھ فردوسی کا نام لے، سعدی کے ساتھ جامی و ہلالی کا، ظہوری کے ساتھ نظیری کا اور صائب کے ساتھ قدسی و شفائی کا وہ دوسروں کے رنگ کلام پر تبصرہ کرے! حیرت ہے، کاش مرزا صاحب زندہ ہوتے اور کوئی پوچھتا حضرت! تاریخ و لسانیات کے حقایق و نکات جو آپ نے بیان فرمائے ہیں، ان میں سب سے اہم چیز تھی وہی آپ نے چھوڑ دی، مانا طرزیں تین ہی سہی لیکن ضرورت تو یہ تھی نا کہ ان کی خصوصیات سلسلہ وار گنائی جاتیں اور پھر ممتاز و اخص، واقف و قتیل، بیدل و ناصر علی کے کلام کا تجزیہ کر کے اس میزان پر تولا جاتا، اگر کوئی مدعی یہ کہہ دے کہ ان طرزوں میں سے کسی نہ کسی طرز سے شعرائے ہند کا کلام ضرور مل جاتا ہے تو پھر آپ کے پاس کیا جواب ہے، یہ تو محض آپ کا ادعا ہی ہے، دلایل و نظایر تو آپ نے دیئے نہیں اب کوئی خاک اس میزان سے کام لے۔

اب آیئے مرزا صاحب کی ان تین طرزوں پر تاریخ و تذکرہ کی روشنی میں بحث کریں، فرماتے ہیں:-

"رودکی و فردوسی سے لیکر خاقانی و سنائی و انوری وغیرہم تک ایک گروہ ان حضرات کا کلام تھوڑی تھوڑی تفاوت سے ایک وضع پر ہے"

رودکی وفردوسی کو خاقانی، سنائی اور انوری کی صف میں لانا ایسا ہی ہے، جیسے کوئی فضلی اور ولی وغیرہ کو میر، قائم اور ضیا کا ہم رنگ بتائے اس میں شک نہیں فارسی کی عشقیہ شاعری کی ابتدا رودکی ہی سے ہوتی ہے۔ چنانچہ مولانا شبلی نے بھی یہی لکھا ہے، مگر نہ رودکی کو فردوسی سے کوئی نسبت ہے اور نہ فردوسی کو خاقانی سے اور نہ سنائی وانوری میں کوئی تشابہ ہے۔ دقیقی، اسدی، فردوسی نے فارسی کی مثنوی نگاری کی غیر فانی خدمتیں انجام دیں۔ اسی طرح خاقانی نے صوفیانہ شاعری کو ترقی دی، چنانچہ جامی کا یہ لکھنا " دیر اوراے طور شعر طور دیگر بودہ است[۱]" اور ملا نور اللہ شوستری کا یہ نظریہ " در مواعظ وحکم طریقہ شیخ سنائی پیمودہ[۲]" اپنی جگہ بالکل حقیقت ہے، جامی اور شوستری کی تائید دولت شاہ کی اس تحقیق سے بھی ہو جاتی ہے کہ خاقانی پہلے حقایقی تخلص کرتے تھے[۳]۔ بات یہ ہے کہ اتفاقات نے خاقانی کی صوفیانہ رشحات فکر میں درباری زندگی کی تلخیاں وآلائشیں بھر دیں اور وہ سعدی وسنائی کی طرح نیم صوفی ہو کر رہ گئے ورنہ آج ان کا پایہ رومی وعطار سے کم نہ ہوتا تخلص حقایقی کا انتخاب ہی بتا رہا ہے کہ شروع ہی سے ان کا رجحان، فلسفہ اخلاق وحکمیات کی طرف تھا اگر منوچہر شروان شاہ کے دربار سے وابستگی نہ ہوتی تو وہ بہت بلند صوفی شاعر ہوتے، قصیدہ گوئی میں یقیناً انکو ید طولیٰ حاصل تھا، لیکن صوفیانہ، حکیمانہ، اور منجمانہ تلمیحات نے اس کے قصائد کو انوری سے

---

[۱] نفحات الانس [۲] مجالس المومنین مخطوطہ پٹنہ لائبریری

[۳] تذکرہ دولت شاہ سمرقندی مخطوطہ پٹنہ لائبریری

بالکل ممتاز رکھا ہے، اس لحاظ سے بھی انوری سے اور اس سے کوئی مماثلت نہیں۔

مرزا صاحب دوسری طرز کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"پھر حضرت سعدی طرز خاص کے موجد ہوئے، سعدی و جامی و ہلالی یہ اشخاص متعدد نہیں"

بیشک سعدی نے ایک خاص طرز کی ایجاد و اختراع کی، لیکن کس صنفِ کلام میں؟ مرزا صاحب نے یہ نہیں بتایا سعدی جس دور میں گذرے ہیں وہ صوفیانہ شاعری کے شباب کا زمانہ تھا، اسی وقت رومی و نظامی بھی گزرے ہیں یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر نکلسن سعدی کو "نیم صوفی" کہتا ہے[1]۔ صوفیانہ شاعری میں اپنی عملی اخلاقیات کے باعث سعدی ایک خاص مرتبہ رکھتے ہیں، لیکن اس کے موجد نہیں، ہاں فارسی تغزل میں اُنھوں نے اپنی ایک خاص راہ نکالی، اس صنف میں نہ تو وہ کسی کے مقلد و متبع ہیں اور نہ فارسی شعرا میں ان کا ہمسر ہوا، جامی کو تغزل میں سعدی سے دور کا بھی واسطہ نہیں، عراقی کے ہمرنگ ہوں گے، البتہ مثنوی نگاری و صوفیانہ شاعری میں وہ نظامی و خسرو کے پہلو بہ پہلو ہیں۔

تیسری طرز کے متعلق مرزا صاحب کا ارشاد ہے:۔

"فغانی اور ایک شیوہ خاص کا مبدع ہوا، خیالہائے نازک و معانی بلند، اس شیوہ کی تکمیل کی ظہوری و نظیری، عرفی و نوعی بھی سبحان اللہ قالب سخن میں جان پڑ گئی اس روش کو بعد اس کے صاحبان طبع نے سلاست کا چرچا دیا صائب و

[1] مقدمہ دیوان شمس تبریز مطبوعہ کیمبرج

کلیم و سلیم و قدسی و حکیم شفائی اس زمرہ میں ہیں"

یک لخت مرزا صاحب ساتویں صدی سے اچھل کر دسویں صدی تک چلے آئے اور درمیان میں حافظ کو ہضم کر گئے جو بذات خود ایک خاص طرز کے مبدع ہیں، اچھا اسے جانے دیجئے، بیشک فغانی نے ایک خاص شیوہ کی ابداع و اختراع کی اور عہد اکبری کے وہ کثیر التعداد عظیم المرتبت شعرا، عرفی، تقی اوحدی، ظہوری، قمی، نظیری وغیرہ نے جو ہندوستان میں آئے فغانی کی پیروی کی جیسا کہ تذکروں سے ثابت ہے، تقی اوحدی کا خود اعتراف ہے کہ جس زمانہ میں وہ اصفہان سے شیراز آئے تو عرفی سے ملے۔ اس وقت مشاعروں میں طرح کے لئے بابا فغانی کے اشعار کا انتخاب ہوتا تھا،[1] خان آرزو نے بھی اسی کو عرفی کے ذکر میں دہرایا ہے[2]۔ مرزا صاحب ظہوری کے زلہ ربا ہیں اور انھوں نے فارسی غزلیات میں بڑی حد تک اسی کے خوان کرم کی ریزہ چینیاں کی ہیں پھر بھی اُنھوں نے اس کے ساتھ عرفی و نظیری کا بھی نام لیا ہی، عرفی و نظیری میں ایک حد تک ہمرنگی بھی پائی جاتی ہے۔ گو صائب کا مشہور شعر ہے:-

صائب چہ مجال است شوی ہمچون نظیری   عرفی بہ نظیری نہ رسانید سخن را

اسی پر تبصرہ کرتے ہوئے خان آرزو فرماتے ہیں "انصاف اینکہ طرز و طور ہر استاد جدا است و کلام ہر یکے را چاشنی خاصے[3]"، لیکن ظہوری دور متاخرین میں ایک

---

[1] عرفات العاشقین مخطوطہ ٹپنہ لائبریری   [2] مجمع النفائس جلد ۲ مخطوطہ ٹپنہ لائبریری

[3] مجمع النفائس ذکر نظیری

خاص طرز کا مالک ہے، اس سے قبل فارسی زبان میں کسی شاعر کے یہاں اس اسلوب، ادا، و طرز کا پتہ نہیں جو اس کی غزلیات میں ہیں، معنی آفرینی کے اعتبار سے وہ اپنی آہنگ میں یگانہ تھا، مرزا صاحب کی فارسی غزلیات ظہوری ہی کی پیروی کا نتیجہ ہیں[1]. اسی طرح نظیری کو کوئی نسبت ہوگی تو کیٹس اور قائم سے وہی سوختہ سامانی اور غم کوشی، دل فروشی اور پامالی جس نے کیٹس اور قائم پیدا کیے نظیری کے خمیر میں بھی ودیعت تھی۔

مرزا صاحب نے صائب اور کلیم و سلیم، قدسی و حکیم شفائی کو ایک صف میں لا کھڑا کیا اور پھر اس کے بعد دور عالمگیری سے لیکر ان کے عہد تک جتنے ایرانی شعرا ہندوستانی میں آئے ان کا کوئی ذکر ہی نہیں، میں پوچھتا ہوں سرخوش، آزاد اور حزیں نے اپنے تذکروں میں جن معاصر ایرانی شعرا کا حال لکھا ہے، ان کے متعلق مرزا صاحب کا کیا فیصلہ ہے۔ محمد سعید اشرف، مرزا معز فطرت، حزیں، والہ یا پھر جو ہندوستان نہ آئے جلال اسیر، آذر، راہب وغیرہ کا کلام کس طرز میں ہے۔ صائب نے حکیم رکنائے کاشی اور حکیم شفائی سے استفادہ ضرور کیا[2]۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ صائب کا کلام تو ان کی زندگی ہی میں اس قدر مشہور ہو جائے کہ بقول مرزا افضل سرخوش غیر ممالک میں تحفتہً جائے، شاہان روم وغیرہ عباس ثانی سے دیوان صائب طلب کریں[3]

---

[1] ملاحظہ ہو "سرزمین ایران کا ایک رعنا ادیب دکن میں" از عبد المالک۔ مطبوعہ "ایوان" گورکھپور سنہ ۶۳۱

[2] نشتر عشق مخطوطہ پٹنہ لائبریری

[3] کلمات الشعرا، کتبہ طاق بستان قلمی نسخہ

اور عوام میں شفائی کو کوئی جانے بھی تو صائب کی نسبت سے۔ والہ داغستانی کا بیان ہے کہ صائب کو بچپن میں ایک اہل اللہ نے سریش کا ایک پیالہ بھر کر دیا تھا، صائب نے دو حصہ آنکھ موندھ کر پی لیا، باقی ایک حصہ چھوڑ دیا۔ اسی واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"در آں دلچسپی کہ در کلام مرزائے مرحوم است بہ سبب سریش اولیا است والا

ظاہر احوال مرزا مقتضی ایں نبود کہ آں ہمہ حقایق و معارف از وے صدور باید"[1]

اس میں شک نہیں کلیم کو بھی شاہجہاں نے کئی مرتبہ سونے سے تولا، لیکن قدر افزائی درباری تملقات اور شاعرانہ پست خیالی کا نتیجہ تھی، قدسی کی ساری کائنات اس کی ایک بے مثل نعت ہی، شفائی کی متاع عزت میں یہی بہت ہے کہ صائب اس کا شاگرد تھا، الغرض مرزا صاحب کی یہ ساری کاوکاد تنقید تذکرہ و تاریخ سے نابلد ہونے کا نتیجہ ہے، اُنھوں نے فارسی شاعری پر جو غیر ماہرانہ تبصرہ کیا ہے اس نے ہمیں مرزا صاحب کی طرف سے بہت بدظن کر دیا اور طرہ یہ کہ بایں وقوف و مطالعہ وہ ہندوستان کے سارے فارسی شعرا کو بے مایہ و غیر مستند سمجھتے ہیں اور اس پہ اصرار کر رہے ہیں۔

---

[1] ریاض الشعرا قلمی نسخہ پٹنہ لائبریری

آرہ کے دورِ ادبی کی ایک مختصر تاریخ

اور

جناب سیّد امیر حسن صاحب بدرؔ کے "خمخانہ" پر ایک طائرانہ نگاہ

جس خاک سے انسان پیدا ہوتا ہے اُس کی سرشارانہ محبت اور والہانہ پرستاری تاریخ نفسیات کا ایک مسلمہ واقعہ ہے جس کے تعارف کے لئے نہ کسی دقیقہ سنجی کی ضرورت ہے اور نہ کسی افسانہ تراشی کی، بشریت کے لئے یہ ضروری ہے؛ اور کسی انسانی نفس میں اس کا فقدان اس کی پستیٔ حوصلہ اور تنگیٔ ظرف کا ایک ایسا شکوہ حسرت اندوز ہے جو منطقیانہ استدلال و استنتاج کا منت کش نہیں فضل انسانی کی اس خصوصیت کو مدنظر رکھ کر حدیث شریف میں حب وطن کو "من الایمان" کہا گیا ہے۔ حب وطن کے متعلق، تاریخ و سیر، ادبیات و سیاسیات میں کثرت سے واقعات ملتے ہیں، اسکی ہمہ گیری شعرا و ادبا ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ مجاہدین، اور مہاجرین (اسلام) کے سوانح حیات بھی اس لذت الم کے تذکروں سے خالی نہیں حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ شروع شروع مدینہ میں جب مسلمان ہجرت کر کے آئے تو حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت بلالؓ بخار میں

مبتلا ہوئے جنابہ صدیقہؓ عیادت کے لئے تشریف لے گئیں، پوچھا ابا جان کیا حال ہے، اے بلالؓ تمہاری کیسی طبیعت ہے، حضرت ابو بکرؓ بخار کی شدت میں مبتلا ہوتے تو یہ شعر پڑھتے

کُلُّ امْرِئٍ مُصَبَّحٌ فِی اَهْلِهٖ | وَالْمَوْتُ اَدْنیٰ مِنْ شِرَاکِ نَعْلِهٖ

ہر شخص اپنے گھر میں صبح کرتا ہے | موت اُسکی جوتی کے تسمے سے نزدیک تر ہے

اور حضرت بلالؓ کا بخار اُتر جاتا تو وہ یہ اشعار پڑھتے :-

اَلَا یَالَیْتَ شِعْرِیْ هَلْ اَبِیْتَنَّ لَیْلَةً | بِوَادٍ وَحَوْلِیْ اِذْخِرٌ وَجَلِیْلٌ

وَهَلْ اَرِدَنْ یَوْمًا مِیَاهَ مَجَنَّةٍ | وَهَلْ یَبْدُوَنْ لِیْ شَامَةٌ وَطَفِیْلٌ

(ترجمہ) الٰہی مجھ کو مکہ میں ایک رات کب ملے گی، جب میرے گرد اذخر اور جلیل (گھاس کی قسم) کا تختہ زار ہوگا۔ میں کب مجنہ پانی دیکھوں گا جو آب حیات ہے اور کب میری نظر شامہ اور طفیل (پہاڑیاں ہیں) پر پڑے گی :-

مکتب کے فارسی پڑھنے والے بچے بھی حضرت شیخ سعدیؒ کے جذبات وطن پرستی سے آشنا ہیں جنھیں شیخ نے اپنے خاص ادبی رنگ میں گلستاں، بوستاں دونوں کتابوں کے اندر لکھا ہے، گلستاں کے دیباچہ کی پُرجوش دعائیہ ترانہ سنجی کسے یاد نہیں۔

یارب ز بادِ فتنہ نگہدار خاک پارس را | چندانکہ خاک را بود و باد را بقا

اور بوستاں کے دیباچہ کے اندر طوفان بیخودی میں شیراز کو تمام عالم پر سند تفوق عطا ہی کر دیا:-

در اقصائے عالم بگشتم بسے | بسر بردم ایام با ہر کسے

تمتع ز ہر گوشۂ یافتم | ز ہر خرمنے خوشۂ یافتم

اپنے اس سیاحانہ تجارب کے بعد فرماتے ہیں

چو پاکان شیراز خاکی نہاد نہ دیدم کہ رحمت بر اں خاک باد

خاقانی کا دفتر دیکھو اس میں بھی اس عنصر غیر فانی کی کار فرمائیاں نظر آرہی ہیں۔

مدینہ وہ مقام تھا جس کے لئے نبی صلعم نے دُعا کی تھی۔

اللھم حبب الینا المدینۃ کحبنا مکۃ او اشد اللھم صححھا و بارک

لنا فی مدھا و صاعھا و انقل حماھا فجعلھا بالجحفۃ

اے میرے اللہ، مدینہ کو ہم لوگوں کے لئے ایسا محبوب بنا دے جیسا کہ ہے یا اس

سے بھی زیادہ اے اللہ اس کی آب وہوا ہم لوگوں کے موافق بنا دے۔ اور

اس کے تول ناپ میں برکت عطا فرما، اور اس کا بخار جحفہ میں بھیج دے۔

مکہ فتح بھی ہو گیا پھر بھی آپ اپنے مقام ہجرت سے نہیں لوٹے۔ یہاں تک کہ آپ نے وہیں وفات بھی پائی صحابہ کرام کو یہ معلوم تھا۔ لیکن پھر بھی حبّ وطن کی کشش انہیں مکہ کی یاد دلاتی رہی، سعدی کا شیراز اور خاقانی کا شروان، خواہ اپنے دور کے قابل ناز بلاد اسلامیہ دمشق، قرطبہ، بغداد، اصفہان وغیرہ کے مقابل میں مرکز توجہ سے کتنی ہی دور کیوں نہ ہوں لیکن اتنا تو معلوم ہو ہی گیا کہ وطنیت کے جوش میں انسان کیا کچھ نہیں کہہ جاتا، دنیا کی نکتہ چین نگاہیں خواہ اسے جس نظر سے چاہیں دیکھیں لیکن حبّ وطن کا ایک با اخلاص جذبہ باوجود کوشش کے بھی دل وجگر میں پنہاں نہیں رکھا جا سکتا۔

شعرا و ادبا آرہ کے ذوق شاعری کی تاریخ حضرت صفیر بلگرامی مرحوم سے

شروع ہوتی ہے، آپ اپنے خاندانی لحاظ سے اپنے زمانہ کے بہت بڑے شاعر تھے، آپ کے تلامیذ میں مولوی محمد اسمٰعیل صاحب قہرؔ، مولوی سید امیر حسن صاحب بدرؔ، قاضی واجد حسین صاحب وجدؔ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، اور چونکہ یہ حضرات خاص ملکی محلہ (آرہ) کی خاک سے اُٹھے ہیں، اس لئے اثر وطن کے لحاظ سے اپنے دور کے بڑے باکمال شاعر ہوئے، جناب قہرؔ کو تو میں نے دیکھا نہیں، البتہ آپ کے بعض کارنامے میرے پیش نظر ہیں، جناب قہرؔ صرف ایک کہنہ مشق اور بلند پرواز شاعر ہی نہ تھے، بلکہ آپ نے ایک ایسا جدت طراز دماغ پایا تھا کہ اس میں لذت نظر، اور ذوق تماشا کے بہت سے سامان موجود تھے، آپ کا ایک باغ اب بھی موجود ہے، جو کبھی محمد شاہ رنگیلے کے طوفان نشاط کی یاد دلایا کرتا تھا، جناب قہرؔ کو شعر وسخن کے علاوہ طغرا بنانے میں بھی خاص کمال تھا، آپ کے ہاتھ کا طغرا میں نے دیکھا ہے جو ایک کاغذ پر قینچی سے تراش کر خط طغرا میں آیۃ الکرسی لکھا ہوا ہے۔

جناب قاضی واجد حسین صاحب وجدؔ اب دنیا میں نہیں آنکھیں ڈھونڈھتی ہیں لیکن نہیں پاتیں آپ کی وفات کے ساتھ ملکی محلہ کے قدیم بزرگوں کی بہت سی زندہ تمثالیں مٹ گئیں وہ مجھے بہت محبوب تھے۔ یہ اس لئے نہیں کہ میں جناب وجدؔ مرحوم کے کمالات باطن اور اثرات قدس کا معترف ہوں بلکہ جناب وجدؔ نہ ایک عبادت گزار زاہد تھے نہ صوفی منش بزرگ لیکن پھر بھی میرے دل سے کوئی پوچھے وجدؔ کیا تھے؟ تو میں مرحوم کو یاد کر کے جامیؔ کا یہ شعر پڑھ دوں گا۔

مدد فرما بخون اے دل چو در چشم نماند آبے
کہ خواہم امشب از ہجران یار خویشتن گریم

کسی زندہ شخص کی مدح گستری میں خواہ وہ کتنی ہی مخلصانہ پہلو کیوں نہ رکھتی ہو نفس کو صلہ احسنت و آفریں کی اُمید رہا کرتی ہے، وجدؔ اب دنیا میں نہیں کہ اپنے دستور کے مطابق "اچھے ہو نا بیٹا" کہہ کر دعائیں دیں گے لہٰذا آپ کے حالات کسی قدر تفصیل سے لکھے جائیں تو دلچسپی سے خالی نہیں۔

جناب وجدؔ ملکی محلہ (آرہ) کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے خاندان میں قاضی کا خطاب نسلاً بعد نسلٍ چلا آتا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے گھرانے کے بعض ارباب، سلاطین اسلام کے زمانہ میں عہدۂ قضا پر مامور تھے، وجدؔ مرحوم شعر و سخن، ذوق مجلس آرائی اور نشاط صحبت کا ایک خاص جذبہ رکھتے تھے، میں نے اُن کا عالم پیری دیکھا۔ لیکن اس وقت بھی اُن کی ذوق پسند طبیعت میں ایک ہیجان تھا وہ پیری اور ناتوانی میں بعض اوقات شباب کی یاد تازہ کر دیتے، طبیعت شاعری سے خاص مناسبت رکھتی تھی اُن کی جوانی تو میں نے دیکھی نہیں۔ لیکن قرائن بتاتے ہیں سید انشا مرحوم کی طرح جادۂ عیش و طرب کے رہرو ہو گئے۔ ذوق سماع نہایت اعلیٰ پایا تھا، اور بعض آلات موسیقی بھی نوازا کرتے، وہ امیر غریب، اپنے بیگانے، اعلیٰ ادنیٰ سب سے یکساں ملا کرتے، آپ کی ملاقات اور قوت خطابت کا بالکل جداگانہ انداز تھا۔ لہجۂ خطابت میں ایسی حلاوت تھی کہ مشکل سے کوئی دل غیر متاثر رہ سکتا تھا والد مرحوم کے زمانہ میں کبھی

کبھی غریب کدہ پر قدم رنجہ فرمایا کرتے خاکسار سے کوئی برادری نہ تھی لیکن آپ کی نظر کرم اور آپ کی نگاہِ شفقت نواز ایک سحر تھی، جس نے آج مجھے مجبور کیا کہ میں جذبات کے طوفان میں جناب وجدؔ مرحوم کی تصویر پیش کروں۔

وجدؔ مرحوم کی بڑی صفت یہ تھی کہ وہ خاک نشینوں کو سر چڑھایا کرتے تھے، غرور اور تکلف نام کو نہ تھا، ہمجولیوں میں بیٹھے تو ایک سنجیدہ بزرگ تھے، جوانوں میں بیٹھے تو انھیں کے مذاق کی سی باتیں، بچوں کی مجلس میں شرکت کی تو ترغیب و دلدہی کے ہزاروں ترانے سنا دیئے، سچ پوچھئے تو اب مجلس مشاعرہ میں وجدؔ کو دل ڈھونڈھتا ہے ایسے پُر جوش الفاظ میں داد دیتے کہ بچے اپنے دل میں ایک خاص سرور اور اُمنگ پاتے ایک مرتبہ کوئی لڑکا مجلس میں مرثیہ پڑھ رہا تھا جناب وجدؔ سامنے تشریف فرما تھے وہ دہرائے جاتے تھے، اتفاقاً ایک مصرعہ دُہرانے میں اس کے چند آخری الفاظ بھول گئے تو اضطراراً کہنے لگے، "ہاں، وہی، وہی" ہم لوگوں کو بے اختیار ہنسی آگئی مجھ سے جہاں ملاقات ہوتی بڑی محبت سے فرماتے، "بیٹا شعر نہیں کہتے، شعر کہا کرو"، محلہ کے بچوں، منظرؔ، محمودؔ، امیر سب میں انھیں نے شاعری کا ذوق پیدا کیا، بڑے بے تکلف تھے، بچے بھی بڑے شوق سے بے جھجھک ہو کر اصلاح کے لئے اپنا کلام لے جاتے، ابتداً مجھے بھی شاعری کا خبط سوار ہوا تھا تو ایک مرتبہ اُنھوں نے مجھے بھی اصلاح دی تھی، وجدؔ مرحوم بڑے نفس شناس بھی تھے۔ اُن کی اصلاح سے بچے کبھی بردا شتہ خاطر نہ ہوتے شاعری میں اصلاح دینا نہایت اہم کام ہے، نفسیات کا ماہر نہ ہونے کے باعث اکثر

اُستادوں نے اپنے لائق شاگردوں کو کھو دیا ہے۔

وجد مرحوم سانولے رنگ کے متوسط القامت شخص تھے، چہرہ کتابی تھا زلفیں رکھا کرتے، داڑھی زنخداں پر گھنی تھی، اور رخسار پر ویسی نہ تھی، پرانے وقت کے شرفا کی طرح بڑی مہری کا پائجامہ پہنا کرتے، جس میں اسی کپڑے کی ایک چوڑی مغزی ہوتی پیر ریں دہلی وال جوتا ہوتا عموماً قمیص یا کرتے پر کوٹ پہنا کرتے، پیر کی تکلیف سے آہستہ آہستہ چلا کرتے، آپ کے صاحبزادہ جناب محمد خالد صاحب شمیم ہیں، آپ کا کلام مجالس مشاعرہ میں میں نے سنا ہے، اچھی طبیعت پائی ہے، لیکن وجد کچھ اور ہستی تھے، جس کی نظیر اب اس خاک سے غالباً صدیوں نہیں پیدا ہو سکتی، وجد کی زندہ دلی، شیریں کلامی، حسن اخلاق میری آنکھوں تلے گھوم رہا ہے، آخر عمر میں اُنھوں نے آرہ بصد حسرت خیر باد کہا، اور بتیا کے مضافات میں وفات پائی، خدا بخشے اور ہمارے وطن کو توفیق دے کہ قاضی صاحب مرحوم کی طرح حسن خلق کی کیفیات مخلصانہ اپنے قلوب میں پیدا کریں، جس کی سحر طرازی صرف اقربا ہی تک محدود نہ رہے، بلکہ اسلام کی شیرازہ بندی اپنے بیگانہ کے امتیازات سے بالاتر ہے۔

علامہ ابن خلکان نے فن سیرت میں وفیات الاعیان ایک ضخیم کتاب ہی لکھی ہے، جو کئی جلدوں میں ہے اس میں جتنے بڑے بڑے علما کا تذکرہ کیا ہے، ان میں ایک خاص بات یہ پائی جاتی ہے کہ وہ کسی ایک صنف علم پر دستگاہ نہیں رکھتے تھے، بلکہ متعدد علوم کے حامل ہوا کرتے، جو ایک دینی عالم ہوتا وہ ایک زبردست

طبیب ہوتا وہ ایک فلسفی اور ایک شاعر، ایک ادیب اور ایک ماہرِ موسیقی بھی ہوا کرتا، ابن سینا، الفارابی، ابن زہر، ابن خلدون وغیرہ کے حالات زندگی میں یہی کلیہ نظر آتا ہے آرہ کے دور جدید کے لئے مولانا حکیم ضمیر الحق صاحب قیس کی زندگی بہت غنیمت ہے، آپ ایک بڑے عالم دین کے ساتھ ایک تجربہ کار طبیب بھی ہیں اور ایک کہنہ مشق شاعر بھی۔ آپ کا حلقہ مسترشدین گو چنداں وسیع نہیں چونکہ آپ ایک اہل حدیث عالم ہیں پھر بھی مغرب کے بعد آپ روزانہ قرآن و حدیث کا درس دیا کرتے ہیں چند روز خاکسار بھی اس حلقہ استرشاد میں شریک رہا ہے، مطب کی یہ شہرت ہے کہ دروازہ پر لوگوں کا ہجوم لگا رہتا ہے، آرہ کی خموش علمی زندگی کی یہ آخری شمع معلوم ہوتے ہیں خدا کرے آپ کا سایۂ نورانی ایک عرصہ تک رہے، خمخانہ کی تاریخ میں جو آپ نے اشعار کہے ہیں ان سے آپ کے ذوق شاعری اور بلند تخیل پر روشنی پڑتی ہے۔

سیّد ابن الحسن صاحب فکر دایم۔ اسے ا کا علمی کمال اور آپ کی اثر آفریں سیرت ملکی محلہ کے لئے مایۂ ناز ہے آپ اگر اس وقت دور جدید کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں تو ساتھ ہی بزرگوں کے کمالات بھی آپ میں موجود ہیں۔ آپ کی زندگی تفصیل کی محتاج ہے، اسلئے اس وقت مفصل نہیں لکھوں گا، مگر اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جناب فکر آرہ کی طرف سے دور جدید کے بڑے شعرا جناب اصغر و جگر کے مقابلہ میں پیش کئے جا سکتے ہیں، جناب فکر صرف یہی نہیں کہ ایک نازک خیال شاعر، اور نکتہ سنج سخن آفریں ہیں بلکہ آپ کو انشا پردازی میں بھی خاص کمال ہے، آپ حال میں دفتر "سادات" کے حلقہ ادارہ کو اپنے علمی کمالات

سے فیض پہونچا رہے تھے، نہایت شگفتہ صورت، عشرت پسند اور با اخلاق انسان ہیں مشاعرہ میں جب غزلیں پڑھتے ہیں تو ایک خاص ادا سے جس سے سامعین پہ ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

جناب بدر کے مختصر حالات زندگی

آپ کا اصل نام امیر حسن تخلص بدر والد کا نام سید محمد ہاشم ملکی محلہ (آرہ) کے ایک معزز سید خاندان میں پیدا ہوئے، یہیں تعلیم و تربیت پائی سید صفیر بلگرامی کے تلامیذ ارشد میں ہیں۔ آپ ہی سے کلام میں اصلاح لی، فارسی کے زبردست عالم اور ایک حد تک عربی سے بھی واقف ہیں آرہ میں ایک انگریزی درسگاہ کے اندر فارسی کے مدرس اعلیٰ ہیں، متوسط قامت، گورا رنگ، سفید گردوار ڈاڑھی، شیخ علی حزیں جیسے نازک مزاج لیکن درد دل سے خالی نہیں متدین، صوفی منش، ذکر و شغل سے لذت آشنا، اس وقت عمر پینسٹھ کے لگ بھگ ہوگی۔

محاسن کلام

مختلف شعرا کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک مبصر کلام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ ایک تو وہ جس میں ایک شاعر مناسبت اور نفاست بیان، نزاکت تخیل، حلاوت معنی، پرواز فکر رعایت لفظی، مجاز اور تشبیہات سے کام لیکر کچھ خیال ظاہر کرتا ہے، دوسرا وہ جو صحیفۂ فطرت کا ایک رمز شناس انسانی جذبات اور احساسات کا مطالعہ کرنے کے بعد "پیام" کی صورت میں پیش کرتا ہے، یورپ کی شاعری اور قدیم عربوں کا کلام اس طریق کی پیداوار ہے! ایک یورپی شاعر جس طرح قوم کو اخلاقی اور

صائب سے پہلے جامی کہہ گئے ہیں۔

بسکہ رفتند شہیدانِ غمت زیر زمیں　　　لالہ با غرقہ بہ خوں می دمد آں صحرا را

جامی سے پہلے حافظ نے کہا تھا۔

ز حسرت لبِ شیریں ہنوز مے بینم　　　کہ لالہ می دمد از خاکِ تربتِ فرہاد

متقدمین میں صائب کے خیال سے جناب بدر کا خیال بالکل ملتا ہوا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے. گویا ترجمہ ہو ایسا توارد خاطر، اور تمثل بیان دورِ جدید میں ایک اُردو کے شاعر کے یہاں پایا جانا قابلِ فخر ہے:

کبھی میں دیر میں پہونچا کبھی حرم میں گیا (بدر) تمہارے در پہ میں آیا کہاں کہاں ہو کر

اے بیخبراں پائے طلب رنجہ مسازید (حزیں) نزدیک تر از ماست زما مرحلۂ ما

مائیم و دیریم عرفی عشوۂ در کعبہ نیز (عرفی) مرتے پارہ بجہا از پردہ می انگیختم

نتیجہ کے اعتبار سے تینوں اشعار میں ایک ہی خیال پایا جاتا ہے، جناب بدر کو اعتراف ہے، کہ دردِ محبوب تھا تو پہلو میں لیکن مفت میں تمام زمانہ کی خاک چھان ڈالی، حزیں فرماتے ہیں کہ ہماری منزل ہماری ہستی سے بھی قریب ہے، اس لئے بادیہ پیمائی کی حاجت نہیں عرفی کا شعر تو جناب بدر سے بالکل مل گیا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فارسی نے اُردو کا جامہ پہن لیا ہے، جناب بدر کے لئے دل سے بے اختیار داد نکلتی ہے عرفی جیسے قادر الکلام شاعر کے خیال سے آپ کا کلام مل جاتا ہے۔

دلِ پُر داغ عاشق ہی کفِ رنگین جاناں میں (بدر) تماشہ ہی گلِ لالہ کھلا ہے شاخِ مرجاں میں

(حزیں)   ز تاراج بہاراں مست و رنگیں جلوہ می آئی

حنا نبود کہ جوشاں خون گلزاراست از دستت

محبوب کے دست حنائی کو دیکھ کر دونوں نے حکم لگایا ہے کہ یہ رنگ حنا نہیں ہے، بلکہ خون ہے، جناب بدرؔ نے اسے "دلِ پُر داغِ عاشق" بتایا ہے، حزیںؔ نے "خونِ گلزار" سے تعبیر کیا ہے۔

مر کے بھی وابستگی دامانِ جاناں سے رہی (بدر) خاک ہو جانے پہ بھی میں خاک دامنگیر ہوں

تنہا نہ منم خاکت کز خاک سر کویت   ہر گرد کہ برخیزد صاحب نظرے باشد (سلمان ساوجی)

مضمون میں کسی قدر اختلاف ضرور ہے، لیکن اصولی حیثیت سے دونوں کے یہاں ایک ہی خیال پایا جاتا ہے جناب بدرؔ فرماتے ہیں کہ مر مٹنے کے بعد بھی خاک بن کر دامنِ یار سے لپٹا ہوں، سلمان ساوجی کہتے ہیں، کہ محبوب کے در پہ میں ہی خاک نہیں ہوا ہوں بلکہ یہاں سے جو ذرہ اٹھتا ہے وہ کسی عاشق کی نگاہ کا ایک جزء ہے، یعنی اس قدر کثرت سے عشاق نے جان دی ہے، کوئے جاناں میں خاک ہونے اور فنا ہونے کے بعد بھی "موجود" اور "دامنگیر" ہونے میں دونوں برابر ہیں،

شمع ایمن کی تجلی ہے لحد کے اندر (بدر) جلوہ گر ہے جو سرِ گورِ غریباں کوئی

تجلی زار می بینم سرِ گورِ غریباں را (حزیں) مگر شمعے بہ طوفِ مشہدِ پروانہ می آید

جناب بدرؔ کے یہاں حزیںؔ سے بھی بڑھا ہوا استعارہ ہے۔ حزیںؔ نے تو اس تجلی زار بنانے والے محبوب کو شمع اور جناب بدرؔ نے اسے "کوئی" کہہ کے اس تجلی کو موسیٰ

کے وادی ایمن اور بقعۂ مبارکہ کی تجلی بنا دی تو اردسے انکار نہیں ہو سکتا۔

چمن زار جہاں میں طائر سدرہ نشیمن ہوں (بدر) میں کھا سکتا نہیں ہرگز فریب دام اور دانہ

تو مرغ عالم قدسی ندیم مجلس انسی (رومی) دریغ باشد اگر تو دریں مقام بمانی

کسی قدر اختلاف کے ساتھ ایک خیال ہے۔

نہیں کم حرص ہوتی ہے سبو و شیشۂ مے کی (بدر) ڈبو دے خم میں ساقی آج بدر بادہ پیما کو

لب مخمور مرا جرعہ نہ بند د ساقی (حزیں) چوں رسد دور بہ من میکدہ بردار بیار

دونوں کے یہاں ایک ہی جذبۂ مے آشامی ہے۔ اور ایک ہی ہوس بادہ پیمائی ہو

یہاں تک جستجو کی جھک گئی اپنی کمر آخر (بدر) ڈ پانا تھا نہ پایا آج تک عمر گریزاں کو

تا وادی شیبم ز کجا سر بدر آرد (حزیں) طے کردہ ام از کوچہ تن تیچ و خمے چند

بہت عمدہ توارد خاطر ہے، کسی قدر اختلاف ضرور ہے۔ لیکن صحیفہ فطرت کے درس

عبرت سے دونوں نے یکساں نتائج پیدا کئے ہیں جناب بدر فرماتے ہیں عمر گریزاں کو

ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے کمر جھک گئی بوڑھے ہو گئے۔ لیکن نہ پا سکے۔ حزیں فرماتے ہیں

کہ اس خوف سے کہ نہ معلوم کہ کہاں پیری و ناتوانی کا وادی پُر خطر نظر آئے۔ میں نے پیچدار

کوچہ سے گزرنا شروع کیا، اور یہ جھکی ہوئی کمر گویا وہی ،، کوچۂ تن ،، کے پیچ و خمے چند ،، کی

طے منزل ہے، استنباط نتیجہ میں دونوں برابر ہیں۔

لائے مے سے شیخ صاحب کی مرمت کیجئے (بدر) کہنہ یہ دیوار ہے ٹھیر ےگی بے کہگل نہیں

خمیر مایہ آسائشیست لائی شراب (عُرفی) بگو کہ صاف کشاں جرعۂ زتہ گیرند

بظاہر مضمون مختلف معلوم ہوتا ہے، لیکن "دُردمے" کی تاثیر بیان کرنے میں دونوں برابر ہیں، جناب بدر کے یہاں مجازی رنگ کو بعد معلوم ہوتا ہے۔ لیکن پُر لطف ضرور ہے جناب موصوف نے شیخ صاحب کی اچھی مرمت کی ہے عرفی نے سادہ سادہ الفاظ میں "لائے شراب" کی خوبی بیان کر دی ہے، توارد خاطر سے انکار نہیں ہو سکتا

(بدر) مرا گھُٹ گھُٹ کے یں عشق لب لعلین جاناں میں
مری قسمت مجھے لے ڈوبی آخر آب حیواں میں

فریب حرف وصورت خضر را ز جا برمی آرد (حزیں) کہ آب زندگی لعل تر از یر نگیں باشد

لب لعلین جاناں کو آب حیواں سے تعبیر کرنے میں دونوں برابر ہیں البتہ اسلوب بیان جُدا گانہ ہے۔ جناب بدر نے اس خیال پر ایک مزید اضافہ یہ کیا ہے کہ اُنھوں نے اپنی ہستی کو اس آب حیواں میں غرق بھی کر دیا، لفظ "گھُٹ گھُٹ" کے اضافہ سے خیال میں اور بھی نزاکت پیدا ہو گئی ہے۔ محبوب کے لب لعلین میں چشمۂ آب حیواں کی طرح ظاہری سیلانی آب تو ہے نہیں کہ طالب ایک مرتبہ غرق ہو جائے بلکہ وہ گھُٹ گھُٹ کر جان دے رہا ہے

ترا روئے عرق آلودہ لے گُل دیکھ کر بھی (بدر) پڑی شبنم کے قطرے ہیں جبین صحن گلشن پر

آلودہ قطرات عرق دیکھ جبیں کو (سودا) اختر پڑے جھانکے ہیں فلک پر سے زمیں کو

جبین معشوق کو عرق آلودہ دیکھ کر دونوں نے اپنی اپنی وسعت فکر او رپرواز خیال کے مطابق دو مثالیں دی ہیں سودا کا شعر بڑھا ہوا ضرور ہے، لیکن جناب بدر نے بھی ایک لطیف خیال کا اظہار کیا ہے۔ توارد سے انکار نہیں ہو سکتا، اسی معنی میں لیکن بہت

حزیں کا یہ شعر ہے۔

نگاہ گرم چوں رخسار نازنیں بوسد — عرق چو شبنم گستاخ یاسمیں تو بوسد

حشر برپا ہے تری محشر خرامی سے ابھی (بدر) اور کیا ہوگی قیامت جسکا میں قائل نہیں

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے (غالب) کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

مفصلہ بالا موازنہ سے یہ بات ایک حد تک ثابت ہو گئی ہے کہ جناب بدر ہمارے دور میں اُردو کے ایک نازک خیال اور کامل الفن شاعر ہیں. جن کے خیالات فارس کے بہتیرے اساتذہ سے مل جاتے ہیں۔

جذبات بدر

اس میں شک نہیں کہ جناب بدر کے یہاں سودا کی طرح شگفتگی بیان، رعایت الفاظ اور خوبی زبان ہے۔ غالب اور میر کی طرح پیام کی شاعری نہیں، لیکن ایسا نہیں کہ آپنے اس رنگ میں کچھ کہا ہی نہیں، جس غزل میں آپ نے ادائیگی جذبات کی کوشش کی ہے، وہ اس قدر بلند سطح پر پہونچ گئی ہے کہ معمولی الفاظ میں آپ کی لطافت احساس اور باریکی نظر کی تعریف نہیں ہو سکتی؛

اجل کا ہوں نہ شرمندہ نہ ممنوں مسیحا ہوں — شب تنہائی فرقت میں میں مر مر کے جیتا ہوں
وفور بیخودی میں بھی میں وہ محو تجلی ہوں — کہ بنکر آئینہ ہر وقت منہ اُس بت کا تکتا ہوں
وفور بیخودی سے چپ ہوں منہ اک اک کا تکتا ہوں — سراپا محو انداز بت آئینہ سیما ہوں
قیامت چھیڑنا میرا ہے ملے باد سحر گاہی — کسی محشر خرام شوخ کا نقش کف پا ہوں
تری چشم غزالی کا ہے سودا سر میں جس دن سے — پریشاں صورت گرد رم آہوئے صحرا ہوں

نہ پوچھو صورت غربال ہے کیوں دل جگر میرا — کسی تیر نگاہِ سحر ساماں کا نشانہ ہوں
میں وہ ہوں آزردہ دل بھی خبر رکھتا نہیں جس کی — نہیں گوش آشنا جس سے میں وہ حرفِ تمنا ہوں

فارسی ترکیب نازک خیالات دلکش فقرے ابھرے جذبات سبھوں نے مل کر کلام کو اس بلند سطح پر پہونچا دیا ہے جو میر اور غالب کے تخیلات کا مخصوص نشیمن ہے۔

یہ جوشِ شوقِ عریانی یہ ضعفِ پنجۂ وحشت — رگ گردن خفا ہے حلقۂ تنگ گریباں میں
سلامت دستِ وحشت ہی اگر اے شوقِ عریانی — نہیں ممکن کبھی پیوند دامان و گریباں میں

خمریات بدر

عربی شعرا میں اخطل، فارسی میں حافظ اور خیام نے جس حسن ادا سے شراب کی تعریف کی ہے، وہ اُن کا مخصوص حصہ ہے، اُردو میں مرزا غالب نے اس صنف سخن کو بہت ترقی دی اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ حافظ اور خیام کی طرح غالب بھی بادہ نوشی کے عادی تھے، نشہ میں انسان کا طائر خیال سدرہ نشین ہو جاتا ہے، اور اس وقت زبان سے ایسے ایسے رموز ہستی کا انکشاف ہونے لگتا ہے کہ ایک ناقد مطالعہ کرنے کے بعد مجبور ہو جاتا ہے کہ ان خیالات کو ملہات صوفیانہ کی طرف منسوب کر دے، جناب بدر کے "خمخانہ" میں اگر "موج مے" نہ ہوتا تو یقیناً نام کا عدم مناسبت ارباب نظر کو افسردہ بنا دیتا، حافظ اور غالب کے نکات بادہ پیمائی اپنی جگہ بے نظیر ہیں لیکن بدر نے جس لطیف اسلوب بیان جس دلکش حسن ادا، اور پرجوش ترنم جذبات میں خمریات پر طبع آزمائی کی ہے اس کی نظیر کم از کم میری نظر سے نہیں گزری ہی نہیں، کہ میں نے ایسے خیالات اساتذۂ اردو کے کلام میں نہیں دیکھے۔ بلکہ ایسی ولولہ انگیز ترانہ سنجیاں شعرائے فارس کے کلام میں بھی نہیں

پائی جاتیں، جناب شفق عماد پوری نے طبع دیوان (خمخانہ) کی تاریخ میں جو اشعار کہتے ہیں
ان میں ایک جگہ جناب بدر کی اس غزل کی طرف اشارہ کیا ہے، فرماتے ہیں۔

کیوں نہ ہو پھر ترجمانِ میکشاں دیوانِ بدر
اس کی ہر ہر بیت ہے گویا بیانِ "موجِ مے"

ملاحظہ ہو ؎

منزلیں طے کر رہا ہے کاروانِ موجِ مے
گاہ خم میں گہ سبو میں شیشہ و ساغر میں گہ

کس لطف سے مجلس بادہ نوشی کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔

کہکشاں پر مجھ کو ہوتا ہے گمانِ موجِ مے
آسماں خم، مے شفق، ساغر مہ و خورشید ہیں

نفسیات کا مسئلہ ہے کہ انسان کے نفس پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے، وہی اسے
کائنات کے ہر ذرہ میں نمایاں معلوم ہوتی ہے، عرفی فرماتے ہیں۔

امشب کہ در بغل ننہادیم شیشہ را
عرفی ببیں فسردگی گشت ماہتاب

جناب بدر کے کلام میں بھی یہی جذبہ کارفرما ہے، فرق یہ ہے کہ عرفی کو آج کی
رات شراب نہ ملی اس لئے وہ چاندنی میں بھی افسردگی محسوس کر رہے ہیں، جناب بدر
کی بیتابی جذبات کا کیا کہنا، آپ اس قدر سرشار ہیں کہ پورا آسمان ہی آپ کو میکدہ نظر
آتا ہے، غضب کا زور بیان ہے، ولولہ قابل ستائش ہے، اس رنگ میں غالب نے
بھی کہا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا موجِ شراب
چار موج اٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو

غالب نے اپنی لذت اندوزی طرب کو صرف آسمان ہی تک محدود نہیں رکھا

بلکہ تمام کائنات میں آپ کو ایک روحِ نشاط نظر آرہی ہے جناب بدر کی تشبیہات قابلِ داد ہیں۔

بوسے کیا کیا میں لب ساغر کے لیتا جھوم کر   لب بہ لب مجھ سے اگر ہوتی زبانِ موجِ مے

انداز شوق اور مستی ہر لفظ سے ٹپک رہی ہے، معلوم ہوتا ہے جناب بدر کے سامنے "موج مے" کا وہی سماں ہے جیسے ایک دیوانۂ شباب کے سامنے "عروس شبِ اوّل" کا جلوۂ بیتاب۔

پھول نرگس کے کھلے ہیں چشمۂ خورشید میں   عکس چشم مستِ ساقی ہے میانِ موجِ مے

غضب کی تشبیہ ہے، تخیّل کی پرداز قابل داد ہے، شراب سے بھرا ہوا پیالہ ہے، ساقی "بانگ نوشا نوش" دے رہا ہے، اور اُس کی آنکھوں کا عکس شراب میں موجود ہے، جناب بدر اُسے پیالہ شراب میں ساقی کی آنکھیں نہیں بتاتے، بلکہ چشمۂ خورشید میں گلِ نرگس پھولا ہوا بتاتے ہیں۔

اسی معنی میں حضرت جامی نے بھی فرمایا ہے ؎

شد در قدح صہبا عکسے ز رخت پیدا   قد اشرقت الدنیا من کاس حمیرانا

لے اُڑی رندوں کو ساقی کیا ہوا برسات کی   کشتیٔ مے پر لگا جب بادبانِ موجِ مے

برسات کا موسم ہے دور پر دور چل رہا ہے، گویا شراب ایک کشتی ہے جس پر "موج مے" یعنی "من قدح نوش دمغان بانگ زنان نوشا نوش" کا بادبان ہے (کشتی کو تیز چلنے کے لئے ایک کپڑا لگا دیتے ہیں اسی کو بادبان کہتے ہیں) اب رندوں کی

پرواز کا کیا کہنا غالب کہتے ہیں۔

پوچھ مت وجہ سیہ مستی ارباب چمن سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موج شراب

بزم جاناں صحن گلشن، میکدہ رندوں کا گھر طول سے ہے طول سیر کاروانِ موج نے

کہاں کہاں شراب نوشی ہوتی ہے، جناب بدر اس کی ترجمانی فرماتے ہیں۔

آپ کی اس غزل میں ستر اسی اشعار پائے جاتے ہیں، اور ہر شعر لطفِ جذبات کا ترجمان ہے۔

جناب بدر کے محاسن افکار ملاحظہ ہوں۔

رعایت لفظی

ہماری خاک کی پامال کس خورشید طلعت نے کہ ہر ذرہ ہے تاباں اختر چرخ بریں ہوکر

چڑھایا سر تو ہے تم نے مگر اک دن ستائیں گے یہ کالے کالے موئے زلف مار آستیں ہوکر

کس درجہ طول ہے شب تارِ فراقِ یار شاید ہے اُس کو زلف شکن در شکن سے ربط

شوخی کلام

کبھی تو حضرتِ واعظ اٹھاؤ لطفِ بہشت شریک صحبت یارانِ میکشاں ہوکر

مہ صیام میں یہ اعتکاف اور رندی خدا کے گھر میں رہوں بھوکا میہماں ہوکر

مجاز و تشبیہات

ہے خیالِ صیدِ مرغِ دل بوقتِ خواب بھی — وہ بچھا کر سو رہے ہیں دامِ گیسو زیرِ سر

تبسم زیرِ لب ہے زلف بکھری ہے جو عارض پر — گھٹا چھائی حلب پر بجلیاں کوندیں بدخشاں میں

سلاستِ بیاں

تم پہ میں مر رہا ہوں مرنے دو — کام کرنے کا ہے یہ کرنے دو
ان کو اے ہم نشیں سنورنے دو — کوئی مرتا جو ہے تو مرنے دو
ناروا ظلم ان کو کرنے دو — خونِ ناحق میں ہاتھ بھرنے دو
خون بولے گا سر پہ چڑھ کے وہاں — قتل کر کے یہاں مکرنے دو
چھینٹے کوثر کے واعظو دینا — ابھی شیشہ میں تو اترنے دو

مذہبی جذبات

دکھلا دے مدینہ مجھے مولائے مدینہ — مضطر ہوں بہت اے شہِ والائے مدینہ
ہیں شیفتۂ چشمِ کحل کا نبیؐ کی — آنکھیں ہیں مری نرگسِ شہلائے مدینہ
دکھلائے اگر زورِ نظر چشمِ تصور — آجائے نظر گنبدِ خضرائے مدینہ
فردوس میں مرتے ہی جو داخل ہوں عجب کیا — دل میں دمِ رحلت ہے تمنائے مدینہ
مژگاں کی طرح آنکھوں پہ اپنی میں جگہ دوں — ہاتھ آئیں جو خارِ رہِ صحرائے مدینہ
وابستۂ گیسوئے رسولِ عربی ہوں — ہے سر میں ازل سے مرے سودائے مدینہ

میں طوف کروں روضۂ اقدس کا بصد شوق — بلوائے مجھے اے مرے مولائے مدینہ
تڑپائیگی جنت میں مجھے صورتِ بسمل — نکلی نہ اگر دل سے تمنائے مدینہ
روشن ہوئی اے بدر مری چشم بصیرت — سرمہ ہوئی خاکِ رہ صحرائے مدینہ

تلمیح

بڑھادی پرسشِ حالِ عصا پر گفتگو کتنی — شرف حاصل ہوا جب ہم سخن ہونیکا موسیٰ کو

یہ قرآن کی آیت کی طرف اشارہ ہے اللہ تعالیٰ نے تو صرف اتنا ہی خطاب کیا تھا وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَا مُوسَىٰ (اے موسیٰ! تمہارے ہاتھ میں یہ کیا ہے؟) اس پر حضرت موسیٰ فرماتے ہیں هِيَ عَصَايَ یہ میری لاٹھی ہے۔ لیکن یہیں تک کہہ کے چپ نہ رہے بلکہ فرمانے لگے اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ اُخْرٰى (میں اس پر سہارا لگاتا ہوں، اور اس سے اپنی بکریوں کے لئے پتّے جھاڑتا ہوں اور اس سے اور بھی کام لیتا ہوں)

تاریخ و اساطیر

عہدِ ظفر کے تاریخی و سیاسی حالات

ملتوں کے بننے بگڑنے میں، قوموں کے عروج و زوال میں، قدما کے شاندار اور پُر جلال طرزِ تمدن میں، ان کے دلکش اور دلفریب اصولِ تہذیب میں، ان کے اختلالِ مملکت، اور اضمحلالِ قیادت میں ایک محو نظارہ کے لئے جو سامانِ بصیرت نظر آتا ہے اہلِ نظر سے مخفی نہیں، مطالعۂ فطرت کے یہ تاثرات انسان کے ذوقِ ادب میں کارفرما نظر آتے ہیں: تاریخ، آثار، تصوف، شاعری اسی انقلابِ ہستی کی مختلف علمی تعبیرات ہیں ایک مورخ اُٹھا، اُس نے قوم میں جذباتِ عمل، اور شورشِ اقتدار پیدا کر دی، ان کی تعمیر عادات، اُن کی تنظیمِ جماعت ان کی سیاستِ مدن، الغرض ان کے تمام شعباتِ معاشرت کے لئے کاشانۂ ہستی اور طلسمِ وجود سے منتشر واقعات چن کر، اثر آفرینی کا ایک ایسا مادہ جمع کر دیا جسے آج "تاریخ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اسی طرح ہیئتِ اجتماعیہ کے بعض افراد نے اس ہنگامۂ عمل کے آخری نتیجہ پر غور کیا، اُنھوں نے مصر کے قدیم آثار، یونان اور روما کے مٹے ہوئے تمدن، فارس اور عرب کی قومی یادگار، ہندستان اور چین کے دفائن ارضی کا پُر حسرت نظارہ کیا، ان کے قلوب پر ہنگامۂ ترقی، تمنائے حکومت، اور اُن کے وجدان میں احساساتِ مادہ نوازی اور طلبِ جاہ کی بجائے

دوسری کیفیات پیدا ہوئیں جنھیں مبادی تصوف اور لوازم شاعری سے تعبیر کرسکتے ہیں، آثار قدیمہ کا یہی عبرت آموز نظارہ تھا، جس نے گوتم اور ادھم سے تخت چھڑایا، جس نے رومی اور سنائی پیدا کئے، جس نے ڈینٹے اور ایمرسن کی گفتار میں خلش پیدا کی، اسمیں شک نہیں کہ شعرا کی زندگی کا ابتدائی زینہ اکثر اس مطالعہ کے اولین حصہ سے متعلق رہا ہے، لیکن شاعری جب "فارا الا الاٰیة الکبریٰ" اور "بنطش البطشة الکبریٰ" کے مناظر سے متحسس ہوئی تو احساسات نے کروٹ لی، اور ذاق کا دوسرا مرکز مقرر ہوا تاریخ بتاتی ہے، شعروسخن کا آخری نتیجہ ذوق تصوف ہے اور یہ کلیہ ہم رومی اور عطار کی حلاوت زندگی، خاقانی اور خسرو کے رشحات درد، نظیری اور ظہوری کے ترک تلذذ میں پاتے ہیں، مشاہدات زندگی، اور تجارب انقلاب کی اسی منزل پر پہنچکر رومی نے کہا ہے

دیدیم کہ بر کنگرہ اش فاختۂ   بنشستہ ہمی گفت کہ کو، کو، کو

دہر کی اس پُر ملال بوقلمونی، اور دایۂ فطرت کی اس ستم ظریفی سے قلوب پر جو اثر پڑتا تھا، وہ صوفی ادبیات، یا زوال دولت کی تاریخی موشگافیوں، اور کھنڈر اور ماثر کی دلکش نقش آرائیوں میں ملے گا، جن کا کافی ذخیرہ گبن کی درد انگیز سحر کلامی، اور خاقانی کے نگار خانۂ بیان میں پایا جاتا ہے، خاقانی مداین کے سر بہ فلک عمارات کے کھنڈروں میں پہونچتا ہے، عہد اکاسرہ کی مٹی ہوئی عظمت ان کا جاہ و جلال، ان کی شان وشکوہ، ان کا رعب و دبدبہ اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، وہ عہد ماضی کے اس دور سطوت و حکمرانی کا ایک نہایت دلفریب نقشہ پیش کرتا ہے اور اس کے بعد

اس وحشت آباد مقام، اور درد پیدا کرنے والے ویرانہ کے نقوش دکھاتا ہے دفعتہً قلب میں ہیجان پیدا ہونے لگتا ہے، دل ہیں ٹیس اٹھتی ہے، اور بے اختیار تیرہ سو سال پیشتر کے ایک انسان کے الہامی جذبات کی تصویر نظر کے سامنے کھنچ جاتی ہے وکم اھلکنا قبلھم من قرنٍ ھم احسن اثاثاً ورءیاً ہ قل من کان فی الضلالۃ فلیمدد لہ الرحمٰن مدا۔ حتی اذا راوما یوعدون اما العذاب واما الساعۃ فسیعلمون من ھو شرٌ مکاناً واضعف جندا[1] (اور ہم نے ان سے پہلے ایسے لوگ ہلاک کئے جو سامان اور نمود میں ان سے بھی اچھے تھے، آپ فرما دیجئے جو لوگ گمراہی میں ہیں اللہ تعالیٰ ان کو ڈھیل دیتا چلا جا رہا ہے، یہاں تک کہ جس چیز کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے اس کو دیکھ لیں گے خواہ عذاب کو خواہ قیامت کو، سو ان کو معلوم ہو جائے گا کہ برا امکان کس کا ہے اور کمزور مددگار کس کے ہیں۔)

خاقانی نے مدائن کے کھنڈر کی جو تصویر کھینچی ہے، وہ گویا قرآن کے اسی آیت کی شرح ہے، فرماتے ہیں[2]۔

ہاں ایدلِ عبرت بیں از دیدہ نظر کن ہاں ایوان مدائن را آئینۂ عبرت داں
یک رہ ز لب دجلہ منزل بہ مدائن کن از دیدہ دوم دجلہ بر خاک مدائن راں

---

[1] قرآن مجید میں اکثر اس مضمون کی آیتیں پائی جاتی ہیں، زخرف، قصص، احقاف، قاف وغیرہ میں یہ اشارے موجود ہیں۔

[2] خاقانی کا یہ قصیدہ اس قدر مشہور ہے کہ ایک انگریز مستشرق نے اس کا ترجمہ مع شرح شائع کیا۔

خود دجلہ چناں گرید صد دجلۂ خوں گوئی — کز گرمی خوں نابش آتش چکد از مژگاں

بینی کہ لب دجلہ کف چوں بدہان آرد — گوئی ز تف آہش لب آبلہ زد چنداں

شاعر دریائے دجلہ کے کنارے کھڑا ہے، اُس کے ایک طرف عہدِ اکاسرہ کی یادگاروں کا سلسلہ ہے، اُسے دیکھ کر شاعر کے دل میں ایک التہاب درد پیدا ہوتا ہے ایک شعلۂ الم بھڑک اُٹھتا ہے، اُسے اپنے تمام جذبات لطیف خود دریائے دجلہ میں نظر آنے لگتے ہیں، وہ دجلہ کے تموج اور تھپیڑوں میں حباب کی سرافرازیوں کو دیکھ کر کہتا ہے کہ موج دریا آہ ہے جس کی گرمی سے جسم دریا پر پھپھولے رونما ہیں، اور یہ حباب کی شکل میں سطح دریا پر نظر آ رہے ہیں۔

گہ گہ بہ زبان اشک آواز دہ ایوان را — تا بو کہ بہ گوش دل پاسخ شنوی ز ایواں

دندانۂ ہر قصرے پندے دہدت نو نو — پند سر دندانہ بشنو ز بن دنداں

گوید کہ تو از خاکی ما خاک توایم اکنون — گامے دو سہ بر ما نہ اشکے دو سہ ہم بفشاں

از نوحۂ چغد الحق مائیم بہ دردِ سر — از دیدہ گلابی کن دردِ سرِ ما بنشاں

آری چہ عجب داری کاندر چمن گیتی — چغد است پے بلبل نوحہ است پے الحاں

اس کے بعد شاعر کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں وہ ایک والہانہ انداز میں ٹوٹے ہوئے محلوں سے اس تباہی و بربادی کا راز دریافت کرتا ہے اور عالمِ بیخودی میں اسے دندانۂ قصر سے جواب بھی مل رہا ہے کہ آؤ تم بھی ایک پتلۂ خاک ہو، میں بھی تمہاری ہستی کا ڈھیر ہوں، ہماری تمہاری خلقت ایک ہے، مجھ پر دو ایک قدم چلو، چند قطرے آنسو بہا لو، دوسری طرف سے

شاعر کے کان میں اُلو کی وحشت ناک آوازیں آرہی ہیں اس سے سر میں درد ہو گیا ہے، اور اب وہ طالب ہے کہ گلاب نہیں بلکہ آنسوؤں سے میرے اس درد کا علاج کرو یعنی وہ دوسرے افراد کو بھی اپنا شریک ماتم بنانا چاہتا ہے، اس کے بعد رنگینی دہر کا ایک کلیہ پیش کرتا ہے کہ دنیا میں ہر بلبل کی آواز کے بعد الّو کی منحوس صدائیں سنی جاتی ہیں اور ہر نغمۂ نشاط کے بعد نوحہ مستلزم ہے۔

این ہست ہماں ایوان کز نقش رخ مردم | خاک درِ او بودے دیوار نگارستان
این ہست ہماں درگہ کو را ز شہاں بودے | دیلم ملک بابل، ہندو شہ ترکستان
پندار ہماں عہد است از دیدۂ فکرت بیں | در سلسلۂ درگہ در کوکبۂ میدان

یہ وہی محل ہے جہاں خدم و حشم تھا، جہاں کی خاک نگارخانہ چین کی دیوار تھی، یہ وہی دربار ہے، جہاں دیلم، بابل ہند اور ترکستان کے حکمراں جذبۂ نیایش لے کر آتے اگر غور سے دیکھا جائے تو عہد ماضی کا وہ جبروت آج بھی در و دیوار سے ظاہر ہو رہا ہے آثار قدیمہ کے اس مطالعہ سے خاقانی اس نتیجہ پر پہونچے ہیں

امروز گر از سلطان رندے طلبد توشہ | فردا ز در رندے توشہ طلبد سلطان
ہر کس برد از طیبہ سبحہ "ز گل حمزہ" | پس تو ز مداین بر تسبیح "گل سلمان"

دنیا میں یہی ہوتا چلا آیا ہے کہ آج اگر کوئی شخص بھکاری بن کر بادشاہ کے دروازہ پر صدا لگا رہا ہے تو کل بادشاہ اس مفلس و قلاش کے دروازہ پر دریوزہ گری کے لئے آتا ہے، اس کے بعد فرماتے ہیں کہ مکہ سے تو سب لوگ "سبحہ گل حمزہ" لے جاتے ہیں مجھے مدائن

"گل سلمان" کی تسبیح لانی چاہیئے۔

دنیا کی ہر قومی ترقی کا ایک دور ہوتا ہے، اور اگر میں تاریخ و آثار کے بیشمار واقعات کی بنا پر دعویٰ کروں تو بیجا نہیں کہ اُمتوں کی ترقی کے لئے فطرت خود اسباب مہیا کرتی ہے اور جب اُن کی بربادی کا زمانہ آتا ہے، تو کوئی تدبیر کوئی حکمت عملی کارگر نہیں ہوتی، جنھوں نے تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا ہے انھیں اس سے انکار نہیں ہو سکتا، کہ خاندانوں کے اسباب عروج وزوال میں باوجود کاوش بھی اس کا پتہ لگانا مشکل ہے کہ کسی خاندان کی سیاسیات ایک وقت حوادث زمانہ کے سیلاب سے کیوں محفوظ رہ جاتی ہے، اور دوسرے وقت وہی اسباب سیاسی خطرات کیوں پیدا کر دیتے ہیں؟ ایک غلام اور ایک آشفتہ حال فرد بادشاہ ہوتا ہے، اور شاہی خاندان کا ایک معزز انسان دربدر کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے یا اپنے گلوئے ناز پروردہ کو تشنگی شمشیر کے لئے وقف کر دیتا ہے، عہد اموی و عباسی کی مطول داستان جلالت و نکبت کو جانے دیجئے، صفویہ اور قاچاریہ، فاطمیہ اور سلجوقیوں کے سیاسی انقلاب کو چھوڑیئے، برامکہ کی ترقی، اور ہندوستان کے غلام، خلجی، تغلق، سید لودھی، سور خاندانوں کو درگزر کیجئے، صرف دکن کی محدود سرزمین کے مختلف شاہی خاندانوں کے اسباب ترقی و تنزل پر غور کیجئے، خاندان بہمنیہ اور عادلشاہیہ کے آشفتہ حال بانیوں کے حالات زندگی پڑھیئے نظام الملک بحری اور فاروقی شاہیہ کے بانی ملک راجہ کی زندگی کا مطالعہ کیجئے[1]

[1] فرشتہ، بساتین السلاطین، منتخب التواریخ، اور تاریخ قطب شاہیہ وغیرہ میں بتفصیل یہ حالات موجود ہیں ان خاندانوں کے بانی اور ان کے نسب حسب کے متعلق ایک کتاب میرے زیر تصنیف ہے

آپ کو معلوم ہو جاویگا کہ طلسم کائنات کی ان بوالعجبیوں کو سمجھنا مشکل ہے، اور عجز کے ساتھ صرف یہی اقرار کرنا پڑے گا کہ حقیقتاً فطرت کا بانی کسی شے کو ہمیشہ ایک حالت پر رکھنا نہیں چاہتا، ہر شاہی خاندان کا وجود ایک بچہ کی ولادت ہے، اور اس کے لئے جتنے مراحل ارتقا طے کرنا ہیں ان سے گزرنے کے بعد یقیناً ایک وقت معین پر باوجود سامان ارتقا رباوجود اسباب علو، نکبت کا ہجوم اور بدبختی کا سیلاب ضروری ہے، جس طرح ضعف پیری میں عمدہ سے عمدہ تدابیر بھی ایام جوانی کی معمولی تدبیر کے برابر بھی اپنا اثر ظاہر نہیں کرتیں، اسی طرح قوموں اور ملتوں، خاندانوں اور افراد کے ارتقا کی ایک محدود منزل ہے، جہاں انہیں اپنی ترقی کا آخری سفر ختم کرکے فنا ہونا پڑتا ہے، اکاسرہ کی تباہی کا زمانہ آیا تو یزدجرد جیسے بیدار مغز بادشاہ کی ایک نہ چلی۔ امویہ کی پستی کا دور آیا تو مروان الحمار جیسے زبردست سلطان سے بھی کچھ بنائے نہ بن پڑا، لودیوں کے خراب دن آئے تو ابراہیم میدانِ جنگ میں مارا گیا۔

مغل خاندان حوادث روزگار کی اس زد سے کیونکر محفوظ رہ سکتا تھا، جلوس بابری ۹۳۲ھ سے ابوالمظفر سراج الدین بہادر شاہ کے وقت جلوس ۱۲۵۳ھ تک تین صدی سے زیادہ زمانہ گزر گیا تھا، خاندان مغلیہ وہ تمام خدم وحشم تزک وتجمل، جبر وقہر، قبضہ واختیار، نعایم ولذائذ حاصل کرچکا تھا جو دنیا کے ایک بڑے سے بڑے خاندان کے لئے ضروری ہیں آخرکار ان کے عادات واطوار، ان کے اخلاق وذہنیت میں انقلاب ہونا تھا، ہوا، اور جس طرح انھوں نے لودیوں کو بے خانماں کیا تھا، اسی طرح خود بھی

بے خاناں ہوئے، وَکَاَیِّنۡ مِّنۡ قَرۡیَۃٍ ہِیَ اَشَدُّ قُوَّۃً مِّنۡ قَرۡیَتِکَ الَّتِیۡۤ اَخۡرَجَتۡکَ ۚ اَہۡلَکۡنٰہُمۡ فَلَا نَاصِرَ لَہُمۡ (اور بہت سی بستیاں ایسی تھیں جو قوت میں آپ کی اس بستی سے بڑھی ہوئی تھیں جس کے رہنے والوں نے آپ کو گھر سے بے گھر کر دیا کہ ہم نے ان کو ہلاک کر دیا، سو ان کا کوئی مددگار نہ ہوا۔)

ایک با اقتدار خاندان کی ظل عاطفت میں، قدرت دوسرے خاندان کی ترقی کے جو اسباب مہیا کرتی ہے انھیں تاریخ نے نظر انداز نہیں کیا، البتہ صورتیں مختلف ہوتی ہیں اور اس سایہ میں پرورش پاکر خاندانوں نے اپنے ولی نعمت سے جو سیاسی حقوق حاصل کئے، انھیں جس طرح مٹایا، اور آخر کار انہیں مٹا کر تاج و تخت حاصل کیا وہ تاریخ کا کوئی نادر الوقوع مسئلہ نہیں، لہٰذا مغل خاندان کے ساتھ انگریزی حکومت نے جن سیاسی تدابیر اور ظاہر دارانہ مراعات سے کام لیا ان کا مطالعہ کرنے کے بعد نہ تو انگریزی حکومت کو مطعون بنایا جاسکتا ہے، نہ انگریزوں سے کوئی گلہ ہے۔

خاندان مغلیہ کا دور انحطاط تو عالمگیر کی وفات سے ہی شروع ہوتا ہے لیکن اکبر اور عالمگیر کی قائم کی ہوئی عظمت نے شاہ عالم کی زندگی (۱۱۱۸ھ سے ۱۱۲۴ھ) تک کوئی نمایاں تغیر نہ ہونے دیا اس کے بعد پیاپے مختلف بادشاہوں کی تخت نشینی اور چند ماہ اور چند یوم تک زمام حکومت لے کر برطرف ہونے کے واقعات نے مغل سیاسیات کو بہت نقصان پہونچایا، چنانچہ شاہ عالم کی وفات ۱۱۲۴ھ سے سلطان محمد ابراہیم کے وقت جلوس ۱۱۳۲ھ تک تخت دہلی پر پیاپے مغل خاندان کے نو بادشاہ بیٹھے،

ان میں حضرت سلطان فرخ سیر نے چھ سال تین ماہ اور چند یوم تک حکومت کی بقیہ تمام سلاطین چند ماہ اور چند یوم تک سریر آرائے حکومت رہے ابوالفتح محمد شاہ بادشاہ کی حکومت ہر چند سطوت مغلیہ کے استقرار کے اعتبار سے اچھی تھی لیکن نادری حملہ اور دہلی کی بربادی نے مغلوں کو دنیا کی نظر میں بہت خفیف کر دیا، اور غالباً اسی وقت سے ہندوستان کی دوسری سیاسی تحریکات کو مغلوں پر تسلط حاصل کرنے کی جرأت ہوئی، محمد شاہ کے بعد بہادر شاہ سے لیکر اکبر شاہ (۱۱۶۱ھ تا ۱۲۵۳ھ) تک ہر چند مستقل طور پر بادشاہوں نے حکومت کی، لیکن شاہ عالم ثانی ہی کے دور میں انگریزی سیاسیات نے ہندوستان پر ایک گہرا اثر پیدا کر دیا تھا اور شاہ عالم سے لیکر سراج الدین بہادر شاہ ظفر (۱۱۷۳ھ تا ۱۲۵۳ھ) تک تیموری خاندان کے بجائے انگریزوں کو ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی طاقت تصور کرنی چاہیئے۔

لارڈ ولسلی اور اس کے رفقائے دار الشوریٰ کا خیال تھا کہ شاہ عالم کو اپنی حمایت میں لیکر بتدریج شہنشاہیت کی سیاسی تدابیر اختیار کرنی چاہیئے[1]، شاہ عالم کے مسئلہ حفاظت

---

[1] عہد ظفر کے یہ سیاسی و تاریخی حالات میں نے "جان ولیم کے" کی کتاب "تاریخ جنگ سپاہیان" سے لئے ہیں جو تین جلدوں میں ہے تاریخی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے مصنف نے بعض جگہ جیسی زہر افشانیاں کی ہیں، طنز آمیز لہجہ، اور حقارت انگیز طرز خطابت اختیار کیا ہے، وہ یہی نہیں کہ ہندوستانی دماغوں کے اندر ہیجان پیدا کرنے والے ہیں بلکہ انگریزی سیاست کے بھی منافی ہیں اور میں بہ آہنگ بلند کہہ سکتا ہوں کہ مصنف نے یہ کتاب لکھ کر انگریزی سیاسیات کو فائدہ کی بجائے نقصان پہونچانے کی کوشش کی ہے میں نے چاہا تھا کہ ظفر کے متعلق ہر پہلو سے بحث کروں لیکن افسوس یہ ہے کہ (بقیہ نوٹ کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ آئندہ)

سے لارڈ ولسلی نے سیاسی فضا میں جو نمایاں تغیر پیدا کر دیا تھا وہ یہ تھا کہ اگر خاندان مغلیہ کا یہ فرمانروا انگریزوں کی بجائے فرانسیسیوں یا مرہٹوں کی حفاظت میں آجاتا تو انگریزوں کو برطانوی حکومت کے قائم کرنے میں دقتیں پیدا ہوتیں۔ چنانچہ یہ نظریہ اس خط سے بھی واضح ہو جاتا ہے، جو لارڈ ولسلی نے ۱۳ر جولائی ۱۸۰۴ء کو انگلستان کی "عدالت رہنمایان کی مجلس مخفیہ" میں بھیجا تھا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ شاہ عالم کو برطانوی حفاظت میں لینے سے فرانسیسی قوم جو ہندوستان کے حصہ میں صاحب اقتدار رہے، اپنے معاندانہ ارادوں میں کامیاب نہیں ہو سکتی، کیونکہ شاہ عالم ان کے معاندانہ کارروائیوں میں ایک آلہ تھا، جس سے وہ اب محروم ہو گئے، ولسلی نے اس سیاسی حکمت عملی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ بادشاہ کے مسئلہ حفاظت سے اطراف و جوانب کی دیسی ریاستوں پر ایک اچھا اثر پڑے گا اور وہ یہ دیکھ کر کہ انگریزوں نے بادشاہ کے لئے اس گری ہوئی حالت میں ایک نشیمن راحت کا سامان کر دیا، اور اسکے آفت زدہ کثیر التعداد افراد خاندان کے لئے ایک معقول ذریعہ معاش مقرر کر دیا، انگریزی سیاسیات کو بہ نظر استحسان دیکھیں گے، شاہ عالم کا انگریزی حمایت میں آجانا خاندان

(بقیہ نوٹ صفحہ ماسبق) میں پٹنہ کی اورنٹیل لائبریری میں باوجود کاوش عہد ظفر کی تاریخی کتابیں نہ پا سکا وہاں اُردو کی کتابیں ایک تو یوں بھی کم ہیں، اور جو ہیں ان میں اس مقصد کی کتابیں نہ مل سکیں تاریخ اور ادب کی کتابوں کی تدوین کے متعلق خاندان مغلیہ کو جو شرف ہے، وہ علمی دنیا سے مخفی نہیں، لیکن عہد ظفر خاندان مغلیہ کا دور نزع تھا، وہاں تاریخ اور شاعری کے متعلق کتابیں کون لکھتا، بہت تلاش کے بعد "جام جم" مصنفہ سیّد احمد خاں (قلمی نسخہ) انکشاف الخلوق مصنفہ منشی خادم علی سندیلوی اور اس انگریزی کتاب سے سیاسی اور تاریخی حالات مرتب کئے۔

یتموریہ کے مٹنے اور حکومت برطانیہ کے استقلال کا سبب ہوا، اور "ولیم کے" فتح و نصرت کے نہایت ستمگارانہ جذبات میں جبکہ انسان بیخود ہو جاتا ہے، کہتا ہے، کہ "وسلی نے اپنے رفقا سر جارج بارلی اور مسٹر اڈمن اسٹون کے مشورہ سے ایک فہرست تجاویز مرتب کی جس کے ذریعہ بادشاہ کی وقعت ایک گڑیا سے زیادہ نہیں رہی وہ بیک وقت ایک بادشاہ بھی تھا، اور انگریزوں کے سیاسی مقاصد کے حصول کا ایک آلہ۔ وہ کچھ تھا بھی اور کچھ نہیں، اب وہ انگریزوں کا ایک وظیفہ یاب تھا، وہ ہم لوگوں کے لئے "بازی عظیم" (Great game) کا ایک نمود اطمینان تھا، ہم لوگوں کو یہ دیکھ کر تشفی تھی کہ بادشاہ ہمارے تصرف میں ہے، لیکن ساتھ ہی وہ ہم لوگوں کیلئے ایک کشمکش اور حیرت کی چیز بھی تھا کہ کس طرح اس آلہ کو استعمال کریں لارڈ وسلی کی حکومت کی سیاسی قابلیت کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ یہ لارڈ وسلی کی زبردست حکمت عملی تھی کہ اُس نے صرف خاندان تیموریہ ہی نہیں بلکہ اُن لوگوں سے بھی مصالحت رکھی جو اس مسلمان شاہی خاندان سے ایک جذبہ احترام اور تعلق معروزانہ رکھتے تھے لارڈ وسلی کی تجاویز میں ایک تجویز یہ تھی کہ ریاستوں پر جو اقتدار قائم کیا گیا ہے، اُس کا ایک حصہ ہنوز بادشاہ سے متعلق رہے اور ان اضلاع کی آمدنی کے علاوہ جو اس تخت شاہی سے مخصوص تھی، بادشاہ اور اُس کے خاندان کے لئے سالانہ ایک لاکھ پونڈ سے زیادہ وظیفہ مقرر کر دیا، اس طور سے کائنات کا سب سے بڑا بادشاہ، ہندوستان کا حکمراں باایں ہمہ کہ اُسے حکومت بھی تھی اس کے مقبوضات بھی تھے حقیقتاً "جماعت تجار" کا ایک وظیفہ خوار ہو گیا، حالات نے ایسی صورتیں اختیار کر لی تھیں جو حکومت برطانیہ ہند کے فواید کی موید

ہوں، لیکن خطرات سے خالی نہ تھیں، ان مصائب اور انحطاط کے باوجود بادشاہ کا نام قوت کا ایک ستون تھا اور لوگ پرچم شاہی کو ہنوز بہ نظر اعزاز و احترام دیکھتے تھے لارڈ ولسلی نے اچھی طرح معلوم کر لیا کہ اگر حکومت مغلیہ کے یہ بقیہ آثار قائم رہے اگر شاہ عالم کو شاہجہان کے محل میں اس تمام اگلی شان وشکوہ کے ساتھ ایک مسلمان آبادی کے درمیان جو ہنوز خاندان تموریہ سے وفاداری کا جذبہ رکھتی تھی چھوڑ دیا گیا تو ایک نہ ایک دن شاہ عالم کے کسی جانشین کی بدولت تباہ شدہ شہنشاہیت کی تعمیر جدید کی جد وجہد ہوگی جس سے ہم لوگوں کو نہایت پریشان کن تکالیف کا سامنا ہوگا، اس لئے تجویز کیا گیا کہ مونگیر شاہی خاندان کا مسکن قرار دیا جائے لیکن تبدیل مقام کے خیال سے ضعیف العمر بادشاہ کانپ گیا اور یہ لرزش خوف اس کے تمام خاندان، چھوٹے بڑے، مرد عورت متعلقین اور محکومین میں سرایت کر گئی لارڈ ولسلی نے اب مزید ایذا رسانی سے باز رہ کر انھیں مورد عجز بنانا چاہا اور راضی ہو گیا کہ وہ دہلی محل میں سابق دستور رہیں۔

دسمبر ۱۸۰۶ء میں شاہ عالم کا انتقال ہو گیا، اور اکبر شاہ اس کا جانشین مقرر ہوا اس وقت انگریز افسر جو دہلی میں برطانوی حکومت کی نیابت کرتا تھا قدیم طرز کا ایک درباری تھا، اور اُسے اپنی نرمی کلام اور اوضاع سے کافی موقعہ تھا کہ دربار شہنشاہی پر خارجی اثر ڈال سکے، مسٹر سیٹن کو مرجانا قبول تھا لیکن وہ محل کے چھوٹے چھوٹے افراد کے احساسات کو مجروح کرنا نہیں چاہتا تھا، چارلس مٹکاف نے لکھا کہ میں سیٹن کے اس طرز عمل کو پسند نہیں کرتا، جو اُنھوں نے شاہی خاندان کے انتظام میں اختیار کیا ہے، میں نے مانا کہ ایک برسر اقتدار

شاہی خاندان کے زوال کے بعد عدل و انصاف، شفقت و مرحمت کا اقتضا ہے کہ ایک مستحسن طرز عمل اختیار کیا جائے، لیکن سیٹن کا خلق ورافت، ان کا عجز، محبت ان کا اعتراف لطف اس تمام شان وشکوہ کا خاتمہ کر رہا ہے جس کا برطانوی حکومت کے ایک نائب کو دہلی میں، جو صحیح معنی میں دہلی کا حکمراں ہے، حاصل ہونا چاہئے اس طور سے حمیت انسانی کے اظہار میں وہ ان شاہی جذبات کو بیدار کر رہے ہیں جنھیں ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا چاہئے یہ تو ظاہر ہے کہ ہم لوگ بادشاہ کو شہنشاہی اقتدار تفویض کرنا نہیں چاہتے، لیکن ساتھ ہی ہم لوگوں کو ایسی روش نہیں اختیار کرنی چاہئے کہ اس کے دل میں اس کے حصول کا حوصلہ پیدا ہو جائے، ہم لوگ اس کے حالات کے مطابق اس کا احترام کریں ہم لوگ ماحول کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی آسائش کا خیال رکھیں، اور جہاں تک ممکن ہو وہ تمام ذرائع بہم پہونچائیں جس سے وہ خوش خوش رہے۔ ساتھ ہی جب ہم لوگوں کی غرض غائی یہ نہیں کہ پھر اُسے وہی اگلی شہنشاہیت عطا کریں تو یہ ضروری ہے ہم لوگ یہ بھی مدنظر رکھیں کہ اُسے شہنشاہیت کا خواب دیکھنے کی بھی ترغیب نہ ہو، ایک سفید مو ماہر سیاسیات بھی اس سے زیادہ معقول بات نہیں لکھ سکتا، اور جب چند سال گزرنے کے بعد وہ دہلی میں رزیڈنٹ مقرر ہوا، اُسے مسائل کے حل وعقد کے اعلیٰ اختیارات حاصل ہوئے تو اُس کے لڑکپن کے خیالات اور بھی قوی ہو گئے اسے ایسے ایسے امور سے سامنا ہوا جو عقل اور انسانیت دونوں اعتبار سے مجرمانہ تھے، لیکن نہ تو وہ خود اور نہ اس کے جانشین اس سے زیادہ کر سکتے تھے، کہ یکے بعد دیگرے ایسی تدبیر اختیار کریں کہ تبدریج ان خرابیوں کا ازالہ ہو جائے جوان کے سامنے

رونا تھیں، وقت گزر گیا انگریزوں کے بڑے بڑے مقبوضات محفوظ تھے، انھیں کسی خارجی دشمن سے خوف نہ تھا اور وہ اپنے اندر ایک زبردست قوت کا احساس پانے لگے کہ وہ ہر اس خطرہ کا سامنا کر سکتے ہیں جس سے انھیں سرزمین ہندوستان میں دوچار ہونا پڑے، اُنھوں نے مضبوط اور جوانمردانہ قدم اُٹھایا۔ اب انھیں ایک حکومت قائم کرنے کے خیال سے الگ رہنے کی ضرورت نہ تھی، ابتدائے صدی میں جو ایک خطرناک خیال معلوم ہوتا تھا اب ہم لوگوں کی پوزیشن کا ایک قطعی سانحہ کہا جا سکتا تھا لارڈ ولسلی کے زمانہ میں "بازی عظیم" ناکمل طور پر انجام پائی تھی اور دس سال کے بعد لارڈ ہیسٹنگس نے دیکھا کہ سمجھوتہ سے کوئی مفید نتائج مرتب نہ ہوئے اور اُنھوں نے ارادہ کرلیا کہ ہندوستان کی تمام سیاسی قوتوں پر حکومت برطانیہ کا اقتدار قایم کر دیں، وطن اور غیر ممالک دونوں جگہ زمانہ بدل چکا تھا اور اس کے ساتھ ہمارے احساسات میں تغیر ہو چکا تھا، یورپ میں ہماری کامیابیوں نے ہم لوگوں کے اندر یہ یقین پیدا کر دیا تھا کہ ہم لوگ ایک بڑی طاقتور قوم ہیں، اور باوجودیکہ "لیڈن ہال" اسٹریٹ کے رہنما، مشرق میں ہماری تمام فوجی اور سیاسی توسیع کے خلاف صف بستہ تھے، لیکن یہ خیال تھا کہ اگر ہمیں کامیابی ہوئی تو انگریزی قوم ہماری جوانمردانہ حکمت عملیہ کی داد دے گی، اس زمانہ سے انگلستان کے ہاتھ میں ہند کے شاہزادوں کی قسمت کے فیصلہ کرنے کی باگ ڈور آگئی اب ہم لوگوں کو کوئی دریغ نہ تھا کہ ایک سب سے زبردست طاقت کی طرح اپنا طرز عمل اختیار کریں ہماری تجاویز کا ایک اہم جزو یہ تھا کہ ہم سلطنت دہلی کے فسانہ کو مٹائیں، اب مشرق

میں لفظ ”حکومت“ کا الحاق صرف برطانیہ کے ساتھ ہو سکتا تھا اور ”تمسخ شہنشاہیت“ کے قائم رہنے کی ضرورت نہ تھی جیسے ہم لوگوں نے اپنی سیاسی حکمت عملیوں کے لئے پہلے ضروری خیال کیا تھا؛ یہ قابل بیان ہے کہ کس طرح تین سال کے درمیان میں آفتاب شہنشاہیت کی چمک ماند پڑتی گئی، کس طرح ایک گورنر جنرل اور اس کے بعد دوسرا مغلوں کے متکبرانہ دعاوی کو مسترد کرتا گیا، اور خاندان تیموریہ کے اُن اعزازات کو، جنھوں نے عرصہ بعید تک اس کی شان و شکوہ کو قایم رکھا تھا، مٹاتا گیا۔ ۱۸۳۵ء میں ہندوستان کے سکہ مروجہ میں یہ تبدیلی واقع ہوئی کہ اس پر مغل بادشاہ کا نام و علامت کندہ نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کی جگہ ”سکہ کمپنی“ نے لی، یہ تمام صورتیں ارباب محل کے پیش نظر تھیں لیکن وہ لوگ انگریزوں کے روزافزوں اقتدار کے حاجت مند تھے، عظیم الشان محل جو بذات خود ایک بڑا شہر تھا، بہتیری قسم کی مکروہات کا مخزن تھا، اور ایک مسیحی حکومت کو نسلاً بعد نسلٍ آزاد مرد اور بدسیرت عورتوں سے تکلیف پہونچ رہی تھی، جو خود اپنے لئے بھی لعنت بنے ہوئے تھے اور دوسروں کے لئے بھی محکومانہ سرکاری الفاظ میں کہا جاتا تھا کہ شاہی خاندان کے افراد قانون کے قیود سے آزاد ہیں، وہ کاہلی اور بداطواری میں غرق رہتے، اور انھیں عام راستے سے کوئی التفات نہ تھا، حقانیت کو بغیر چھپائے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ محل کے مقامات میں اُن تمام جرایم کا ارتکاب ہوتا تھا جن کا رواج مشرق میں تھا اور صرف خدا تعالیٰ ہی اس ہولناک فہرست آزادی کا محاسبہ کر سکتا تھا، ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء کی شام کو ۸۲ سال کی عمر میں اکبر شاہ نے وفات پائی، چند سال قبل اس نے اپنے ایک عزیز لڑکے

کے لئے جائز شاہزادہ کی جانشینی کے خلاف خفیہ کارروائی کی تھی، اور اب شاہزادہ ابوظفر اس دور کی سرکاری اصطلاح میں "ابوالمظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی"[5] کے لقب سے سریر آرائے حکومت ہوا، وہ اس وقت عمر کا زیادہ حصہ گزار چکا تھا لیکن چونکہ ایک عرصہ سے صاحب حکومت خاندان کا رکن تھا۔ اس کی زندگی کی ساٹھ سال کی گزری ہوئی مدت نے اس پر بُرا اثر نہیں ڈالا تھا، خیال کیا جاتا تھا کہ وہ ایک خموش، کاہل انسان ہے، جسے صرف شاعری کا شغف ہے اور اسے فطری طور پر سیاسی خفیہ کارروائیوں سے کوئی علاقہ نہیں۔ تاہم شہنشاہ کا خطاب ملتے ہی، اس نے شاہی وظیفہ میں جو اکبر شاہ کو دیا جاتا تھا اضافہ کے لئے اصرار کرنا شروع کیا، سر چارلس مٹکاف گورنر جنرل پبلک کے روپیہ کی اتنی بربادی کرنی نہیں چاہتے تھے، لیکن باوجودیکہ گورنر جنرل کو پورا یقین تھا کہ یہ روپیہ کی تضییع ہے، لیکن اس نے وعدہ کر لیا مگر اس کے لئے شرط پیش کی کہ بادشاہ کو ایک عہدنامہ کے ذریعہ یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ وہ آئندہ برطانوی حکومت پر کسی قسم کے دعاوی نہیں کرینگے، لیکن بہادر شاہ نے وہی کیا جو ان کے والد نے قبل کیا تھا، انھوں نے

---

[5] ۲۶ شعبان ۱۱۷۳ھ میں قریب غروب آفتاب بہادر شاہ کی ولادت ہوئی تھی۔ دارالسلطنت دہلی میں بہ عمر تریسٹھ سال دس ماہ شب جمعہ ۱۱ جمادی الثانی کو سریر آرائے حکومت ہوئے۔ مولوی امام بخش صہبائی نے تاریخ کہی

از شہ دولت بہادر شاہی ۔۔۔ بنشست بہ تخت دولت روز افزوں
شد بہ زئی طرف باغ دہلی ۔۔۔ نزہت بفرود ارتباع دہلی
تاریخ جلوس آں شہ والا قدر ۔۔۔ آمد بہ لب خرد چراغ دہلی

مجوزہ شرط کو ماننے سے انکار کر دیا، اور ہنوز یہ خیال کرتے رہے کہ وہ انگلستان میں ایک نائب بھیجکر جو کچھ چاہتے ہیں بلا کسی قید و شرط کے حاصل کر لیں گے اکبر شاہ نے مشہور برہمن رام موہن راؤ کو اپنا نائب مقرر کیا اور اپنے اسی قدیمی نشۂ حکومت میں انھیں ''راجہ'' کا خطاب دیدیا لیکن انگریزی ارباب حل وعقد نے سرکاری طور پر ''راجہ'' کے خطاب کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، ہر چند وہ اس شخص کی سیرت کا بڑا احترام کرتے تھے، کیونکہ وہ شخص جہلا کو ایک معاشرتی اور مذہبی مصلح کی طرح روشن خیال بنانے کی کوشش کر رہا تھا، مغل بادشاہ کے نائب کی حیثیت سے رام موہن راؤ نے کوئی مفید کام انجام نہیں دیا اور بہادر شاہ نے دیکھا کہ معاملات اسی حالت میں تھے جبکہ متوفی بادشاہ کی طرف سے راجہ موہن راؤ نے انگلستان کا سفر اختیار کیا تھا، لیکن ابھی اسے یقین تھا کہ اگر کسی انگریز نائب کے ذریعہ انگلستان میں پیام رسانی کی جائے تو مفید ہو سکتی ہے، اس لئے جب اُنھوں نے سُنا کہ ایک فصیح و بلیغ خطیب جس نے رنگین اقوام کے حقوق کی نیابت کر کے مغربی دنیا میں بڑی شہرت حاصل کر لی تھی۔ ہندوستان میں آیا ہے، تو اُنھوں نے اسے دہلی میں مدعو کیا، ان کی خواہش ہوئی کہ اسے اس خدمت پر مامور کریں انھیں اپنے بہت سے خیالی مصائب کی فریاد کرنی تھی لارڈ اڈنبرو نے نذرانہ پیش کرنے کا رواج ختم کر دیا تھا، یہاں تک کہ ریذیڈنٹ کے لئے بھی اس قسم کا کوئی ہدیہ پیش کرنا ممنوع تھا، نذرانہ پہلے گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف پیش کرتا تھا، ۱۸۳۷ء بہادر شاہ کی تخت نشینی تک موخر الذکر عہدہ دار یہ عمل کرتا رہا ۱۸۴۲ء یا ۱۸۴۳ء کے موسم سرما میں لارڈ اڈنبرا کے ناظموں نے بادشاہ کو نذرانہ پیش کیا گورنر جنرل

کو اس کی خبر نہ تھی، جب اُسے خبر ہوئی تو وہ نہایت متعجب ہوا، اور پھر اپنے ناظموں پر خفگی کی۔ اور ہمیشہ کے لئے نذرانہ پیش کرنے کی رسم کو اُٹھا دیا، اس طور سے خاندان تیموریہ کی آخری شاہانہ شان بھی انگلستانی حکومت کے زیر اثر جاتی رہی[۱] ہر چند اس کے معاوضہ میں روپیہ دیا جاتا تھا، لیکن بادشاہ کے دماغ کو یہ تغیر بھی تکلیف دے رہا تھا، کمپنی نے کسی مزید وظیفہ کے تقرر سے اُس وقت تک کے لئے انکار کر دیا جب تک شاہی خاندان اُن مفصلہ شرائط کو منظور نہ کر لے، حقیقتاً کوئی سبب بھی نہ تھا کہ وظیفہ بڑھایا جائے، ایک لاکھ روپیہ ماہانہ کافی تھا، اس ماہانہ لاکھ روپیہ کے وظیفہ کے علاوہ بہادر شاہ کو بعض شاہی اراضی کی آمدنی بھی تھی، اور انہیں شہر سے بعض جائداد کا کرایہ بھی آتا تھا[۲]۔

بہادر شاہ کو برطانوی حکومت سے کوئی گلہ نہ تھا، اور غالباً بادشاہ کو کامل قناعت نہیں تو ایک مطیعانہ امن کے ساتھ اس حالت میں بسر کرتے، لیکن حرم کی خفیہ ریشہ دوانیوں نے جن کا ہر مشرقی بادشاہ شکار ہوا کرتا ہے، بہادر شاہ کو زیر اثر کر لیا تھا اُنھوں نے ایک نوجوان لڑکی سے شادی کر لی تھی، اور پیری میں انھیں اس سے ایک لڑکا بھی پیدا ہوا تھا، وہ عورت خیر و شر کے متعلق بادشاہ پر اثر رکھتی تھی جیسا کہ ہوتا چلا آیا ہے، نواب زینت محل

---

[۱] "ولیم کے" نے اس منظر کا نہایت دلچسپ مرقع پیش کیا ہے، جبکہ وہ انگریز افسر بہادر شاہ کو نذرانہ دینے گئے ہیں، ان میں ایک انگریز کا بیان ہے کہ اُس نے باوجود ردعمل خاندان تیموریہ کے اس آخری نشیمن جلال میں جب وقت قدم رکھا، تو اُس پر ایک خاص قسم کا رعب اور ہیبت طاری تھی یہ آخری نذرانہ تھا جو مغل خاندان کے اس آخری فرمانروا کو برطانیہ کی طرف سے دیا گیا (تاریخ جنگ سپاہیان جلد ۲)۔

[۲] مسٹر سنڈر کی شہادت بابتہ مقدمہ بہادر شاہ

کے زیر اثر بادشاہ نے کوشش شروع کی کہ حقیقی جانشین کا حق مسترد کر کے اس بچے شہزادہ کو اپنا جانشین مقرر کر دے، جیسا کہ اکبر شاہ نے خود بہادر شاہ کے خلاف کیا تھا اسی طرح اس نے بھی یہ نامنصفانہ طرز عمل اختیار کیا تاکہ اس کی محبوبہ کو تسلی ہو، لیکن اس میں بادشاہ کو جلدی کرنے میں ناکامی کا خطرہ تھا اس نے بہتر یہی سمجھا کہ جب تک بچہ جوان بخت جوان نہ ہولے موقعہ کا انتظار کیا جائے۔

جانشینی کا قصہ

۱۸۴۹ء میں شہزادہ دارا بخت وارث تخت نے وفات پائی، اُس وقت بہادر شاہ کے ستر سے زیادہ بیٹے تھے جانشینی کے سوال نے گورنر جنرل کو بہت تکلیف پہونچائی، لارڈ ڈلہاوزی ایسا نہ تھا کہ مغل بادشاہ کی اس تمسخرانہ بادشاہت کو تسلیم کرتا، اس کے سامنے دوسرے لوگ تھے جو قدیم خاندان کی روایات پر زیادہ متاثر تھے اور وہ غم و ملال کے ساتھ اس حالت کی برقراری چاہتے تھے، جس کے خلاف عقل و حقانیت بغاوت کر رہی تھی، "بہادر شاہ کی وفات کے بعد" شاہ دہلی "کے خطابی شکوہ کے متعلق "ایسٹ انڈیا کمپنی" میں مباحث ہوئے، اگست ۱۸۴۴ء میں "مجلس رہنمایان" نے یہ خیال ظاہر کیا، گورنر جنرل نے ریجنٹ کو ہدایات بھیجی ہیں کہ شاہ دہلی کی وفات کے بعد اُس کے جانشین کے اس خطاب کے اختیار کرنے پر کوئی ایسا قدم نہ بڑھایا جائے جو اس خطاب کے تسلیم کرنے پر مشتمل ہو، اگر ان ہدایات میں خطاب کے مسترد کرنے کا خیال ظاہر کیا جاوے گا تو ہم لوگ اسے منظور نہیں کرینگے، جب تک ہم لوگوں کو تمہاری طرف سے بیشتر معلومات نہ موصول ہوں اور جب تک ہم لوگوں کو اس خلاصہ سفارشات

پر جو بحث کیا جاویگا غور وفکر کرنے کا وقت نہ ملے، اس تجویز سے لیڈن ہال چیمبر میں مختلف جماعتیں ہوگئیں اور اس کا نتیجہ یہ ہو کہ کوئی عملی قدم بڑھانے میں دیر ہوئی، ڈلہا وزی نے دیکھا کہ مسئلہ اس وقت کے لئے لاینحل رہا جب تک ہندوستان سے مشورے ارسال نہ کئے جائیں، دارا بخت کی وفات نے مسئلہ کے طے پانے کا موقعہ دیا جس سے ڈلہاوزی جیسے مزاج کا آدمی چوک نہیں سکتا تھا، دوسرا جانشین اسلامی قانون کے مطابق شاہزادہ فخرالدین ہوتا تھا جس کی عمر اس وقت تیس سال کی تھی اور وہ یوروپین سوسائٹی کا شایق اور برطانوی حکومت کا روادار تھا اس کے ذریعہ لارڈ ڈلہاوزی تغیرات پیدا کرنا چاہتا تھا۔

ڈلہاوزی کی تدابیر

برطانوی حکومت سہولت کے ساتھ وقت کا انتظار کرتی تھی دارا بخت وہ اخیر شہزادہ تھا جو مغلیہ خاندان کی حکمرانی کے زمانہ میں پیدا ہوا تھا اُسے خیال تھا کہ دہلی کی بادشاہت کا مالک ہوں گا، اس وقت ان اُمیدوں اور آرزؤں کے مٹانے میں بڑی دقت ہوتی، فخرالدین ایک وظیفہ خوار پیدا ہوا تھا اسے اس وقت کی یاد نہ تھی جبکہ دہلی کا بادشاہ تخت پر بیٹھتا، اور وہ اس وقت تک ہندوستان میں سب سے زبردست اقتدار رکھتا تھا برطانوی حکومت کے اغراض ومصالح کے خلاف یوں تو بہت سی باتیں قابل اصلاح تھیں، لیکن دو مسائل بہت اہمیت رکھتے تھے، خاندان مغلیہ میں لقب "شاہ" کا استقلال، اور شاہی محل پر ان کا قبضہ۔ لارڈ ڈلہاوزی ان مسائل کی اہمیت سے ناواقف نہ تھا وہ چاہتا تھا کہ بہادر شاہ کے بعد "شاہ" کا خطاب اس خاندان میں باقی نہ رہے، اور شاہی محل پر انگریزوں کا تصرف ہو جائے۔

لارڈ ڈلہاوزی نے اپنے دور حکومت ہی میں ”عدالت رہنمایان کی مجلس مخفیہ“ کو لکھا کہ اب ضرورت ہے کہ حکومت کی طرف سے ایسے احکام جاری ہوں جن کے ماتحت موجودہ بادشاہ کے بعد اس کے جانشین کو شاہ کا لقب اختیار کرنے کا حق نہ رہے دوسرا حکم ان کے نقل مکان کے متعلق ہونا چاہیے، ڈلہاوزی کی تجویز تھی کہ شاہی خاندان اب ”قطب“ میں جا رہے، اور شاہی محل پر انگریزوں کا قبضہ ہو، اگر بادشاہ ان تجاویز کو نہ مانیں تو وظیفہ بند کر دیا جائے، ان تجاویز پر دلچسپ مباحث ہوئے۔ بورڈ نے ڈلہاوزی کے نظریات کی تائید کی، لیکن ”مجلس رہنمایان“ نے اختلاف کیا اور بتایا کہ یہ تجاویز صرف گورنر جنرل نے ارسال کی ہیں، مجلس شوریٰ کی رائیں اس پر مثبت نہیں، بورڈ نے جواب دیا کہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ بورڈ نے دکھلایا کہ گورنر جنرل لکھتا ہے کہ ہر چند خاندان تیموریہ سے کوئی خدشہ نہیں لیکن جب مسلمان باشندے جوش میں آکر برطانوی اقتدار کو صدمہ پہونچانا چاہیں تو ان کے لئے اسباب موجود ہیں، ایک بادشاہ ہے ایک مستحکم قلعہ ہے، اس رد وکد کا نتیجہ یہ ہوا کہ بورڈ نے آخری فیصلہ یہ کیا کہ قلعہ سے شاہی خاندان کا اخراج مستحسن نہیں، لارڈ ڈلہاوزی کو یہ خط ابتدائے موسم بہار ۱۸۵۰ء میں موصول ہوا، خط پانے کے بعد اس نے لکھا کہ ہر چند میرا سیاسی عقیدہ ان مرسلہ نظریات کے متعلق پہلے بھی وہی تھا اور اب بھی ہے لیکن جب انگلستان کے ارباب حل وعقد نے جن کے خیالات کو ہندوستانی سیاسیات کے متعلق بہت اہمیت ہے، اپنی تشویش اور خطرہ کا اظہار کیا ہے، تو یہ تجویز ابھی عمل میں نہیں لائی جاوےگی۔

محل کی ریشہ دوانیاں

بادشاہ نے شاہزادہ فخرالدین کی جانشینی کے متعلق احتجاج کیا، اپنی بیوی زینت محل کے زیر اثر انھوں نے اُس کے لڑکے کے لئے جو اس وقت گیارہ سال کا ایک بچہ تھا جانشینی کی رائے ظاہر کی، بادشاہ نے جو اسباب عذر پیش کئے تھے ان میں ایک نہایت دلچسپ عذر یہ تھا کہ شاہزادہ فخرالدین مختون تھا، اس لئے خاندان تیموریہ کی روایت کے مطابق کہ کوئی شخص جس کا کوئی عضو کٹا ہو تخت نشین نہیں ہو سکتا، فخرالدین سلطنت کا حقدار نہیں، ہمایوں کے وقت تک سلاطین مغلیہ مختون تھے، لیکن یہ رسم بعد میں منقطع ہو گئی، بعض جسمانی علت کے اعتبار سے فخرالدین کے ساتھ یہ استثنیٰ تھا اور زینت محل کو ایک بہانہ مل گیا، جانشینی کے سوال کے متعلق انگریزی ماہرین سیاست کا یہ متفقہ فیصلہ ہو گیا کہ بادشاہ کی حیات تک تمام امور غیر متغیر رہیں، شاہزادہ فخرالدین نائب بادشاہ متصور ہو، لیکن اس کے حریف مقابل سے اگر یہ فائدہ حاصل ہو کہ وہ شاہی محل کو چھوڑ کر قطب میں جا رہے، تو موقعہ ہاتھ سے نہ دیا جائے اگرچہ وظیفہ میں اضافہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

برطانوی حکومت اور فخرالدین سے معاہدہ

سرکاری ہدایات کے مطابق دہلی کے ایجنٹ سر ٹامس مٹکاف نے شہزادہ فخرالدین سے خفیہ ملاقات کی اور اُن کے سامنے یہ تجویز پیش ہوئی کہ اگر وہ ایک عہدنامہ کے ذریعہ اس امر پر راضی ہو جائے کہ بادشاہ کا جانشین ہونے کے بعد شاہی محل سے دست بردار ہو کر "قطب" میں اپنا مقام سکونت منتقل کر دے گا تو انگریز جانشینی کے مسٔلہ میں اسکی طرفداری

کریں گے، شہزادہ نے یہ تجویز منظور کرلی، ایک عہدنامہ مرتب ہوا، شہزادہ نے اس پر دستخط کیا لوگوں کی شہادتیں ثبت ہوئیں، جب یہ خبر قلعہ میں پہونچی تو لوگ بہت متاثر ہوئے اور خصوصیت کے ساتھ ملکہ زینت محل کو زیادہ رنج ہوا۔

فخرالدین کی ناگہانی وفات

۱۰ر جولائی ۱۸۵۶ء میں فخرالدین نے مرض استفراغ سے اچانک انتقال کیا۔ قرائن بتاتے ہیں انہیں زہر دیا گیا، شاہی حکیم احسان اللہ کو بلایا گیا لیکن وہ نہ آسکے یا انھوں نے آنے میں حیلہ حوالہ کیا، نتائج سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ رات ملکہ زینت محل کے کمروں میں کس طرح بسر ہوئی ہوگی، یقیناً یہ رات ریشہ دوانی اور عمل سازی کی رات ہوگی۔ دوسرے دن مسٹر مسٹکاف ملنے آیا تو بادشاہ نے ایک رقعہ دیا جس میں شہزادہ جواں بخت کی جانشینی کے متعلق حکومت سے استرضا کیا گیا تھا، اس میں بادشاہ کے دوسرے لڑکوں کے دستخط بھی مندرج تھے اس کا خلاصہ یہ تھا کہ زینت محل کا لڑکا جواں بخت، عقل خوبی علم اور عادات وخصایل کے اعتبار سے بادشاہ کا جانشین بننے کا مستحق ہے اس میں شاہی خاندان کے شاہزادوں کی مہر تھی، لیکن دوسرے دن مرزا قریش بڑے لڑکے نے حکومت برطانیہ میں ایک یادداشت (میموریل) بھیجی کہ بادشاہ لے شاہزادوں کو لالچ دلائی تھی کہ اگر وہ دستخط کریں گے تو اُن کا وظیفہ بڑھا دیا جاوے گا، ورنہ بند کر دیا جاویگا، بادشاہ نے مرزا قریش کو بھی کچھ دیکر راضی کرلینا چاہا، مرزا نے ایک مطیع اولاد کی حیثیت سے بادشاہ کے ان تمام خواہشات کو قبول کرنا چاہا اگر وہ اسے جانشین

مقرر کریں لیکن جب اُس نے دیکھا کہ زینت محل کے اغوا سے بادشاہ تلے ہوئے ہیں کہ اُسے جانشینی سے محروم کر دیں تو اُس نے حکومت برطانیہ میں ایک یادداشت بھیجی، اور دکھلایا کہ میں سب سے بڑا ہوں، میں نے حج کیا ہے، حافظ قرآن ہوں، اور ملاقات کے وقت میری بقیہ استعداد معلوم ہو سکتی ہے۔

لارڈ کیننگ کے نظریات سیاسی

لارڈ ڈلہاوزی نے جو سیاسی طرزِ عمل اختیار کیا تھا، نہایت مدبرانہ تھا ہر چندان کا یہ عقیدہ غلط تھا کہ دہلی کے مسلمان خاندان تیموریہ سے کوئی قلبی علاقہ نہیں رکھتے اور ان کا یہ بھی خیال غلط تھا کہ اگر شاہی خاندان کو شاہی محل سے قطب میں منتقل کر دیا جائے تو مسلمان غیر متاثر رہیں گے لیکن ان پر آفرین ہے کہ انھوں نے باوجود اقتدار، اپنے نظریات سیاسی کو، جب ان سے بالادست ارباب حل وعقد نے اختلاف کیا تو جامۂ عمل نہیں پہنایا، لارڈ کیننگ نے خیال کیا کہ قلعہ کا خاندان تیموریہ کے قبضہ میں رہنا نہایت خطرناک ہے، اسے برطانیہ کے قبضہ میں رہنا چاہیئے جس میں سپاہ اور آلات حرب کا ذخیرہ جمع رہے، چونکہ لارڈ کیننگ کو ہندوستان میں آئے ہوئے ابھی چند ماہ گزرے تھے اور وہ بھی کلکتہ میں، لہٰذا وہ مسلمانان دہلی کے احساسات سے ناواقف تھے، بنابریں اُنھوں نے خیال ظاہر کیا کہ بتدریج دہلی کے "تمسخر بادشاہت" سے تمام اختیارات سلب کر لئے گئے، تو "شاہ" کا لقب بھی چھین کر کیوں نہ خاندان تیموریہ کی شاہانہ عظمت کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اس نے مرزا قریش کی جانشینی کے لئے مجلس ارباب حل وعقد سے

سفارش کی، کاؤنسل نے گورنر جنرل کے مراسلہ پر غور و فکر کرنے کے بعد مفصلہ ذیل ہدایات ارسال کیں۔

(۱) دہلی ایجنٹ کے ذریعہ بادشاہ کو یہ جواب دیا جائے کہ گورنر جنرل مرزا جوان بخت کی جانشینی قبول نہیں کر سکتا۔

(۲) مرزا قریش کو بھی یہ اُمید نہیں رکھنی چاہیئے کہ ان کی جانشینی ان شرائط پر منظور کی جاویگی جن پر مرزا فخر الدین سے معاہدہ ہوا تھا اور یہ کہ مسئلہ جانشینی کے متعلق بادشاہ کی زندگی تک حکومت کے ساتھ کوئی نامہ و پیام نہ ہوگا۔

(۳) بادشاہ کی وفات کے بعد مرزا قریش جانشین ہوں گے، اور ان کے ساتھ وہی شرائط ملحوظ رہیں گی جو فخر الدین کے ساتھ تھیں لیکن انہیں بادشاہ کے لقب کے بجائے "شاہزادہ" کا لقب اختیار کرنا ہوگا، ساتھ ہی یہ بھی تحریری اقرار یا معاہدہ کی صورت میں نہیں پیش کیا جائے، بلکہ یہ کہا جائے کہ حکومت کا یہ ارادہ ہے کہ ایسا ہی ہو۔

(۴) محل کے ان افراد کی ایک فہرست مانگی جائے، جنہیں وظیفہ دیا جاتا ہے، اور یہ کہ وظیفہ کہاں تک محدود رہے گا، بیٹے اور پوتے تک؟ لیکن کسی بادشاہ کے دور کے رشتہ دار اس کے مستحق نہ ہوں گے۔

(۵) مقررہ وظیفہ میں سے پندرہ ہزار سالانہ شاہی خاندان کے وارث کو ملے گا۔

زینت محل کی خفیہ کارروائیاں

بادشاہ اپنی زندگی کی بقیہ گھڑیاں اطمینان

اور امن سے گزار دیتا، لیکن ملکہ زینت محل کی ریشہ دوانی نے اسے بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا اس نے کبھی یہ اُمید منقطع نہیں کی کہ میرا لڑکا دہلی کا بادشاہ ہوگا ایک پردہ حایل تھا وہ موت سے دور ہوگیا دوسرا بھی اسی طرح دور ہوجاویگا اگر حکومت برطانیہ نے جواں بخت کی جانشینی کو تسلیم نہیں کیا تو دوسری زبردست قوتوں سے استمداد کیا جائے، بادشاہ کو اس میں اغماض نہ تھا کہ وہ شاہی محل کو چھوڑ دے اور نہ اسے اپنے جانشین کے فواید سے چنداں دلچسپی تھی، جیسا کہ بادشاہ کے مقدمہ میں حکیم احسان اللہ کی شہادت سے معلوم ہوتا ہے، لیکن زینت محل کی ریشہ دوانیوں نے اُسے روکا، جب فخرالدین نے شاہی محل کو چھوڑ دینے کی شرط پر دستخط کر دیئے تو باوجود اس کے کہ وہ اس "نائب بادشاہ" سے تعرت رکھتی تھی لیکن اُس نے شور وشغب برپا کیا، وہ جانتی تھی کہ فخرالدین کوئی غیر فانی ہستی تو ہے نہیں؛ اس عرصہ میں وہ شاہزادہ جس کے اندر انگریزوں کے خلاف نفرت کا جذبہ پرورش ہورہا تھا، وہ انگریز رعایا کے سامنے بھی یہ کہنے سے باز نہیں آتا تھا کہ میں تھوڑے عرصہ میں انگریز قوم کو اپنے قدموں کے سامنے جُھکا ہوا دیکھوں گا، مسز فلیمنگ ایک انگریز سرجنٹ کی بیوی قلعہ میں گئی تھی، اُس کی لڑکی مسز ایسکلی بھی اس کے ساتھ تھی جواں بخت نے اس لڑکی کے سامنے بھی انگریزوں کے مقابلہ میں اپنی فتح و نصرت کا نغمہ گایا لڑکی نے ماں سے شکایت کی کہ یہ نوعمر بدمعاش اس قسم کے خیالات ظاہر کرتا ہے اس پر انگریز خاتون نے کہا کہ اگر تمہارے خیالات ایسے ہیں تو سب سے پہلے تمہاری گردن ماری جاویگی، شاہزادہ جواں بخت اس قسم کے خیالات اکثر عورتوں کی

محلوں میں ظاہر کیا کرتا تھا، اور جب سرجنٹ کی بیوی نے خشمگیں لہجہ میں اسے یہ جواب دیا تو کہنے لگا کہ اہل ایران آرہے ہیں ماں بیٹی کو ہم لوگ قلعہ میں پناہ دینگے، اور اسی طرح اکثر باتیں بنا دیا کرتا محلسرا میں اسے اپنی ماں سے یہی تعلیم مل رہی تھی، اور انھیں احساسات کے ساتھ نشو ونما پا رہا تھا۔

ہر چند دہلی یا اس کے باہر مسلمانوں کو اس سے دلچسپی نہیں تھی کہ کون شاہزادہ جانشین ہوگا لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اہل محل کی پیہم کوششیں جاری تھیں کہ مسلمانوں میں یہ خیال پیدا کریں کہ عالم غیب سے کوئی ایسا آدمی پیدا ہونے والا ہے، جو خاندان دہلی کی زوال پذیر حکومت کو پھر برسر عروج لا دیگا، اور ہندوستان کے مسلمانوں کو پھر وہ دولت اور عزت حاصل ہوگی جس سے انگریزوں کے غصب کے باعث وہ محروم ہو گئے ہیں۔

احساسات دہلی دہلی میں اخبارات نے پیشین گوئی کرنی شروع کی کہ ایک بہت بڑا انقلاب رونما ہونے والا ہے جس سے انگریزی سیاسیات کو نقصان پہونچے گا، اہل فارس ہندوستان پر حملہ آور ہوں گے، ایک مرتبہ شور ہوا کہ ایرانی اٹک تک آچکے ہیں دوسری خبر یہ پھیلی کہ ایرانی فوج درہ بولن کو طے کرتی ہوئی آرہی ہے، اور اس حملہ کی توجیہ یہ کی گئی کہ شاہ فارس پانچ پشت سے فوج اور سامان حرب جمع کر رہا تھا تاکہ ہندوستان کو فتح کرے زار روس شاہ کا ساتھ دے گا اور تقریباً پچاس ہزار روسی فوج مع سامان حرب اہل فارس کی مدد کے لئے پہونچ گئی ہے، اور اگر یہ فوج کافی نہیں ثابت ہوئی تو روس سے مزید کمک آ دیگی، اس صورت حال میں، ترکی، اور فرانس کا طرز عمل ظاہر ہے، وہ بھی

شاہ کا ساتھ دینگے، بعض اخبارات کا یہ نظریہ تھا کہ دوست محمد خاں امیر کابل ہرچند انگریزوں کا وظیفہ خوار اور ظاہری دوست ہے، لیکن وہ بھی دونوں طریق عمل اختیار کریگا کفار سے معرکہ آرائی اور فارس کے ساتھ قسمت آزمائی۔ بازار، گلی کوچہ دوکان اور شاہی محل تمام مقامات میں ایک سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ شہر ہیبت و استعجاب کا ایک مجسمہ بنا ہوا تھا اور شاہ نعمت اللہؒ کی اس پیشین گوئی نے اور بھی اس سنسنی خیز خبر کو مستحکم کر دیا تھا کہ ایک سو برس کے بعد انگریزوں کو زوال ہوگا اور ایک مقامی خاندان برسر اقتدار ہووے گا۔

بادشاہ اور شاہ فارس کے سیاسی تعلقات کے متعلق ایک مقامی نامہ نگار نے مارچ ۱۸۵۷ء میں شمالی مغربی صوبجات کے لفٹنٹ گورنر کو اطلاع دی کہ شاہی محل اور خصوصیت کے ساتھ بادشاہ کے خاص کمروں میں، شبانہ روز اہل فارس کی آمد کا چرچا رہتا ہے حسن عسکری نامی ایک شخص تھا اس کے خاندان میں پیری مریدی کا سلسلہ تھا، شاہی محل کے دہلی دروازہ کے نزدیک اُس کا مکان تھا۔ ایرانی حکومت کے ساتھ سیاسی تعلق کرنے کے لئے یہ شخص ہمیشہ مستعد رہا کرتا تھا اس نے بادشاہ کو متاثر کر لیا کہ اسے کشف کے ذریعہ معلوم ہوا ہے کہ ایرانی حکومت، دہلی بلکہ تمام ہندوستان میں وسیع ہو جائیگی اور دہلی کی بادشاہت کو از سر نو عروج ہوگا کیونکہ شاہ فارس پھر دہلی حکومت کو تاج و تخت عطا کر دیگا، تمام اہل محل خصوصیت کے ساتھ بادشاہ بہت مسرور ہیں یہاں تک کہ اس کے لئے نماز پڑھی جاتی ہے حسن عسکری غروب آفتاب سے ڈیڑھ گھنٹہ قبل روزانہ "عمل" (ریاضت) کیا کرتا ہے تاکہ اہل فارس جلد آویں اور انگریزوں کو نکالیں۔ لفٹنٹ گورنر جنرل کالون نے جب یہ خط پڑھا

تو مضحکہ اور حقارت سے دیکھ کر بے توجہی کے ساتھ اُسے ڈال دیا اُس نے واقعہ کی اہمیت پر نظر نہیں ڈالی، ہر چند شاہ فارس کے ساتھ شاہ دہلی کا سیاسی تعلق ہو یا نہ ہو شمالی ہند کے مسلمانوں کا خیال تھا کہ یہ خبر صحیح ہے، لیکن اس خبر سے عام باشندوں میں جو بےچینی اور احساس پیدا ہو رہا تھا وہ نہایت اہم تھا انگریز مدبرین کا یہ نقص تھا کہ وہ اپنے اندر ان لوگوں کے وجدان کا صحیح اندازہ لگانے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے، جو ان کے ارد گرد رہتے تھے بادشاہ اور شاہ فارس کے نامہ و پیام کا قصہ محض کہانی نہیں تھا، ہر چند اس کے متعلق صحیح واقعات نہیں ملتے کہ کوئی صحیح نتیجہ نکالا جا سکے لیکن بہادر شاہ کے مقدمہ میں جو گواہ گزرے ان میں سب سے معتبر گواہ احسان اللہ شاہی حکیم کی روایت یہ ہے کہ بادشاہ نے خواہ اپنے ذاتی خیال کی بنا پر یا اپنے بعض رشتہ داروں کی تحریک سے جو اودھ میں سکونت رکھتے تھے، شیعہ مذہب اختیار کرنا چاہا مرزا حیدر، جو بادشاہ کا بھتیجہ، اور اودھ میں سکونت رکھتا تھا دہلی میں آیا اور جب واپس گیا تو یہ خبر شائع کی کہ بہت تغیر ہو گیا ہے، مغل بھی شیعہ مذہب اختیار کرنا چاہتے ہیں ممکن ہے بادشاہ کو یہ ترغیب دی گئی ہو کہ ان کے تبدیل مذہب کی خبر سے بادشاہ اودھ اور شاہ فارس اور بھی برضا و رغبت مدد کرینگے چونکہ بادشاہ جانشینی کے متعلق اپنی بیوی کی خواہش پوری نہیں کر سکتا تھا لہذا ممکن ہے اس نے یہ پہلو اختیار کیا ہو کہا جاتا ہے کہ اس نے شاہ فارس کو اپنے معتبر کارپردازوں کے ذریعہ خطوط لکھے، شبہ ہے کہ اس نے زار روس کو بھی خطوط لکھے لیکن یہ پہنچے نہیں

اسی طرح ایک دن دہلی جامع مسجد کے دروازہ پر ایک اشتہار چسپاں تھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ شاہ فارس نے مسلمانان ہند کو خطاب کیا ہے کہ ایک ایرانی فوج آرہی ہے، اور

ہندوستان کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس فوج سے بازو ملا کر کفار کے مقابلہ میں جنگ کریں معلن کا نام محمد صادق تھا لیکن پتہ نہیں لگا کہ یہ محمد صادق ہے کون شخص عوام پر اسکا کوئی اثر نہ ہوا کیونکہ چسپاں ہونے کے چند ساعت کے بعد پھاڑ دیا گیا، لیکن مقامی اخباروں نے اس اشتہار کا خلاصہ شائع کردیا، بہادر شاہ نے ابتدائے موسم بہار ۱۸۵۷ء میں کوئی عملی قدم نہیں اُٹھایا، بلکہ ان کے نام سے لوگوں نے شور و فتنہ بپا کیا جس کا خمیازہ اُنھیں اُٹھانا پڑا، مئی ۱۸۵۷ء میں میرٹھ کے اندر سپاہیوں میں بڑا جوش و خروش پیدا ہوا اور دہلی کے ملکی افسروں کو دعوت دی گئی کہ وہ آنے والی کشمکش میں حصہ لیں۔

اس کے بعد سیاسیات ہند میں وہ نازک حالتیں پیدا ہوگئیں جنھوں نے مغل خاندان کو ,,قلب،، کی بجائے ہندوستان کے مختلف مقامات میں ,,جزاءُ منتشر،، بنا دیا، اور اب نہ تو شاہی محل کے خالی کرنے کا کوئی سوال باقی رہا اور نہ کسی شاہزادہ سے ,,شاہ،، کے ترک لقب کے لئے عہد نامہ کی ضرورت، خاندان مغل کا یہ بدقسمت فرمانروا ایک مجرم کی حیثیت سے برطانوی عدالت میں پیش ہوا، اور اُسے رنگون میں زندگی کی بقیہ تکلیف دہ ساعتیں تمام کرنی پڑیں، غالب مرحوم اُس وقت زندہ تھے غالباً طلسم ہستی کے اسی دردانگیز منظر کو دیکھ کر اُنھوں نے کہا تھا ؎

شمع بجھتی ہے تو اُس میں سے دھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

دولتِ خلجیہ کا آخری نظّارہ

عہد شباب کی معصیت کوشیاں، پیری کی بیچارگی و ناتوانی، صحت کی عشرت پسندیاں، مرض کی درماندگی، امیری کا نشہ، غریبی کی حسرتیں، جاہ و مراتب کا غرہ، حقارت و ذلت کا ملال، الغرض دورِ حیات کے تمام مراتب ایک چیستاں بن کر رہ جاتے ہیں اور دنیا کا ہر ذوق سلیم رکھنے والا دماغ اس کارگاہ ہستی کے مختلف اور متضاد نمایش صناعانہ پر غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ہے، کہ آیا زندگی کا تعمیری پہلو بہتر اور خوشگوار ہے، یا تخریبی؟ انسان کی تمدنی روش، معاشرانہ نظام، اور پرستارانہ طلب و جستجو سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا کا تمام ظاہری سامان نشاط اور ان کا حصول ہی زندگی کا نصب العین ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس طرح حیات کا "تعمیری پہلو" اپنے اندر جاذبیت کا سامان رکھتا ہے، اس سے "تخریبی پہلو" کسی طرح کم نہیں، فرق صرف یہ ہے کہ پہلا عوام کو دھوکے میں ڈالتا ہے اور دوسرا خاص کو حقیقت تک پہنچاتا ہے۔ صوفی ادبیات دیکھئے، زوال دول کے افسانے پڑھئے، جانے دیجئے، ان دونوں کو، ہر ترقی کے آخری نتیجہ، اور نشو و ارتقا کے آخری مرحلے پر غور کیجئے، جمالیات کو شباب تک محدود نہ رکھئے، بلکہ اسے آخری منزل میں مشاہدہ کیجئے جہاں نا حقیقت

شناس افراد "لذت نظر" کو "جراحت ہستی" بنا کر چھوڑ دیتے ہیں، اور ان کا تمام نالۂ و بکا ان کی تمام وارفتگی ذخیرۂ سہری، ان کا تمام جوش و ولولہ صرف زحمت تسبیح و مرقع کھینچنے والے اور بے اثر طریق طلب کے لئے وقف ہو جاتا ہے، اگر جمالیات کا وجود ہے تو اسے صرف جسم و مادہ ہی تک کیوں محدود رکھا جائے؟ یا پھر ہم اسے ظاہری خط و خال اور عامیانہ لطافت و پاکیزگی کیوں سمجھیں؟ کیوں نہیں رومی کی طرح مادہ اور جسمانیات کی دنیا سے ایک بلند تر سطح پر پہنچکر اس حقیقت کو تسلیم کریں۔

بہ عذار جسم منگر کہ بہ بوسد و بریزد　　　بہ عذار جاں نگر کہ خوش و خوشگوار بادا

جب ہر ترقی کا آخری نتیجہ تنزل ہے، جب نشو و ارتقا کی ایک ایسی منزل بھی ہو جہاں اوراق وجود کا بکھر جانا ناگزیر ہے تو پھر اس چند روزہ لطف کو شباب کی کورانہ فکر و عقاید، اور پیری کے افسردہ ذکر و شغل میں کیوں ضائع کیا جائے، کیوں نہیں ہم ایک تیسرا راستہ قائم کریں جو دونوں سے ممتاز اور شکوۂ "حسرت حاصل" سے پاک ہو تاریخ اور آثار اپنے اوراق میں ایسی بیشمار داستانیں پوشیدہ رکھتے ہیں جنھیں پڑھنے کے بعد انسان کی تمام حوصلہ آزمائیاں افسردہ ہو کر رہ جاتی ہیں اور وہ حیات کے اس عجیب و غریب فلسفہ پر غور کرنے لگتا ہے کہ ہر رفعت پستی کی طرف کیوں آتی ہے، ہر عروج کو زوال کیوں ہوا کرتا ہے؟ مانا ایک قوم فلسفہ حیات کی گہرائیوں تک نہیں پہنچتی، یہ اس کی لاعلمی اور ناتجربہ کاری تھی، لیکن جب دوسروں کے اسباب زوال میرے پیش نظر ہوتے ہیں تو ہم متنبہ کیوں نہیں ہوتے؟ ہم بے اختیارانہ نکبت کی طرف کیوں کھینچے

چلے جاتے ہیں، یہ خیالات ہیں جو قدرتی طور پر حکومتوں کے قیام و انحطاط، اور خاندانوں کے بننے بگڑنے کا حسرت انداز نظارہ کرنے کے بعد دماغ میں پیدا ہوتے ہیں اور دور دور رقت کی پذیرائی میں انسان مادیات کی دُنیا سے ایسی بلند روحانی سطح پر پہنچ جاتا ہے، جہاں وہ ایک فلسفی کی طرح اپنی خودی اور انانیت (Egoism) فراموش کر بیٹھتا ہے، اس کی اُلجھنیں بڑھنے لگتی ہیں، اور شوق جستجو بیتاب ہوجاتا ہے، اب اسکے نزدیک فقر و دولت، ذلت و اعزاز، وصل و فراق، ترقی و تنزل بلکہ موت و حیات میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ آپ ڈاکٹر زکی مبارک کی کتاب "مدامع العشاق" دیکھئے، شعرائے معلقات کی خرابہ نشینوں، اور اُنکی درد پذیریوں کے حالات پڑھئے، آپ عربی شعرا کے "بکار ممالک" کا مطالعہ کیجئے، بحتری چوتھی صدی کا ایک مشہور عربی شاعر ایوان کسریٰ میں پہنچتا ہے، اس کے محراب اور ستونوں کا طواف کرتا ہے، اور کچھ اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ والہانہ انداز میں کہہ بیٹھتا ہے ؎

لَوْ تَرَاہُ عَلِمْتَ اَنَّ اللَّیَالِی جَعَلَتْ فِیْہِ مَاتَمًا بَعْدَ عُرْسِ

(ترجمہ) اگر تم دیکھو تو معلوم ہوگا کہ رات (لیالی) نے اس کے اندر شادی کے بعد ماتم برپا کر رکھا ہے[۱]

۱؎ پہلے میرا خیال تھا کہ خاقانی نے اپنے "ایوان مدائن" کے فاجعہ (Tragedy) میں معلقات سبعہ کے ابتدائی اشعار سے مدد لی ہے (دیکھو نگار بابتہ جولائی ۱۹۳۰ء) لیکن ڈاکٹر زکی مبارک کی جدید تصنیف "موازنہ بین الشعراء" میں بحتری کے وہ تمام عربی اشعار درج ہیں جو ایوان کسریٰ کی تباہی کے متعلق ہیں اسی طرح عہد آخر کے مشہور شاعر شوقی کا "بکار اندلس" بھی نہایت تاثر انگیز ہے (بقیہ نوٹ صفحہ آئندہ پر)

اسی طرح عہد آخری کا ایک مصری شاعر "شوقی" قصر الحمرا کے کھنڈروں میں پہنچا ہے اور اپنی عربی شاعری کے ایک نہایت دلگداز انشا میں قصر شکستہ کے نقوش عبرت پیش کرتا ہے اس کے بعد قصر ویران کے وحوش وطیور، گل ونسرین باغ وحوض کا تذکرہ کرتا ہے، اور رقت آمیز لہجہ میں کہتا ہے ؎

مشت الحادثات فی غرف   الحمرا مشی النعی فی دار عرس

(ترجمہ) قصر حمرا کے بالا خانوں میں حوادث زمانہ اس طرح آئے جس طرح شادی بیاہ کے گھر میں کوئی موت کی خبر آتا ہے۔

اسلامی تاریخ میں یوں تو بہتیرے خاندانوں کے علو وحضیض، استقلال واضمحلال کے دردانگیز واقعات ملتے ہیں یہ ہستی کا زبردست اور ناگزیر کلیہ ہے کہ جو بنا ہے وہ ایک دن

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) البحتری کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ خاقانی نے "معلقات" کی بجائے اسی سے بڑی حد تک استفادہ کیا ہے، ڈاکٹر زکی مبارک نے پُرزور دلیل سے ثابت کیا ہے کہ نزول قرآن کے قبل شعرائے عرب کے خیالات میں درد پذیری یا عبرت آموزی کے جو احساسات ہیں وہ محض فردیت (Individualism) کا نتیجہ ہیں اس وقت تک ان میں اجتماعی محاسن نہیں تھے لیکن قرآن مجید نے مختلف قوموں کی ترقی وتنزل کے عبرت آموز واقعات بتائے۔ اس کے بعد شعرائے عرب کے یہاں "بکا ر ممالک" شاعرانہ خیالات کا موضوع مقرر ہو گیا یوں تو جاہلی شعرا نے بھی اپنے محبوب کے اُجڑے دیار کے خوب خوب نقوش پیش کئے ہیں لیکن اس موضوع کا تعلق اجتماع سے نہیں یہ انفرادی خیالات تھے، چنانچہ جاہلی شعرا کے متعلق ڈاکٹر زکی مبارک لکھتا ہے:۔

کانت عواطف الشعراء عواطف فردیة لا اجتماعية

ضرور بگڑے گا، لیکن جس طرح ترقی کی مختلف صورتیں ہوا کی ہیں اسی طرح تنزل کے بھی علیحدہ اسباب اور بربادی کے مختلف زینے ہوئے ہیں۔ امویوں کی حکومت مشرق میں (۴۱ھ سے ۱۳۲ھ) تقریباً ایک صدی اور ہسپانیہ میں (۱۳۸ھ سے ۴۱۶ھ) تقریباً تین صدیوں تک قائم رہی، لیکن جب بُرے دن آئے تو مشرقی سلطنت کا حکمراں مروان الحمار دشمنوں کے خوف سے بھاگ کر ایک کنشت میں پناہ لیتا ہے، اعدا تعاقب کرتے ہیں اور وہیں اسکا سر کاٹ لیا جاتا ہے۔ ہسپانیہ کی سلطنت طوائف الملوکی خانہ جنگیوں، اور نسلی امتیازات میں ہاتھ سے گئی، اپنے غیر ہوتے گئے، دشمنوں کو زور ملتا گیا: نتیجہ یہ ہوا کہ ساری قوم اس طرح بے عزتی سے نکالی گئی جس طرح دنیا میں مُسلمان کہیں سے نہ نکلے۔ اگر مسلمانوں کی کہیں اجتماعی اور قومی تذلیل ہوئی تو وہ صرف ہسپانیہ ہے، یوں تو دنیا کے مختلف حصوں میں اُنھوں نے حکومتیں قائم کیں، بنے بھی، بگڑے بھی لیکن جمہوریت اسلامیہ اور قومیت مسلمہ کو کوئی عالمگیر نقصان نہ پہنچا زیادہ سے زیادہ ایک برسر اقتدار خاندان برباد ہوا، اُسے اپنی عشرت پسندیوں کا خمیازہ بھگتنا پڑا، لیکن قومیت، اجتماع، اور مذہب کے اعتبار سے مسلمان مفتوح ہو جانے کے بعد بھی اس سرزمین میں عزت کے ساتھ زندگی گذارتے رہے، اسی طرح بنی عباسیہ کو لیجئے تاریخ اسلامیہ کے تمام صفحات کا بغور مطالعہ کر جائیے آپ کو بنی عباسیہ کی طرح مستقل اور طویل زمانہ حکومت کا کہیں نشان نہیں ملیگا اُنھوں نے بغداد میں (۱۳۲ھ سے ۶۵۶ھ) پانچ صدیوں تک قاہرہ میں دو صدیوں کر زیادہ حکومت کی، لیکن جب ان کا زمانہ ادبار آیا، تو خدا نے مغلوں کو ان پر مسلط کیا، اُنھوں

نے اپنی ہیبت اور دحشت، اپنے اندھے جوش اور فتح اور بڑھتے ہوئے حوصلہ غارتگری میں خاندان عباسیہ کو جس طرح برباد کیا اُسے پڑھ کر تاریخ کا مطالعہ کرنے والے آج بھی نہایت متاثر ہوتے ہیں۔ ہلاکو باوجود عہد امان خاندان عباسیہ کے اس آخری نام لیوا خلیفہ المعتصم اور اس کے عزیزوں کو قتل کر دیتا ہے، تمدنی لطائف اور علمی کارنامے برباد ہوتے ہیں، دریائے دجلہ کوسوں تک نوع انسانی کے خون سے رنگین ہوجاتا ہے، علمائے یونان، اسکندریہ وعرب کی تحقیقات یا تو دریا کی نذر ہوتے ہیں، یا شعلہ ملتہب کی، بنی فاطمہ اُٹھے اُنھوں نے بھی (۲۹۷ھ سے ۵۵۵ھ) ڈھائی سو صدیوں تک حکومت کی، وہ بھی مٹ گئے۔ آل سامان (۲۶۱ھ سے ۳۹۵ھ) نے ۱۳۴ سال اور غزنوی خاندان نے ۳۶۶ھ سے ۵۵۵ھ تک حکومت کی لیکن غوریوں کا دور دورہ شروع ہوا تو انھیں ان کے لئے حکومت سے دست بردار ہونا پڑا، ہندوستان میں ۵۸۹ھ سے ۱۲۵۳ھ (عہد ظفر) ۶۶۴ سال تک غلام، خلجی، تغلق، سیّد، لودھی، سور، مغل، سات خاندانوں نے حکومت کی، اس میں شک نہیں سات سو سال کے اس طویل زمانے میں، ہندوستان کی اسلامی حکومتوں میں بہت سے انقلابات ہوتے رہے، تیمور کا طنطنہ اسکندری، نادر شاہ کا فاتحہ سیلاب، احمد شاہ ابدالی کے حوصلے، اپنے اپنے زمانہ میں تمدن اور انسانیت کو تہ بالا کر نسیاً منسیاً ہوگئے، ایک خاندان نے دوسرے خاندان کے دامن تربیت میں جوان ہو کر اخلاق اور انسانیت کا جو خون کیا ہے تاریخ کا کوئی نادر واقعہ نہیں، اس میں شک نہیں حکومت مغلیہ کی بربادی سے ہندوستان کے مسلمان بہت

زیادہ متاثر ہوئے اور ابھی صدیاں باقی ہیں، جبکہ یہ جراحت مندمل ہو، لیکن خلجیہ کا عروج وزوال تاریخ کے طالب العلم کے سامنے انقلاب کا ایسا دلگداز نظارہ پیش کرتا ہے کہ جس کی نظیر بہت مشکل سے ملتی ہے۔

میں اس وقت یہ بحث چھیڑنا نہیں چاہتا کہ کن واقعات کے ماتحت جلال الدین خلجی نے غلام خاندان سے حکومت حاصل کی، اور نہ اس وقت خاندان خلجیہ کے اسباب عروج سے بحث کرنا چاہتا ہوں، بلکہ مجھے اپنے موضوع کے لحاظ سے صرف اُنکی حکومت کا وہ آخری منظر پیش کرنا ہے، جو "ان فی ذالک لعبرۃ" بن کر ہستی کا وہ روشن پہلو پیش کرتا ہے، جسے جہالت انسانی اپنی تعبیر ناقص میں افسوس کے ساتھ "زوال" سے موسوم کرتی ہے، حالانکہ میرے نزدیک یہ ہر کمال کا التزامی اور آخری نتیجہ ہے، اقبال کی یاوری اور بخت کی نگونساری دریا کے مدوجزر سے زیادہ اصلیت نہیں رکھتی، ہر فرد ہر خاندان اور ہر قوم کی زندگی دریا کی ایک لہر ہے، ترقی کو "مد" کہہ لیجئے "تنزل" کو جزر سمجھئے، اگر آپ دولت وحکمت رکھتے ہیں، اگر آپ میں حسن وجمال اور زور وتوانائی ہے، تو نشہ میں نہ آیئے یاد کیجئے اُس ساعت کو جبکہ زندگی کی اس بڑھتی ہوئی لہر (مد) میں رجعت (جزر) ہوگی، اور آپ کو دولت کی بجائے فقر، حسن کی جگہ بے رونقی اور طاقت کے بدلے ضعف ونقاہت گھیر لے گی، وجوہ یومئذ باسرۃ ہ تظن ان یفعل بھا فاقرۃ (بعض چہرے اس دن بے رونق ہوں گے گمان کرینگے کہ ان کے ساتھ کمر توڑنے والا معاملہ ہوگا) دولت خلجیہ کی بنیاد ہی اُس وقت پڑی تھی جبکہ اسکے بانیوں

کو اس حقیقت سے بالکل بے حسی تھی سنہ ۶۸۹ھ سے سنہ ۷۲۱ھ تک خلجیہ کی حکومت رہی، تقریبًا ۳۲ سال کے اس قلیل عرصہ میں اُنھوں نے عروج وزوال کے وہ تماشے دیکھے کہ شاید اس کی مثال تاریخ میں مشکل سے ملیگی، کہاں علاؤالدین کی وہ سکندرانہ اولوالعزمی، وہ جلالت وسطوت، وہ فتح وظفر کہاں، اس کے دوسرے جانشین مبارک شاہ کی بربادی ناموس اور بے یارومددگار ہوکر خسرو خاں جیسے ایک درباری کے ہاتھ سے قتل ہونا، اللہ اللہ، اس زمانہ ناسازگار پر کیا اعتماد کیا جائے اہل دنیا جو چاہیں اپنی جگہ فیصلہ کریں لیکن قدرت نے خلجیہ کے ساتھ انتقام لینے میں جس حوصلہ سے کام لیا ہے، وہ تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے سبق آموز ہے۔

دولت خلجیہ کا بانی جلال الدین خلجی، سلطان علاؤالدین کا حقیقی چچا تھا، اس نے بھتیجہ سے اپنی لڑکی بھی بیاہ دی تھی، اس پر سلطان اپنی خاص نظر الطاف رکھتا تھا، لیکن جس جبلی دنارت سے کام لے کر علاؤالدین نے اپنے محسن نیک خصال اور محسن چچا کو مار ڈالا تاریخ کا بچہ بچہ جانتا ہے، بادشاہ کے مرنے کے بعد ملکہ جہاں نے اپنے چھوٹے لڑکے رکن الدین ابراہیم کو تخت پر بٹھادیا، مرحوم سلطان کا بڑا لڑکا ارکلیخاں جو سخاوت اور شجاعت میں مشہور تھا اور رعایا بھی اس کی گرویدہ تھی، اس وقت ملتان میں تھا اگر ملکہ جہاں بادشاہت کے لئے ارکلیخاں کا انتخاب کرتی تو یقینًا علاؤالدین کو حصول تخت میں دقتیں لاحق ہوتیں، آخرکار علاءالدین اپنی سیاسی قابلیتوں، اور حربی خصوصیات کی بدولت دہلی پر حملہ کرکے تخت نشین ہوا، اور پھر خاندان جلالی کے ساتھ جو کچھ کیا اس سے جہالت اور

بہیمیت شرما گئی۔

ملک نصرت خاں کوتوال کہ از دہلی تعین شدہ بود بہ الماس بیگ الغخاں رسیدہ درچشم پسران بادشاہ جلال الدین، فیروز شاہ خلجی، والغوخان نبیرۂ چنگیز خاں کہ داماد جلال الدین فیروز شاہ بود و ملک احمد حبیب کہ نائب امیر حاجب شدہ بود میل کشیدہ حشم و اموال ایشاں را متصرف گشت و آں ہر دو شاہزادہ مظلوم را در قلعہ ہانسی محبوس ساختہ، دو پسران ارکلیخاں را شہید گردانید، ملک احمد حبیب مکحول و حرمہائے سلطان فیروز شاہ خلجی و حرمہائے پسران او را، مع ملکہ جہاں بر دہلی آوردہ در حبس نگاہ داشتند۔

وہ چچا جس نے محبت سے آغوش میں پالا، لڑکی دی، شوکت و عزّت کا شاہی سامان عنایت کیا...... اُسے ایک احسان فراموش بھتیجہ نہایت بیرحمی کے ساتھ اپنی حصول اغراض کے نشہ میں جان سے مار ڈالتا ہے، یہی نہیں اس کے دو نور نظر ارکلیخاں اور سلطان رکن الدین، اور ایک داماد الغوخاں کو اندھا کر کے قید کر دیتا ہے، اس کے دو معصوم پوتوں کو اندھا کر کے شہید کر ڈالتا ہے، اور اس خاندان کی تمام عورتوں کو داغ بیوگی دیکر دہلی میں مقید رکھتا ہے .... یہ تھیں سلطان علاؤالدین کی وہ ظالمانہ کارروائیاں وہ بہیمیہ اقدام، وہ وحشیانہ احسان فراموشی، جنھوں نے آسمان و زمین کو ہلا دیا، جن سے انسانی قلوب بیتاب ہو گئے اور آخر کار قدرت مجبور ہوئی کہ اُس کے خاندان سے بھی ایسا ہی سخت بدلہ لے جو دنیا کے لئے موجب عبرت ہو، اس میں شک نہیں افغانی سلاطین دہلی میں

علاؤ الدین سب سے زبردست اور ماہر سیاسیات بادشاہ گزرا ہے، جاہل تھا لیکن سیاسیات مدن میں اسے یہ طولیٰ حاصل تھا حربی خصوصیات، اور فاتحانہ جوش و اقدام میں تو اسے سکندر ثانی تسلیم ہی کیا جاتا ہے، اس کی بیس سالہ (۶۹۶ھ سے ۷۱۶ھ) حکومت ایسے استقلال اور رُعب و داب کے ساتھ گزری کہ اس کے جانشین اگر صاحب اہلیت ہوتے تو یقیناً ہندوستان کی تاریخ میں افغانی عہد کو دوسرے عنوان کے ماتحت لکھا جاتا، لیکن قدرت کو ظلم اور غداری کا بدلہ لینا تھا خود علاؤ الدین اپنی حکومت کے آخری زمانہ میں اپنا مدبرانہ طرز عمل کھو بیٹھا، اس نے اپنے ایک درباری ملک نائب کو حضرت عثمان غنیؓ کے مروان کی طرح حکومت کا تمام نظم و نسق سپرد کر دیا، اس پر اس قدر اعتماد کرتا کہ جو امور سیاسیات کے منافی ہوں ان سے بھی کبھی اختلاف نہ کرتا، دوسری غلطی یہ کی کہ اپنے بیٹوں کو تربیت اور تکمیل تعلیم کے قبل حرم سرا سے نکال کر دربار میں داخل کیا: نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہوا پرستی اور لہو و لعب میں لگ گئے، اس اثنا میں صحبت نسواں اور گُل چینی جمال کے باعث سلطان کو ایک سخت مرض لاحق ہو گیا، اس کی بیوی ملکہ جہاں اور خضر خاں اس وقت جشن اور تفریحات میں مشغول تھے، اور بادشاہ کی تیمارداری میں کوئی سرگرمی نہیں کرتے، چنانچہ تاریخ میں ہے۔

چوں خضر خاں و ملکہ جہاں دراں ایام بہ جشن و طربہائے غیر مکرر مشغول بودہ بہ معالجہ و مداوای اونمی پرداختند بادشاہ عدم صحت را از بے پروائی ایشان دانستہ از تہ دل رنجید، واز ایشان ہر روز زیادہ ئے چند سرمی زد کہ رنجش بادشاہ د

بدگمانی او زیادہ می شد، چہ کہ خضر خان بجز مجلس آراستن و شراب خوردن و
ساز و نغمہ شنیدن و چوگان باختن، و فیل بہ جنگ انداختن کارے دیگر نداشت
و مادرش ہم بغیر از جشن نمودن و عروس فرزند زادہا کردن و سر تراشی و ختنہ بہ ہیچ
امرے نمی پرداخت و چیزے کہ بہ خاطر ایشاں نمی رسید بادشاہ علاؤالدین
و بیماری او بود۔

یہ تھا قدرتی انتقام کا پہلا زینہ! بادشاہت قائم ہے، اولاد موجود ہے، بیوی زندہ ہے، آپ سخت بیمار ہیں لیکن کوئی توجہ بھی نہیں کرتا۔ لطف یہ ہے کہ سب جشن منا رہے ہیں بادشاہ نے خلوت میں ملک نائب سے بیوی اور اولاد کی شکایت کی، ملک نائب تو ہمیشہ ملکہ جہاں اور خضر خاں سے متوہم رہا کرتا تھا اُس نے موقعہ پاکر عرض کیا کہ یہ لوگ اور الغ خاں بادشاہ کو دفع کرنے میں متفق اور اعلیٰ حضرت کی موت کے متمنی ہیں، اس عرصہ میں ملکہ جہاں نے الغ خاں کی لڑکی سے اپنے لڑکے شادی خاں کے بیاہنے کی اجازت چاہی، ملک نائب نے پھر بادشاہ کو متوحش خبریں سنائیں۔ سلطان نے بر بنائے احتیاط خضر خاں کو سیر و شکار کے لئے امروہہ جانے کی اجازت دی اور کہا کہ جب صحت ہو جاوے گی تمہیں بلاؤں گا خضر خاں نے منت مانی کہ سلطان کو صحت ہو جاویگی تو امروہہ سے پاپیادہ مشائخ دہلی کی زیارت کے لئے آؤں گا چنانچہ جب بادشاہ کو صحت ہوئی تو بلا اجازت اپنے خاص لشکر کے ساتھ پیادہ ننگے پاؤں امروہہ سے دہلی آیا، ملک نائب نے پھر بادشاہ کو خضر خاں سے بدگمان کیا کہ شاہزادہ صاحب خیال فاسد لے کر آئے ہیں لیکن بادشاہ نے بدگمانی کے بجائے اُس کے

سر آنکھوں کو بوسہ دیا اور محل میں جانے کی رخصت دی، عشرت پسند طبیعتیں بھی کہیں باز آتی ہیں چند روز کے بعد پھر اسی طرح امور جہاں بانی کو نباہ نہ سکا اور لہو و لعب میں مشغول ہو گیا ملک نائب نے پھر شکایت کی کہ خضر خاں فلاں فلاں کے اتفاق سے حضور کی جان لینا چاہتا ہے اور اپنے دعوی میں غلاموں اور خواجہ سراؤں کی شہادتیں بھی پیش کیں اور کسی طرح خضر خاں اور شادی خاں کی قید کا حکم لے کر انھیں قلعہ گوالیار میں بھیجدیا، ملکہ جہاں کو محل سے نکال کر پرانی دہلی میں محبوس کیا۔ خضر خاں کے خالو الغ خاں اور اس کے بھائی نظام الدین کو قتل کرادیا، ان خانگی فتنہ سازیوں سے اغیار کو موقعہ ملا، گجرات، دکن اور راجپوتانہ میں بغاوت اور بدامنی ہونے لگی، آخر کار بادشاہ کا مرض بڑھتا گیا، کوئی دوا موثر نہیں ہوتی تھی، اسی غم و غصہ میں ۶ شوال سنہ ۷۱۶ھ کی رات کو اس نے ہمیشہ کیلئے آنکھیں بند کرلیں

میں یہاں سلطان علاؤالدین کے خزانہ اور خدم و حشم کا کوئی تفصیلی تذکرہ کرنا نہیں چاہتا، اقبال نے ہمیشہ اس کا ساتھ دیا لیکن اس کی آخری زندگی سخت غم و غصہ میں بسر ہوئی۔ اس کی حیات میں چھوٹی بڑی ۸۴ لڑائیاں ہوئیں اور سبھوں میں فتح و ظفر اس کے شامل حال رہا، صاحب تاریخ فرشتہ لکھتے ہیں :-

شوکت او ازیں تصور نمایند کہ ہفتاد ہزار شاگرد پیشہ داشت از انجملہ ہفت ہزار معمار و بیلدار و گلکار بودند، و عمارتے کہ از آں بزرگ تر نباشد چوں طرح می کرد، در دو ہفتہ بہ اتمام می رسانیدند و عمارتہائے خورد در سہ روز بہ اتمام می رسید و انا آں موعد کہ سلطان حکم می کرد، قدرت آں نہ داشتند

کہ تجاوز نمایند و اولین کسے است کہ عماری بر پشت فیل نہادہ سواری فرمود

دولت اور خدم و حشم اس قدر تھا کہ سلطان محمود غزنوی کو بھی میسر نہ ہوا تھا لیکن جب زندگی کی آخری گھڑیاں آئیں تو مرض کی مصیبت اٹھاتا رہا، بیٹوں کو جیل بھجدیا، بیوی کو اپنے سے جیتے جی جدا کر دیا اور نہایت کلفت اور حزن و ملال کے ساتھ دنیا سے گزر گیا۔ یہ تھا قدرت کا وہ ابتدائی انتقام جو خاندان جلالی کے مٹنے کے بعد علاؤالدین سے لیا گیا۔ لیکن اس کے بعد دولت خلجیہ پر جو آفتیں آئیں، جیسی بربادی ناموس ہوئی، وہ ایسی باتیں نہیں جنھیں پڑھ کر آنسو کے دو قطرے ٹپکائے بغیر کوئی سرسری طور پر گزر جائے۔

علاؤالدین کی وفات (جو ملک نائب کی سازش کا نتیجہ بھی کہی جاتی ہے، چونکہ بعضوں کا شبہ ہے کہ اُس نے سلطان کو زہر دیدیا) کے دوسرے دن ملک نائب نے اہل دربار کے حضور میں ایک شاہی نوشتہ پیش کیا جس کا مضمون یہ تھا کہ ہم نے خضر خاں کو معزول کیا اور اُس کی جگہ شہزادہ شہاب الدین عمر کو اپنا جانشین بنایا۔ اس وقت شاہزادہ کی عمر سات سال کی تھی، خود نائب بن گیا اور اس کی والدہ (حرم سلطان علاء الدین) کے ساتھ شادی کر لی۔ دربار کے ایک شخص ملک سبیل کو باربک کا عہدہ دیکر گوالیار میں بھیجا۔ جس نے سلطان کے دو بیٹوں خضر خان اور شادی خاں کو اندھا کر دیا۔ ملک نائب نے ملکہ جہاں کو قید کیا اور موقعہ کی تاک میں تھا کہ مبارک خاں (بن علاء الدین) کی آنکھوں میں بھی سلائی پھیروا دے۔ ایک مرتبہ قدیم نوکروں کو مخفی طور پر مبارک خاں کے قتل

کرڈالنے پر مستعد کیا لیکن جب وہ مُبارک خاں کے پاس آئے تو حق نمک یاد دلایا اور ایک ہار دے کر اپنی جان بچائی۔ وہ نوکر ہار لئے ہوئے دو نمک حلال درباریوں مبشر و بشیر کی خدمت میں آئے، اور تمام واقعہ بیان کیا اُن کی رگ حمیت جوش میں آئی اور اُنھوں نے ملک نائب نمک حرام کو سلطان علاءالدین کی وفات کے پینتیس دن کے بعد قتل کرڈالا اور مُبارک خاں کو قید سے نکال کر بھائی کا نائب مقرر کیا لیکن قدرت کا غضب ابھی کم نہیں ہوا، ابھی یہ انتقام کا دوسرا زینہ تھا، مبارک خاں اہل دربار کو ملاکر خود بادشاہ بن بیٹھا، اور اپنے بھائی سلطان شہاب الدین عمر کی آنکھوں میں سلائی پھیر دا کر قلعہ گوالیار میں قید کردیا۔ سلطان جلال الدین اور اُس کے خاندان کو جس طرح علاؤالدین نے خراب و برباد کیا اُس سے کہیں زیادہ مصیبتیں خاندان علائی کو پیش آئیں، سلطان کے تینوں بیٹوں خضر خاں، شادی خاں، سلطان شہاب الدین کی آنکھیں نکلوائی گئیں، ملکہ جہاں مقید ہوئیں، حرم سلطانی کو ایک نمک حرام درباری اپنی زوجیت میں لے آیا، اس کے علاوہ خود سلطان نے جس حسرت اور رنج میں آخری دن گزارے سطور بالا سے ثابت ہوچکا۔ اس وقت دہلی میں ایک مجذوب شیخ بشیر دیوانہ تھے ان سے لوگوں نے پوچھا کہ علاؤالدین کے گھرانہ میں یہ آفتیں کیوں بپا ہیں اُنھوں نے جواب دیا اور کیا خوب کہا:۔

چوں علاؤالدین خاندان عم و ولی نعمت خود بر انداخت با او نیز ہمیں معاملہ می رود

مبارک شاہ خاندان خلجیہ کا آخری فرمانروا تھا، اس نے ۷۱۶ھ سے ۷۲۰ھ تک

حکومت کی، جلوس کے بعد اُس نے بہتیرے درباریوں کو نئے نئے خطابات عطا کئے، اُن میں ایک ملک شادی تھا، جسے سلطان علاؤالدین نے پالا تھا، یہ مبارک شاہ کا نائب خاص تھا۔ اس پر زیادہ التفات کی، اور خسرو خاں کا خطاب دیکر ملک شادی (پسر علاؤالدین) اور ملک نائب (نمکحرام) کا تمام مال اُسے دیدیا اور چونکہ اس کا بیحد شیفتہ جمال تھا منصب وزارت بھی اس کے سپرد کر دیا حالانکہ اس میں اس منصب کی مطلق اہلیت نہ تھی، آخر میں یہی خسرو خاں خاندان علائی کے لئے وہ ہوا جو ٹھیک جلال الدین اور اُس کے گھرانہ کے لئے سلطان علاؤالدین ثابت ہوا تھا، اگر انسانی قلوب میں احساس ہے، اگر دیدۂ بصیرت میں مشاہدہ کی استعداد باقی ہے، اگر عبرت اور اثر پذیری کی کیفیات موجود ہیں تو خاندان خلجیہ کے اس عبرت انگیز انقلاب سے سبق لینا چاہیئے۔

پہلے پہل تو مبارک شاہ کی سلطنت نہایت استوار اور زبردست تھی، لیکن آخر میں وہ ایسے ایسے افعال کرنے لگا جو موجب زوال ہو گئے۔ چنانچہ اس نے اپنے خاندان کے طرفداروں کو بے قصور بعض متعصب افراد کی اغوا سے قتل کر ڈالا، حضرت نظام الدین اولیا اللہ جیسے اہل اللہ اور مقدس انسان سے دشمنی رکھنے لگا، اور آپ کی شان میں طعن اور بدزبانیاں کیں، وجہ صرف یہ تھی کہ خضر خاں آپ کا مُرید تھا۔ طرفہ یہ کہ عورتوں کا زیور اور لباس پہن کر عام مجمع میں آتا۔ اور ہزالہ، آبرو باختہ عورتوں کو محل ہزار ستون کے بالائی حصّہ میں طلب کرتا وہ اس کے اشارہ سے اکابر دربار کے ساتھ نامناسب حرکات کرتیں ان کے سامنے ننگی مادرزاد آتیں اور ان کے کپڑوں پر پیشاب کرتیں، بادشاہ کسی مدبر

کی بات نہیں سُنتا تھا۔ اگر کوئی اصلاح دولت کا مشورہ دیتا تو اُسے نہایت ذلیل کرتا اس وجہ سے کسی کو صلاح دینے کی جرأت بھی نہ تھی۔ خسرو خاں پر سلطان عاشق تھا، اُس کا زور روز بروز بڑھتا گیا اور زور کے ساتھ اس کی ہوس پیمائیاں بھی زیادہ ہوتی گئیں، کسی کو یارا نہ تھا کہ خسرو خاں کے خلاف بادشاہ کے حضور میں شکایت کرے، اور کسی کی شامت آئی تو اُسے شکایت کا نہایت بُرا خمیازہ بھگتنا پڑا، ادھر خسرو خاں نے اپنی جمعیت درست کرنی شروع کی، دکن کے ایک ہندو خاندان سے اس کا تعلق تھا بادشاہ کی اجازت سے اُس نے اپنی قوم کے آدمیوں کو نوکر رکھنا شروع کیا، اور ایک خاص لشکر تیار کر لیا، بادشاہ تو اس کا شیدائے جمال تھا اُسے اُس کے خلاف کوئی اندیشہ ہی نہیں ہو سکتا تھا، خسرو خاں نے اپنی خنونت، اپنے دلربایانہ انداز، اپنی رعنائیوں اور عشوہ فروشیوں سے سلطان کے دل میں ایسی جگہ کر لی تھی کہ وہ جو کہتا سلطان پورا کر دیتا۔ اب خسرو خاں کی ہوس جادۂ اعتدال سے گزرنے لگی۔ اُسنے سلطان کے قتل کی سازش کی، تاج و تخت کے حصول کا خیال باندھا، ہواخواہوں نے بادشاہ کو خبر پہنچائی لیکن خسرو خاں نے اپنی نسائیت نما اداؤں سے حریم عشوہ و ناز میں بیٹھ کر، عورتوں کی طرح رو رو کر سلطان پر اپنی معصومیت ثابت کی، بھلا ایک حسین اور شگفتہ صورت محبوب، خلوت کی صحبتیں، نیاز کے جذبات، ایسی باتیں نہ تھیں جو سلطان جیسے بدچلن اور نادان آدمی کو مسحور نہ کر لیتیں ہواخواہان دولت کو جب خسرو خاں کے خلاف شکوہ کرنے کا بُرا نتیجہ اُٹھانا پڑا تو اُنھوں نے بالکل چشم پوشی کر لی، قاضی ضیاء الدین تنہائی میں ابھی سلطان کو خسرو خاں کے فاسد

ارادہ سے مطلع کر کے جاتے ہیں کہ یکایک یہ فتنہ روزگار آتا ہے، اور تنہا ایک معشوقانہ انداز میں پہلوئے سلطانی میں عورتوں کے مثل ساتوں سنگار کئے ہوئے بیٹھ جاتا ہے چنانچہ تاریخ نے خسرو خاں کی رعنائیوں اور سلطان کی ہوس رانیوں کا عجیب وغریب واقعہ نہیں بھلایا۔ فرشتہ میں ہے۔

ہماں لحظہ کہ خسرو خاں خود را ہمچوں زناں ہر ہفت کردہ وآراستہ از در درآمد سلطان .... از گردراہ در آغوش کشیدہ آنچہ قاضی گفتہ بود اندکور ساخت، اشک بہ رخسارہ رواں کردہ گفت چوں بادشاہ را بہ حال من لطف بسیار است وزیادہ از حد ونہایت است تمام مردمی بہ قصد قتل من برخاستہ اند وتامرا بہ کشتن نہ دہند ازپا نہ خواہند نشست، پادشاہ را از گریہ او دل بہ درد آمدہ او را درکنار گرفت وبوسہ بر رخسارہ اش دادہ، گفت خاطر جمع دار کہ یک موئے سر ترا ہتراز بادشاہی خود میدانم چہ جائے آنکہ در خاطر تو دعدغہ بدگویان باشد۔

سیرت انسانی کا یہ تاریک پہلو دیکھنے کے بعد دنیا کو یہ واقعہ سن کر غالباً زیادہ تعجب نہ ہوگا کہ اسی رات کو عین "ہزار ستون"، (کسی محل کا نام تھا) میں خسرو خاں نے مبارک شاہ کا سرتن سے جدا کر لیا اور اس کے بعد اس کی تمام فوج حرم شاہی میں گھس گئی، اور اپنے ولی نعمت کے ساتھ جو کچھ کیا وہ ایسے واقعات ہیں جنھیں دُہرانے سے قبل خود بخود آنکھوں میں پانی بھر آتا ہے۔

خسرو خاں کا بھائی حسام الدین اور چچا جاہر ہندوؤں کے ساتھ حرم میں داخل ہوا سلطان علاؤ الدین کی حرم محترم کو قتل کر ڈالا، سلطان کے تین بیٹوں فرید خاں، علیخاں اور عمر خاں کی جان لی، خسرو خاں نے خود سلطان علاؤ الدین اور سلطان قطب الدین کے کثیر التعداد غلاموں کو قتل کرایا، ان کی عورتیں اور ان کی اولاد ہندوؤں کو عطا کیں، اپنے بھائی کو خانخاناں کا خطاب دے کر سلطان علاؤ الدین کی لڑکی اُسے بخشدی اور سلطان قطب الدین کی بیوی پر خود قابض ہو گیا، اسی طرح سلطان علاؤ الدین اور قطب الدین مبارک شاہ کی بقیہ بیبیاں اور بیٹیاں اپنے آدمیوں کو عطا کیں۔ سلطان کے بھانجے نصرت خاں کو جس نے عرصہ سے درویشی اختیار کرلی تھی مار ڈالا۔ قرآن مجید میں جہاں امم سابقہ کی تباہی کا حال لکھا گیا ہے وہاں اُن کی اُجڑی ہوئی بستیوں کے متعلق ایک نہایت پُر کیف مثال آتی ہے۔ "وکان لم یغنوا فیہا"، یعنی عاد و ثمود، اصحاب مدین وغیرہ کے مساکن اب ایسے ویران نظر آتے ہیں معلوم ہوتا ہے ان میں کبھی آبادی ہی نہ تھی، یہی حال دولت خلجیہ کا ہوا۔ ان کے خاندانی افراد بہت کثیر تعداد میں تھے، اگر باہمی اتفاق کے ساتھ حکومت کرتے تو غالباً اُن کی حکومت صدیوں قائم رہتی لیکن جس طرح جلد بنے تھے جلد بگڑ گئے، خسرو خاں نے چُن چُن کر شاہی خاندان کے افراد کو قتل کر ڈالا، اور دنیا میں شاید اُن کی نسل ہی ختم ہو گئی۔ ہرچند وہ نہ رہے لیکن ان کی تباہی ناموس اور بربادی کا افسانہ رہ گیا۔ حضرت امیر خسرو زندہ تھے، خضر خاں اور وہ دونوں پیر بھائی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے خضر خاں اور دولدی کے۔

عشقیہ حالات پر اپنی مشہور مثنوی "قرآن السعدین" لکھی۔ خضر خاں اور اُس کے بھائی شادی خاں کو تو پہلے ہی سے ملک نائب نے اندھا بنا کر گوالیار میں قید کر دیا تھا۔ مبارک شاہ نے شہاب الدین عمر کو اندھا کیا، اور کچھ دنوں کے بعد تینوں کو قتل کرا دیا، اور خضر خاں کی منکوحہ اور محبوبہ دولدی کو اپنے حرم میں داخل کر لیا، یہ ہوا علاؤالدین کے خاندان کا حشر، غداری اور احسان فراموشی نے آخر رنگ دکھایا۔ بھتیجہ نے چچا اور اُس کے خاندان کو مٹایا، قدرت انتقام پر کمر بستہ ہوئی، بھتیجے کے گھرانے کو خود اُس کے ایک پروردہ (ہندو) غلام سے برباد کرا ڈالا، اولاد کی جان گئی، خواتین کی عزت و ناموس پر دھبہ آیا، نسل منقطع ہو گئی، وہ کل مظالم اور سفاکیاں ہوئیں، جن سے قلوب ہل گئے، غیروں کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں، اور آخر کار ایک فلسفی اس نتیجہ پر پہنچا کہ عروج و زوال محض رسمی اصطلاحات ہیں لیکن لازم و ملزوم، بقا دونوں میں کسی کو نہیں ہم طلسمی پتلے ہیں اس تماشا گاہ ہستی میں اپنا اپنا ایکٹ کر رہے ہیں، دنیا میں بسنے والی قومیں آئیں دہر کی ان بوقلمونیوں کا تماشا دیکھیں، میرا خیال ہے اگر افراد اور اجتماع کے سوانح زندگی اور ان کی جزئیات سے بحث کی جائے۔ تو ایک بڑے سے بڑا انسان ترقی اور تنزّل کے اعتبار سے کسی مفلوک اور پست سے پست آدمی سے بھی زیادہ با اقبال کہلانے کا مستحق نہیں چونکہ میرے نزدیک لذّت و الم کے احساس پر ترقی و تنزّل کی بنیاد قائم ہے، بہت ممکن ہے بہ ظاہر جو اقبال مند نظر آتا ہو فی الواقع وہ پرلے درجہ کا بد نصیب ہو، چونکہ اس میں لذّت احساس مفقود ہے

چونکہ اس کی باطنی زندگی نشاط سے بالکل معرا ہے۔ اسی طرح ایک گدڑی پہننے والا، برہنہ پا برہنہ سر، انسان کسی بادشاہ سے بھی زیادہ خوش نصیب ہو، چونکہ اس کی خلوت گاہ راز میں ایک روح نشاط ہو وہ .... "انہ کان فی اھلہ مسرورا" کا مصداق ٹھیرتے، یہ ہے میرے نزدیک ہستی کا روشن پہلو، اور یہ ہے مساواتِ انسانی اور اطمنان خاطر کا بہترین کُلیہ زندگی ....

عہد طاہریہ کی ایک وفا کیش حسینہ

خلیفہ مامون (۱۹۸ھ و ۲۱۸ھ) کا زمانہ ہے۔ بغداد علوم و معارف کا مرکز بنا ہوا ہے۔ مامون اپنی محفل نشاط میں بیٹھا ہوا مے نوشی کر رہا ہے کہ اس عرصہ میں طاہر ذوالیمین مجلس میں آیا۔ مامون نے ساقی کو اشارہ کیا اس نے چند ساغر طاہر کو پلائے۔ اس عرصہ میں مامون کی آنکھوں سے بے اختیارانہ آنسو بہنے لگے طاہر نے کہا حضور! مشرق سے مغرب تک آپ کے قبضہ میں ہے آپ خود مختار شہنشاہ ہیں آپ کو کون سا غم ہے مامون نے جواب دیا دنیا میں کوئی انسان بے غم نہیں میرے رونے کی ایک خاص وجہ ہے۔ میں اسے ظاہر نہیں کر سکتا کیونکہ اس کا راز افشا کرنا موجب ذلت ہے اسکے بعد مامون پر کچھ ایسی رقت طاری ہوئی کہ طاہر کو دوبارہ سوال کرنے کی ہمت نہ پڑی۔

مجلس سے واپس آنے کے بعد طاہر کو اس کی فکر ہوئی کہ مامون کی گریہ زاری کا راز دریافت کرے۔ حسین خادم خلیفہ کا ساقی تھا۔ طاہر نے اس کے ایک خاص ملازم کو دو لاکھ درم دیا کہ وہ اپنے آقا کے ذریعہ مامون کے رونے کا سبب دریافت کرے۔ دوسرے دن حسین خادم مامون کو شراب پلانے کے لئے آیا۔ خلیفہ نے شراب

طلب کی حسین نے کہا حضور میں شراب اُس وقت نہیں پیش کروں گا جب تک آپ کل کی گریہ وزاری کا سبب نہ بتائیں۔ خلیفہ مامون نے کہا تجھ کو ان باتوں سے کیا سروکار، آخر اس نے اصرار کیا تو مامون نے کہا میں راز بتاتا ہوں لیکن کسی پر ظاہر کروگے تو تمہاری گردن ماردوں گا اس کے بعد فرمایا۔ حسین! میری نظر جب طاہر پر پڑتی ہے۔ تو میرا بھائی امین مجھے یاد آجاتا ہے اس نے کس ذلت سے اُس کو قتل کیا۔ اس یاد سے میں بالکل بے قابو ہو جاتا ہوں۔ حسین نے طاہر کو اس بات سے آگاہ کر دیا۔ طاہر نے احمد بن ابی خالد وزیر کو بلایا کہ وہ اس کو دارالخلافہ سے کہیں دور دراز بھیجدے تاکہ مامون کا سامنا نہ ہو۔ احمد مامون کی خدمت میں آیا اور عرض کیا حضور چند راتوں سے نیند حرام ہے کیونکہ مملکت خراسان کا انتظام اچھا نہیں ہے ترکوں کی فوج نزدیک پڑی ہے۔ عنان جو اس صوبے کا گورنر ہے اس کی پوری حفاظت نہیں کرسکتا۔ خلیفہ نے کہا پھر کیا کرنا چاہیئے۔ وزیر نے موقع پاکر عرض کیا کہ طاہر بن حسین کو اس کا حاکم مقرر کیا جائے۔ چنانچہ مامون نے اجازت دی اور طاہر کو خراسان کی حکومت ملگئی۔

طاہر ایک اولوالعزم افسر تھا۔ بخت نے مساعدت کی، وقت اور ماحول نے اُس کی عوصلہ پیمائیوں کو فروغ دیا اور وہ خراسان کا مطلق العنان بادشاہ بن بیٹھا اس کی وفات کے بعد اس کے خاندان میں طلحہ بن طاہر، عبداللہ بن طاہر، طاہر ثانی بن عبداللہ، محمد بن طاہر ثانی نے ۲۰۹ھ سے ۲۵۹ھ تک حکومت کی۔ اس خاندان

سارے بادشاہ نہایت نیک نفس، رحمدل اور عادل گزرے ہیں۔ محمد بن طاہر ثانی اس خاندان کا آخری بادشاہ تھا جس کو یعقوب لیث صفّار نے قید کر کے خاندان صفاریہ کی بنیاد ڈالی۔

خانوادۂ طاہریہ کی آخری شمع محمد بن طاہر ثانی تخت خراسان پر جلوہ فگن ہے اس کو خبر ملتی ہے کہ نیشاپور میں محمود وراق کے پاس ایک ایسی لونڈی ہے جو حسن بدیع کے ساتھ اخلاق جمیل میں بھی یگانۂ روزگار ہے۔ وہ شعر وادب کا پاکیزہ مذاق رکھتی ہے اور بربط نوازی میں بےمثیل ہے۔ محمد بن طاہر کو غائبانہ اس لونڈی سے محبت ہو گئی اس نے ارادہ کیا کہ لونڈی کو خرید لے۔ ایک بڑی رقم دیکر محمود دراق کے پاس اپنے آدمی بھیجے۔ لیکن محمود خود ہی اس لونڈی پر فریفتہ تھا اس نے اس کو فروخت کرنا پسند نہ کیا۔ اسی طرح کچھ دن گزر گئے، محمود وراق کے پاس جو کچھ مال و زر تھا وہ صرف ہو چکا، آقا اور کنیز دونوں عسرت اور پریشان حالی کے شکار ہوئے مشکلات سے تنگ آکر محمود نے امیر محمد بن طاہر کے پاس پیغام بھیجا کہ میں لونڈی کو بیچنا چاہتا ہوں، امیر محمد ایک مدت سے کشتہ فراق تھا بیحد خوش ہوا اور بہت سی دولت لے کر محمود کے پاس پہونچا، محمود مال لے کر گھر کے اندر آیا اور حسرت کے ساتھ لونڈی سے کہا کہ ہماری فاقہ مستیاں اب روح فرسا ہو گئیں۔ افلاس نے میری جو حالت بنا رکھی ہے وہ اس قدر میرے لئے پریشان کن نہیں لیکن تمہارا خیال ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کو امیر خراسان

محمد بن طاہر کے ہاتھ بیچ ڈالوں وہاں تم شاہی محل میں ملکہ بنو گی، تمہاری مصیبت کے دن ختم ہو جائیں گے۔ میری محبوبہ میرا دل تو نہیں چاہتا کہ تجھ کو اپنے سے جدا کردوں لیکن تیری بے بسی اور بدحالی دیکھی نہیں جاتی جا اُٹھ محل میں جانے کی تیاری کر۔ کنیز نے آقا کی بات سُنی۔ اس کے دل میں ایک ہوک سی اُٹھی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے دست بستہ عرض کیا۔ میرے آقا! مجھے اپنے سے جُدا نہ کیجئے، میں محنت مزدوری کرونگی اور آپ کے اور اپنے لئے کھانے پینے کا انتظام کروں گی۔ کنیز زار زار رو رہی تھی، اور محمود اس کو سمجھا رہا تھا۔ باہر امیر محمد موجود تھا اس نے کنیز کی داستان محبت اپنے کانوں سے سُنی، وہ حد درجہ متاثر ہوا۔ کنیز کے نوامیس جمیل نے اس کو بہت بڑا درس اخلاق دیا اور اس نے محمود کو چار توڑے ہدیۃً عطا کئے، اور لونڈی کو اُسی کے پاس چھوڑ دیا آج ہزار برس سے زیادہ گذر گئے نہ محمود وراق ہے نہ اُسکی شبستان کی وہ مہ پارہ دنیا ان کا افسانہ محبت بھول چکی ہے۔ لیکن امیر محمد کی فیاضی اور اخلاقی عظمت تاریخ کے صفحات میں آج بھی موجود ہے اور ایسی ہزاروں صدیاں گذر جائیں گی لیکن دنیا اپنی فراموشش کاریوں کے باوجود اس روایت کو کبھی دل سے محو نہیں کر سکتی۔

بنی فاطمہ کی سیاسی تحریکیں اور ان کا تاریخی انجام

عہد امویہ و عباسیہ کی داستان خونیں کے چند صفحے

نگار :۔ ہمارے عزیز دوست مولوی عبدالمالک آروی نے جس سوز و درد کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے، اُس سے کس کو ہمدردی نہ ہوگی، لیکن سوال یہ ہے کہ امویہ و عباسیہ کی تمام سختیاں علوئین کے خلاف کیوں تھیں؟ کیا اسلئے تھیں کہ وہ آل رسول و معاذین آل رسول تھے؟ کیا محض اس وجہ سے تھیں کہ بانی اسلام کا خون ان کی رگوں میں دوڑ رہا تھا؟ نہیں، بلکہ یہ مخالفت صرف اس لئے تھی کہ وہ ڈرتے تھے کہیں اُن کی حکومت نہ چھن جائے اور اُن کی سلطنت پر قابض نہ ہو جائیں پھر جب یہ امر مسلم ہے کہ عہد خلافت کے بعد، امیر معاویہ کے عہد سے اسلام میں خالص دنیاوی حکومت شروع ہوگئی تھی اور بنی امیہ و بنی عباس میں جن جن کو خلفاء کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے وہ سب کے سب اُنھیں اصول سیاست کے ماتحت اپنی حکومتوں کو قائم رکھنا چاہتے تھے، جو دنیا کے حکمرانوں نے ہمیشہ اختیار کئے ہیں، تو پھر اُن کے مظالم کا شکوہ کیوں کیا جائے؟

اگر تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ امویہ و عباسیہ نے علوئیین پر ظلم کئے تو یہ بھی ثابت ہے کہ علوئیین نے ہمیشہ در پردہ اپنی کوششوں کو جاری رکھا اور بارہا امویہ و عباسیہ کے خلاف خروج بھی کیا۔ اس لئے اگر امویہ و عباسیہ نے اُن کے ساتھ وہی سلوک کیا جو دنیا کے ارباب حکومت نے ــــــ اپنی سلطنت کے تحفظ کے لئے ہمیشہ کیا ہے اور ہمیشہ کریں گے تو کیا الزام ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر امویہ و عباسیہ اس قدر سختیاں نہ کرتے، اتنی احتیاط سے کام نہ لیتے تو علوئیین کا برسر اقتدار ہو کر حکمراں ہو جانا یقینی تھا اور امویہ و عباسیہ اُسے کس طرح گوارا کرسکتے تھے۔ اگر وہ سمجھتے کہ آل رسول واقعی مستحق خلافت ہیں اور حکومت و سلطنت انھیں کو ملنا چاہیئے تو یہ جھگڑا بڑھتا ہی کیوں ــــ الغرض تمام دنیادی حکومتوں کے قیام کی تاریخ اسی طرح کی خونیں داستانوں سے معمور ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اگر علوئیین برسر حکومت ہوتے تو امویہ و عباسیہ کے ساتھ وہ کوئی دوسرا سلوک کرتے۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ امویہ و عباسیہ اگر واقعی مسلمان ہوتے تو آل رسول کے ساتھ اس قدر بدتمیزی کا سلوک کبھی نہ گوارا کرتے اس پر دونوں جانب سے بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اور اس قسم کے مباحث کو چھیڑنا اب بالکل بیکار ہے جبکہ مسلمانوں سے خلافت و حکومت دونوں چیزیں چھین لی گئی ہیں اور علوئیین و غیر علوئیین سب کے لئے یہ "باب نزاع" الحمد للہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا ہے۔

یہ وقت اس بحث کا نہیں کہ اس سے قبل ہم پر کیا گزر گیا، بلکہ یہ دیکھنے کا ہے کہ آیندہ ہم پر کیا گزرنے والا ہے۔ یعنی اب ضرورت گزشتہ اختلاف کے دُہرانے کی نہیں ہے بلکہ آیندہ کسی ایک امر پر متفق و متحد کر دینے کی ہے۔

بحث و جدل بجائے ماں، میکدہ جوئے کاندراں
کس نفس از جل نزد، کس سخن از فدک نزاند

(نیاز)

ہر انسان پر خواہ وہ زاہد شب زندہ دار ہو، یا رند معصیت کوش زندگی کے بعض ایسے معصوم اور برگزیدہ لمحے بھی گزر جاتے ہیں، جب اشیاء و مناظر کی حقیقت پر بھی اُسے غور کرنا پڑ جاتا ہے پھر اُس کا موضوع فکر کبھی خود اس کی ذات ہوتی ہے اور کبھی ماورائے ذات۔ چنانچہ فلسفہ کے مختلف مذاہب، شاعری کے مختلف اسالیب اخلاقیات و عمرانیات کے مسائل اسی خیال کی تحلیل کا نتیجہ ہیں۔

سب سے پہلے انسان کی نظر زندگی اور اس کی حقیقت پر پڑتی ہے اور اِسی عقدہ کے حل کرنے کے بعد انسان ماورائے ذات کے ساتھ اپنے ربط و علاقہ کی تعیین کرتا ہے۔ حقیقت زندگی کیا ہے؟ اس کے جواب میں خیالات کا ایک عمان بے پایاں سامنے آجاتا ہے، لیکن بےچین قلوب کو نہ افلاطون کے "تصورات" کی موشگافیاں تسکین پہونچا سکتی ہیں نہ ارسطو کی ثنویت اور اس کے آفریدگار کی بے نیازیاں سے

ازیں چہ سود دریان زکمال حکمت او
کہ بوعلی مقر دارسطو بہ انکار است

مذہب کو ان کے پرستاروں کی انانیت اور خود غرضیوں نے سیاسیات سے زیادہ بلند سطح پر رکھا اس لئے اس کے مکارم و محاسن، نشو و ارتقا کی تدریجی رفتار کے ساتھ فنا ہونے لگے اور آخر کار مذہب اپنے خود پرستاروں کی وجہ سے ہلاکت و فساد کا ایک خوفناک نظام بن گیا۔ اس لئے انسان اپنی ہی طرف دیکھتا ہے، اور سوال کرتا ہے زندگی کیا ہے؟ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ اگر محرومیاں اور کامرانیاں دونوں آئندہ چل کر خواب و خیال بن جاتی ہیں تو پھر ہم مستقبل کے ساتھ اس قدر آرزومندانہ انہماک کیوں رکھتے ہیں ہم ساری آرزؤں کو کیوں نہیں تیاگ دیتے اور پھر سوال یہ ہے کہ اس افسردگی تمنا کے بعد ہم میں جینے کا حوصلہ کیوں باقی رہتا ہے۔ غالب اپنے فلسفیانہ انداز میں اس کا جواب دیتے ہیں ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید　　نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیئے

مرزا کا عقیدہ ہے کہ زندگی محض اُمیدوں کے سہارے قائم رہتی ہے، اگر اُمیدیں باقی نہ رہیں گی، تو موت اُمید بن جائیگی، یعنی انسان زندہ رہنا پسند نہیں کریگا۔ غالب کا یہ شعر زندگی کی بالکل حقیقت ہے۔

انسان فطرتاً رجائیت کا جذبہ لے کر آیا ہے، اور جب تک وہ زندہ رہتا ہے محرومیوں کے باوجود مستقبل کے ساتھ ایک آرزو رکھتا ہے، زمانہ اور اُس کا انقلاب یا تو انسانی قلوب کو مدفن تمنا بنا دیتا ہے، یا گلشن تمنا، لیکن انسان جب ماضی کا جائزہ لیتا ہے تو اس کی کامرانیاں بھی محرومیوں سے زیادہ ناکام نظر آتی ہیں۔ ناکامی تو خیر

خلش دل بن کر زندگی کا ساتھ دیتی ہے، لیکن کامرانیوں کا انجام تو بے کیفی اور افسردگی کے سوا کچھ نہیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ انسان کیفیت چاہتا ہے خواہ وہ درد ہو یا نشاط؛ رونا بھی آرزو کے وجود کی دلیل ہے، کیونکہ انسان روتا بھی اُسی وقت ہے جب دل میں کوئی آرزو ہوتی ہے۔ آہ! اصل رونا تو نہ رونے کا ہے۔ دل کی حسرتیں ختم ہو جاتی ہیں تو آنسو بھی خشک ہو جاتے ہیں۔ ظہوری اس نفسیاتی مسئلہ کے متعلق اپنے شاعرانہ انداز میں فرماتے ہیں ؎

گریۂ حسرت اے ظہوری چند　　　آرزو ہا ہمہ ز دیدہ چکید

فلسفی شاعر کہتا ہے، کہ انسان کب تک روئے، ارے ساری آرزوئیں تو آنکھوں کی راہ بہہ گئیں اب آرزو ہی نہیں تو روئیں کیا۔ یہ صرف شاعری نہیں ہے، بلکہ شاعر نے ایک نفسیاتی واقعہ بیان کر دیا ہے۔

الغرض ماضی کا جائزہ لینے اور مستقبل کا تجزیہ کرنے کے بعد انسان اس نتیجہ پر پہونچتا ہے، کہ زندگی نام ہے دراصل ماضی کے خواب و خیال بن جانے اور مستقبل کے ساتھ آرزوؤں کی وابستگی کا۔ بس یہی زندگی کی حقیقت ہے۔ اب سوال یہ ہے، کہ اس انکشاف کے بعد ہم پر یاس و بے حسی کیوں نہیں طاری ہو جاتی۔ یہیں پہونچ کر نظامِ فطرت انسان کو اندھا بنا دیتا ہے، اور جب تک انسان کے قویٰ باقی رہتے ہیں وہ فطرت کے ذوق آرائش میں زندگی تباہ و برباد کرتا رہتا ہے، عمرانیات کا سازِ نشاط، حکومتوں کی ساری حکمتِ عملی، ذہن و جسم کی تمام پیداوار ایک اسی فریب

خیال کا نتیجہ ہیں ورنہ سلف کے تمدنی کارنامے قدما کے آثار حکومتوں کا قیام و زوال خاندانوں کا عروج و انحطاط ہمارے اندر کیوں نہیں ایک نفسی ردعمل پیدا کر دیتا ہے، آخر ہم کیوں آرزو ہائے خیالی کے دیوانے ہیں ہم دل کے اندر اُمیدوں کی پرورش کیوں کرتے ہیں اور ان کے پورا ہونے کے لئے اس قدر سرگرداں کیوں ہیں؟ قرآن نے اپنے اچھوتے فلسفیانہ انداز میں اس کی طرف ایک جگہ اشارہ کیا ہے

اتبنون بکل ریع آیۃً — کیا تم ہر اونچے مقام پر ایک یادگار بناتے

تعبثون ہ وتتخذون مصانع — ہو جو بالکل عبث ہو اور بڑے بڑے محل

لعلکم تخلدون (شعراء) — طیار کرتے ہو جیسے ہمیشہ تم کو دنیا میں رہنا ہو

یہ ہے اسلامی عمرانیات کا وہ سہل و سادہ اصول جو انسان کو دنیا کی بہت سی ابلہ فریبیوں سے بچا سکتا ہے۔ لیکن انسان کے اندر جس وقت جذبۂ انانیت پیدا ہوتا ہے وہ دولت و جاہ امارت و حکومت، شہرت و عزت خود غرضی و کامرانی کے نشہ میں سرشار ہو جاتا ہے اور ایسے ذرائع ڈھونڈھنے لگتا ہے جن کی بدولت اسکو ابنائے جنس پر تفوق و برتری حاصل ہو، یہیں سے اخلاقیات کی ساری فرومائگی شروع ہوتی ہے اور انسان کے تو امیں اخلاقی رفتہ رفتہ رخصت ہونے لگتے ہیں یہانتک کہ وہ ایک درندہ بن جاتا ہے۔ جس کی بیشمار مثالیں صفحات تاریخ میں موجود ہیں۔ اچھا تو آیئے آج کی صحبت میں ”بنی فاطمہ“ کی مظلومیت اور امویہ و عباسیہ کی خون آشامیوں پر ایک نگاہ ڈال کر فطرت انسانی کی ہوسناکیوں کا مطالعہ کریں۔

مختصراً اگر میں کہنا چاہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ تاریخ کے صفحات علویہ و اہلبیت کے خون سے رنگین نظر آتے ہیں اور دنیا جانتی ہے کہ حضرت زید شہید کو جس طرح فنا کے گھاٹ اتارا گیا وہ ہشام و ولید کو ابدی لعنت میں گرفتار رکھنے کے لئے کافی ہے۔ حضرت یحییٰ بن زید کا سر کاٹ کر بی بی ریطہؑ کے آغوش میں دنیا ایک ایسی وحشت ہے، جس پر چنگیز و ہلاکو بھی رشک کریں گے۔ محمد نفس الزکیہ اور ابراہیم کو جس غداری اور بیدردی کے ساتھ قتل کیا گیا وہ خلیفہ منصور کے دامن پر ایسا دھبّہ ہے، جو کبھی نہیں مٹ سکتا ہارون الرشید اسلامی دنیا کا ایک نامور خلیفہ سہی اس کی بیدار مغزی اس کی سیاسی اہلیت اس کا فاتحانہ جوش و خروش مُسلّم لیکن آہ! یحییٰ بن عبداللہ محض کو امان دے کر زہر دلا دینا کیا معمولی واقعہ ہے، اور کیا اس کو آسانی کے ساتھ معاف کیا جا سکتا ہے، کیا ابوالحسین ابن علی العابد کا واقعہ اور مصائب، فخ، محض اس بنا پر فراموش کئے جا سکتے ہیں کہ خلیفہ ہادی کے حکم سے یہ بلا انگیزیاں ہوئی تھیں امام محمد تقی کہا کرتے تھے۔

لم یکن لنا بعد الطف — کربلا کے بعد سب سے بڑی مصیبت جو ہم

مصرع اعظم من فخ — پر نازل ہوئی وہ واقعہ فخ ہے

کیا امام جعفر صادق جیسے گوشہ نشین عالم کو زہر دینا خلیفہ منصور (۱۳۶ھ۔ ۱۵۸ھ) کی معمولی دنائت تھی، کیا حضرت امام موسیٰ کاظم کو زہر دینے کے بعد بھی رشید (۱۷۰ھ تا ۱۹۳ھ) اسلامی دنیا کا ہر دلعزیز تاجدار کہا جا سکتا ہے، کیا امام

علی نقی کو زہر کا پیالہ پلا دینا خلیفہ المعتز (۲۵۲ھ تا ۲۵۵ھ) کا ایسا کارنامہ ہے جس پر دنیا عباسیہ کے جاہ وجلال اور اسلامی شان وشکوہ کی داد دے سکتی ہے۔ الغرض کہاں تک عباسیہ کی سیہ کاریوں کا شمار کیا جائے۔ میں مانتا ہوں کہ انھوں نے اپنی جلالت وعظمت، علمی وسیاسی خدمات، معاشرتی وعمرانی ترقیوں کے ذریعہ سے عربوں کو دنیا کی ملتوں کے سامنے بہت سربلند کر دیا، لیکن کیا دنیا میں صرف سربلندی حاصل کر لینا ہی اسلام کا اصل پیام ہے، کیا ترقی کا حقیقی معیار اسلام کے نزدیک یہی ہے کہ بغداد میں مدینہ جیسی شاندار عمارتیں بنا دی جائیں، یونانی زبان کی خرافات کا عربی میں ترجمہ کیا جائے، عباسی حکومت کو اطراف واکناف عالم تک وسیع کر دیا جائے، کیا یہ سب کچھ اسلام اور مسلمانوں کی ترقی تھی، بالفرض ہو بھی تو بنی فاطمہ کے ساتھ اُن کا سلوک کیا ان کو اسلامی دنیا کے لئے رحمت بتا سکتا ہے۔

زید شہید — حضرت زید بن امام علی زین العابدین فریادی بن کر ہشام اموی کے دربار میں تشریف لے جاتے ہیں، ہشام اپنے افسر فوج کو حکم دیتا ہے کہ زید ہمارے لشکر میں رہنے نہ پائیں۔ حضرت زید یہ سُن کر فرماتے ہیں کہ جو شخص تلوار کی زد نا پسند کرتا ہے وہ ذلیل ہوتا ہے،، لوگوں نے یہ خبر دربار میں پہنچا دی ہشام سمجھا کہ آپ اس پر خروج کریں گے۔ وہ مکہ میں آیا، اور حضرت زید، داؤد بن علی بن عبداللہ بن عباس اور محمد ابن عمر بن حضرت علی کو گرفتار کیا اور الزام یہ لگایا کہ خالد قشیری کا مال اُن کے یہاں موجود ہے۔ جب یہ لوگ گرفتار کر کے کوفہ میں

یوسف ابن عمر ثقفی کے پاس بھیجے گئے تو ان لوگوں نے قسم کھائی کہ خالد کا مال ان کے ذمہ نہیں ہے۔ چنانچہ یوسف نے ان کو رہا کر دیا اس کے بعد شیعہ، زید کو قادسیہ سے کوفہ کی طرف لائے اور آپ سے بیعت کی۔ جو لوگ آپ کے ساتھ ثابت قدم رہے، زیدیہ کہلاتے ہیں اور جنھوں نے آپ کو چھوڑ دیا، "رافضہ" کہلاتے ہیں صرف کوفہ میں زید کے ساتھ پندرہ ہزار آدمی موجود تھے، اس کے علاوہ مدائن بصرہ، واسط، موصل، خراسان، رے، جرجان، جزیرہ وغیرہ کے باشندوں نے بھی ساتھ دیا۔

۱۲۱ھ میں آپ نے لوائے خروج بلند کیا رفتہ رفتہ آپ کے رفیقوں نے آپ کو چھوڑنا شروع کیا یہاں تک کہ صف آرائی کے دن آپ کے ساتھ صرف تین سو آدمی تھے، امویہ کی طرف سے یوسف ابن عمر ثقفی دس ہزار فوج لیکر آیا تھا میدان کارزار گرم تھا کہ یوسف ابن عمر ثقفی کے ایک غلام نے جس کا نام "راشد" تھا ایک تیر مارا جس سے حضرت زید کی پیشانی زخمی ہو گئی آپ کو سواری سے اتار لیا گیا آپ کا سر مبارک مسلم ابن محمد خیاط کی گود میں تھا، آپ کے صاحبزادے یحییٰ ابن زید تشریف لائے اور رو کر کہا "ابا جان! بشارت ہو کہ آپ حضرت رسول اللہ، علی، فاطمہ، اور حسن و حسین سے ملیں گے"، حضرت زید نے فرمایا "میرے عزیز بچے اب تم کیا کرو گے؟" حضرت یحییٰ نے جواب دیا "ابا جان میں تن تنہا بھی اُن سے لڑوں گا"۔ حضرت زید نے فرمایا "ہاں میرے بچے یہی کرو، چونکہ تم حق پر ہو اور وہ ناحق پر اگر انھوں نے تم کو شہید کیا تو تم جنت میں داخل ہو گے اور اگر وہ مارے گئے تو واصل جہنم ہونگے

اس کے بعد تاریخ میں حضرت زید کا وہ حسرتناک انجام مرقوم ہے۔ جسے علامہ سراج الدین رفاعی نے اس طرح لکھا ہے[1]:-

پھر تیر آپ کی پیشانی سے، نکالا گیا اور اسی کے ساتھ آپ نے رحلت کی سعید بن خثیم کہتے ہیں کہ اس کے بعد ہم لوگ آپ کو ایک چشمہ کے نزدیک لائے جو ایک باغ کے اندر جاری تھا آپ کی لاش دفن کردی اور ہمارے ساتھ ایک سندی غلام تھا اس نے یوسف کو خبر کردی۔ صبح کے وقت آپ کی لاش چشمہ سے نکالی اور ایک کینسہ میں سولی دیدی اور چار برس تک سولی پر لٹکائے رکھا (اس عرصہ میں) ہشام نے قضا کی اور ولید ثانی ابن یزید ثانی (۱۲۵ھ تا ۱۲۶ھ) نے یوسف کو لکھا کہ تم کو جس وقت میرا خط ملے فوراً اہل عراق کی طرف جاؤ اور (زید کو) جلا کر آپ کی خاک دریا میں منتشر کردو، یوسف نے سولی سے لاش اتاری اور جلا کر راکھ ہوا میں منتشر کردی۔

یحییٰ ابن زید شہید

حضرت زید کے چار بیٹے تھے یحییٰ، حسین ذوالدمعہ، عیسیٰ موتم الاشبال، اور محمد۔ حضرت یحییٰ سب سے بڑے صاحبزادہ تھے، آپ لاولد مرے حضرت زید کی شہادت کے بعد آپ مدائن میں آئے خلیفہ ولید اموی کے گورنر یوسف ابن عمر نے آپ کو بلایا آپ رے کی طرف چلے گئے وہاں سے نیشاپور اور سرخس میں آئے اس کے بعد یوسف نے نصر ابن یسار

---

[1] صحاح الاخبار فی نسب السادۃ الفاطمیۃ الاخیار

کی سرکردگی میں ایک فوج بھیجی تین دن تک سخت لڑائی ہوئی لوگوں نے جمعہ کے دن عصر کے بعد ۱۵۵ھ میں آپ کو جام شہادت پلا دیا۔ شہادت کے وقت آپکی عمر اٹھارہ سال کی تھی، آپ کا سر مبارک ولید کے دربار میں آیا، جسد مبارک سولی پر لٹکا دیا گیا، ولید نے سر مبارک مدینہ میں بھیجا کہ آپ کی والدہ ماجدہ حضرت بی بی ربیطہ بنت عبداللہ بن محمد بن علی بن ابی طالب کے گود میں ڈالدیا جائے بی بی ربیطہؓ حضرت شیر خدا کی پروتی تھیں آپ کی رگوں میں وہی خون جاری وساری تھا آپ نے سر کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا اور امویوں کی طرف خطاب کر کے کہا۔

شر دتموہ عنی طویلا واھد	ایک عرصہ تک تم نے مجھ کو اس کا داغ فراق
یتموہ الی قتیلا صلوات اللہ	دیا اور اب، قتل کر کے اس کا تحفہ دیتے ہو
علیہ بکورۃ واصلا	اللہ تعالیٰ کی بخششیں اس پر صبح وشام ہوا کریں

ایک غیر متعصب طالب علم امویوں کی ان سیہ کاریوں کی داستان پڑھ کر حیرت میں آجاتا ہے کہ اموی مسلمان تھے یا ننگ اسلام!

بنو حسن کی سیاسی جد وجہد

بنو حسن نے بدسلوکیوں کے باوجود نہ تو قائم شدہ حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی نہ سیاسیات میں کوئی حصہ لیا تھا۔ علی ثانی (امام زین العابدین) کی اولاد عزت گزین زندگی گزارتی اور علمی وفلسفیانہ مشاغل میں مصروف رہتی تھی، اُنھوں نے خود کو بنی عباس

کی سیاسی تحریکوں سے بالکل علیحدہ رکھا، البتہ زید شہید اور آپ کے صاحبزادہ نے مظلومیت کی بنا پر ہشام اور یزید کے خلاف اسلحہ اٹھایا اور اپنی زندگی قربان کر دی۔ بنو حسن اور بنو حسین مدینہ میں رہتے تھے اور بچی کھچی قلیل جائداد کچھ تجارتی منفعت اور مدارس کی غیر متعین آمدنی پر ان کی بسر ہوتی تھی لیکن اس فلاکت کے باوجود، مقامی باشندے ان کو بڑے احترام کی نظر سے دیکھتے تھے، مدینہ میں خلفائے ثلاثہ عبداللہؓ بن زبیرؓ اور اکابر صحابہ کی اولاد بھی رہتی تھی، اور یہ سب علویہ کے ساتھ علاقہ رکھتے تھے۔ علویہ کے اس اثر و رسوخ اور عزت و برتری کو دیکھ کر منصور عباسی کو خوف ہوا کہ جس آسانی کے ساتھ بنی مرواں تباہ ہو گئے کہیں اس کا خاندان بھی نہ برباد ہو جائے۔ چنانچہ اس نے مختلف طریقوں سے پتہ لگانے کی کوشش کی کہ کہیں بغاوت کا سامان تو نہیں، اس نے اپنے آدمیوں کو یہ ہدایت کر کے علویہ کے یہاں بھیجا کہ وہ ان کے معتمد بن جائیں اور ان کو بلا خوف بولنے کی ترغیب دیں، تاکہ اس کو دار و گیر کے لئے حجت مل جائے اس طرف جب امویہ کی حکومت کو زوال ہو رہا تھا تو فطری طور پر علویہ اس سے دلچسپی لے رہے تھے، مدینہ میں ایک جلسہ ہوا جس میں بہت سے بنو حسن اور بنو حسین جمع ہوئے، منصور بھی اس میں شریک تھا، اس جمعیت میں امام حسن کے پوتے محمد (جو بنو حسن کے سردار تھے) خلیفہ منتخب ہوئے آپ کی صداقت و شرافت اخلاق کے باعث آپ کو "نفس الزکیہ" کا لقب ملا تھا۔ سارے مجمع نے مع ابوجعفر منصور متفقہ طور پر آپ کی لیاقت و فضیلت کا اعتراف کرتے ہوئے آپ سے بیعت کی جب منصور تخت خلافت پر بیٹھا، اس نا قابل

فراموشی بیعت کی یاد سے اس کی زندگی تاریک نظر آنے لگی، اور اس کا شک قوی ہو گیا، اور اس نے محمد نفس الزکیہ اور آپ کے بھائی ابراہیم کو گرفتار کرنے کی کوشش کی لیکن وہ لوگ فرار ہو گئے اس نے خاندان کے بڑے بڑے لوگوں کو گرفتار کیا جن میں ضعیف العمر حضرت عبداللہ محض اور آل عثمان کے سردار محمد العثمانی بھی شامل تھے جن کی صاحبزادی ابراہیم کی زوجیت میں تھیں ان کو پابہ زنجیر کوفہ میں بھیجا گیا اور قلعہ میں قید کیا گیا۔ محمد العثمانی کو اہل شام بڑے احترام کی نظر سے دیکھتے تھے، اس لئے اُن کی شخصیت بھی تخت عباسیہ کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی، چنانچہ آخر کار آپ کو کوڑے لگائے گئے اور پھر قتل کر دیا گیا۔ دوسروں کے ساتھ بڑی سختی کی گئی۔ یہاں تک کہ غریب مظلوموں نے اعتراف کیا کہ وہ اس لحاظ سے تو دور اموی ہی میں اچھی طرح بسر کرتے تھے محمد اور ابراہیم کی گرفتاری کے لئے چاروں طرف لوگ سرگرم تھے، بدوؤں کو پانی کے مقامات پر متعین کیا گیا کہ وہ جاسوسی کریں۔ جن لوگوں پر پناہ دینے کا شبہ تھا ان کو کوڑے مارے گئے قید کیا گیا۔ آخر ناامید ہو کر محمد نے اپنے بھائی ابراہیم کو اہواز اور بصرہ کی طرف تحریک کے لئے بھیجا، اور خود مدینہ میں تشریف لائے، منصور کے عزل کا اعلان بیک وقت بصرہ اور مدینہ میں ہونا قرار پایا۔ اگر یہ کارروائی کامیاب ہو جاتی تو غالب گمان تھا کہ عباسیہ کی حکومت کا خاتمہ ہو جاتا لیکن محمد پر اُن کے بھائی کی تیاریوں کے قبل اعلان کرنے کا زور دیا گیا اور اس لئے منصور باری باری دونوں پر حملہ کرنے کے لائق ہو گیا منصور کا عامل جو مدینہ میں تھا گرفتار کر کے قید کر دیا گیا؛ اور چند دنوں کے اندر سلسلے

حجاز اور یمن نے محمد کو دنیائے اسلام کا خلیفہ مان لیا۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک نے محمد کی تائید میں فتویٰ دیا۔ منصور نے جب اس تحریک کو توقع سے زیادہ خطرناک پایا تو اپنی رسمی روباہ بازی سے کام لیا اور محمد نفس الزکیہ کو ایک خط لکھا اور اُن کو اجازت دی کہ جہاں جی میں آئے رہیں اسی کے ساتھ ایک بڑے وظیفہ کی لالچ دی اور ان کے رشتہ داروں کے حق میں بھی رعایت کا وعدہ کیا۔ محمد نے اس کا جواب دیا کہ آمرزش اور مہربانی کرنے کا حق تو ہم کو ہے، کیونکہ حقیقت کے اعتبار سے خلافت میری چیز ہے، اور امان کے متعلق یہ لکھا کہ اس کی حقیقت اسی امان کی سی تو نہیں جو ابومسلم، عبداللہ علی اور یزید بن ہبیرہ کو دی گئی تھی۔ منصور اس تلخ جواب سے جل گیا اور اُس نے محمد نفس الزکیہ کو ایک طویل خط لکھا اور اس پر زور دیا کہ چونکہ آنحضرت نے کوئی اولاد ذکور نہیں چھوڑی اسلئے آپ کی صاحبزادی کی اولاد کو وراثت نہیں پہونچتی، بلکہ اس کی حقدار آپ کے چچا عباس کی اولاد ہوئی۔ منصور نے اپنے بھتیجہ کو ایک بڑے لشکر کے ساتھ روانہ کیا تاکہ وہ نفس الزکیہ کو کچل ڈالے۔ جنگ کے قبل محمد نفس الزکیہ نے اپنے رفقا سے کہا کہ جس کے جی میں آئے میرے ساتھ رہے، اور جو جانا چاہے چلا جائے۔ اس پر آپ کے معاونین کی اکثریت نے اپنے اپنے گھر کا راستہ لیا اور آپ صرف تین سو آدمیوں کے ساتھ منصور کی فوج کا مقابلہ کرنے کے لئے رہ گئے۔ آپ کے تمام ہیرو ایک ایک کر کے شہید ہوگئے اور ان کی لاشیں حسب دستور دار پر لٹکائی گئیں اہلبیت کی ایک خاتون نے عیسیٰ سے اجازت لے کر مقتولین کو مدینہ کے نزدیک "روضۃ الشہدا"

میں دفن کر دیا۔

اسمٰعیلیہ و ادارسہ

عباسیہ نے فاطمیہ کو تباہ کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا، ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ وہ خراب و خستہ رہیں، لیکن فطرت اپنا اصول کب چھوڑتی ہے، جہاں تک ان کو ستایا گیا جہاں تک ان کی جمعیتیں پریشان کی گئیں، اتنا ہی لوگوں کے دل ان کے گرویدہ ہوتے گئے اور یہ بھی تاریخ کا عجیب و غریب واقعہ ہے کہ اس پریشان حالی بے سروسامانی اور فلاکت کے باوجود فاطمیہ کی دو زبردست حکومتیں اسمٰعیلیہ اور ادارسہ قائم ہو ہی گئیں۔ حضرت امام حسین کی اولاد نے بہ استثنائے حضرت زید و یحییٰ کوئی ایسی سیاسی تحریک نہیں کی، پھر بھی حضرت اسمٰعیل ابن امام صادق کی اولاد نے مغرب میں جلالت و شکوہ کے وہ کارنامے چھوڑے کہ دول اسلامیہ کی تاریخ میں ان کو ایک خاص امتیاز و اہمیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے عبید اللہ المہدی سے فاطمیہ مصر کے آخری فرمانروا اعضد لدین اللہ (۲۹۷ھ تا ۵۵۵ھ) تک ڈھائی سو صدیوں سے زیادہ زمانہ ہوتا ہے، اُنھوں نے صقلیہ تک اپنی حکومت وسیع کی آل حسن نے عباسیہ کے لئے ایسی ایسی سیاسی نزاکتیں پیدا کر دیں کہ منصور و رشید کے ہوش پراگندہ ہو گئے، محمد نفس الزکیہ اگر منصور کی طرح سیاسی چالبازیوں سے باخبر ہوتے تو آج اسلام کی تاریخ میں عباسیہ کی جگہ فاطمیہ و علویہ ہی نظر آتے، اگر رشید حضرت یحییٰ کو دیلم سے بلا کر زہر نہ دلا دیتا تو وہ دیلم کے بادشاہ ہو چکے ہوتے، اور تاریخوں میں "صاحب الدیلم" ہی کے لقب سے مشہور ہیں۔ حضرت عبد اللہ محض

ابن حسن مثنیٰ ابن امام حسنؑ کے چار صاحبزادوں محمد، ابراہیم، یحییٰ، ادریس نے ظلم وستم سے اکتا کر ایسی ایسی تحریکیں کیں کہ عباسیہ خوفزدہ ہو گئے لیکن سیاسیات کے مکروفریب سے باخبر نہ ہونے کے باعث اُن کو ناکامیاں ہوئیں صرف ادریس کو خدا نے مغرب کا بادشاہ بنایا اور اس طور سے یہ دوسرا فاطمی خاندان ہے، جس کو حکومت و سلطنت ملی ۱۶۹ھ سے ۳۱۹ھ تک ان کی حکومت رہی یحییٰ سوم کے زمانہ ۳۰۹ھ میں ادارسہ مصر کا خاتمہ ہو گیا اس کے بعد ادریسی خاندان کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوئیں جن پر ۳۱۹ھ میں امویہ اندلس اور اسمٰعیلیہ متصرف ہو گئے۔

یحییٰ فرمانروائے دیلم

آپ صاحب الدیلم مشہور ہیں جیسا کہ مشہور نسابہ سیّد عمید الدین حسینی نے بیان کیا ہے، آپ حضرت امام حسن کے پوتے تھے، آپ کے والد کا نام عبداللہ محض ابن حسن مثنیٰ بن امام حسن ہو آپ خلیفہ رشید کے زمانہ میں بھاگ کر دیلم پہونچے وہاں کے باشندوں نے آپ سے بیعت کی اور آپ کے پاس جمع ہو گئے، آپ کی شان و شوکت بڑھی، ہارون الرشید کو اس کا بڑا صدمہ و قلق ہوا اُس نے فضل ابن یحییٰ برمکی کو لکھا کہ یحییٰ نے میری آنکھوں میں کانٹے چبھوئے ہیں، جو وہ چاہیں اُن کو دو اور اُنکی طرف سے میرا اندیشہ دور کر دو، فضل بن یحییٰ ایک بڑا لشکر لے کر آ دھمکا اور خوف دلایا مہر و قہر سے اُن کو پیام دیا، یحییٰ نے امان طلب کی فضل نے رشید کے وکیل کی حیثیت سے امان نامہ لکھ دیا بعض روایت میں ہے کہ آپ دیلم میں غلامی کی حالت

میں پہونچے وہاں کے باشندوں نے ایک لاکھ دینار میں آپ کو فضل سے خرید لیا حضرت یحییٰ مدینہ میں چلے گئے اس قیام مدینہ کے زمانہ میں عبداللہ بن مصعب بن ثابت بن عبداللہ زبیرؓ نے آپ کے خلاف رشید سے کہہ دیا کہ وہ مجھ سے بیعت لینا چاہتے تھے۔ رشید نے دونوں کو بلایا یحییٰ بھی مدینہ سے آئے جب آپ کے زبیری (عبداللہ بن مصعب) کا سامنا ہوا تو اس نے کہا "تم نے ہمارے خلاف سازش کی اور ہماری حکومت کی تباہی کا ارادہ کیا"

یحییٰ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا تم کون ہو؟ رشید کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ یحییٰ نے کہا یا امیرالمومنین یہ شخص جو آج ہم پر تہمت رکھ رہا ہے ہمارے بھائی نفس الزکیہ کے ساتھ آپ کے جد منصور کے خلاف خروج میں شامل تھا اور یہ اسی نے کہا ہے،

قوموا ببیعتکم ننهض بطاعتنا ان الخلافة فیکم یا بنی حسن

ترجمہ:۔ اے آل حسن! اپنی بیعت کے لئے اٹھ کھڑے ہو، ہم تمہاری فرمانبرداری کیلئے مستعد ہیں خلافت تمہاری چیز ہے۔

اور اے امیرالمومنین یہ شخص جو تہمت رکھ رہا ہے وہ آپ کی محبت اور آپ کی حکومت کے ساتھ ہمدردی رکھنے کا نتیجہ نہیں بلکہ ہم تمام اہل بیت کے ساتھ عناد پردرپا کا مظاہرہ ہے، میں حلف اٹھانے کو کہتا ہوں اگر وہ حلف اٹھالے گا کہ میں نے اس سے بیعت کے لئے کہا تھا تو پھر میرا خون آپ کے لئے حلال ہوگا۔"

جب عبداللہ نے جھوٹا حلف لیا تو۔ یحییٰ نے کہا یا امیر المومنین مجھے تین دن تک حوالات میں رکھئے۔ اگر عبداللہ پر کوئی بلا نازل نہ ہو تو میرا خون حلال ہے، رشید نے یحییٰ کو فضل برمکی کے سپرد کیا فضل روایت کرتے ہیں کہ اللہ کی قسم ہم نے ابھی اس دن عصر کی نماز بھی نہ پڑھی تھی کہ عبداللہ بن مصعب کے گھر سے چیخنے کی آواز آئی، میں نے دریافت حال کے لئے آدمی بھیجے معلوم ہوا کہ وہ جذام کے مرض میں مبتلا ہو گیا میں اس کے یہاں گیا لیکن میں نے اس کو نہیں پہچانا، وہ سیاہ کوئلہ کے مثل ہو گیا تھا۔ میں رشید کے پاس گیا تاکہ اس کو خبر دوں ابھی میں نے بات بھی پوری نہیں کی تھی کہ اس کی موت کی خبر آئی۔ مگر رشید کا ظلم تو دیکھئے کہ وہ اس پر بھی باز نہ آیا اُس نے امان نامہ پھاڑ ڈالا، اور یحییٰ کو جیل خانہ میں بھیجدیا۔ چند دن گزرنے کے بعد قاضی اور اہل دربار جمع ہوئے سبھوں نے کہا کہ امان نامہ صحیح ہے، اس میں کوئی خرابی نہیں۔ یحییٰ خاموش تھے حاضرین میں سے کسی نے کہا آپ چپ کیوں ہیں؟

آپ نے اپنے منہ کی طرف اشارہ کیا کہ مجھ میں بولنے کی طاقت نہیں اور اپنی زبان نکالی آپ کا رنگ سیاہ ہو گیا تھا رشید نے کہا یہ تم کو وہم دلا رہے ہیں کہ ان کو زہر دیا گیا ہے، پھر آپ کو جیلخانہ میں واپس کر دیا اس کے بعد آپ کی کوئی خبر نہ ملی۔ آپ کے واقعۂ شہادت کے متعلق مختلف روایتیں بیان کی جاتی ہیں ایک روایت

لے (نگار) حیرت ہے کہ یحییٰ کے خلاف جھوٹی قسم کھانے پر ایک شخص تو مبتلائے جذام ہو جائے، لیکن خدا ان لوگوں کو چھوڑ دے جو واقعی ظلم و ستم کے بانی تھے۔ اس نوع کی روایات ماننے میں مجھے بہت تامل ہے نیاز

تو یہ ہے کہ ایک حوض میں بھوکے شیروں کے سامنے چھوڑ دیا گیا اور وہ آپ کو نوچ کر کھا گئے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ سندی ابن شاہک کے گھر میں ایک کمرہ کے اندر بند کر دیا اور اس کو مٹی سے بھر دیا۔

ابو الحسین ابن علی عابد آپ حضرت حسن مثلث ابن حسن مثنیٰ ابن امام حسنؑ کی اولاد میں تھے، آپ نے خلیفہ ہادی ابن مہدی عباسی کے زمانہ میں علویہ کی ایک جماعت کے ساتھ مکہ میں خروج کیا محمد ابن علی ابن عیسیٰ اور محمد ابن سلیمان بن منصور نے بمقام فخ ۱۶۹ھ میں آپ کو جام شہادت پلایا اور آپ کی گردن مبارک کاٹ کر خلیفہ ہادی کے دربار میں بھیجی، ہادی کو ان کی یہ حرکت پسند نہ آئی امام محمد تقی ابن امام علی رضا فرمایا کرتے تھے کہ کربلا کے بعد سب سے بڑی مصیبت واقعہ "فخ" ہے جو ہم لوگوں پر گزری۔

زاہد فریب جوگن

عورت کائنات کے جمالیاتی پہلو کا سب سے بڑا حصہ ہے، اور اس سے تو کوئی انکار ہی نہیں کر سکتا کہ ہستی کے بہترین نقوش محض نسائیات کے منت پذیر ہیں یہ میں کسی خاص عصبیت یا نیایش کے رنگ میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ یہ دعادی اُن علمائے نفسیات کے ہیں جنھوں نے انسانی فطرت اور عملیات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اپنی کتابوں میں لکھی ہیں، فرانس کا ایک مشہور نفسی باڈوئن اپنی کتاب "تصریح نفسیات" میں علامہ فرائیڈ کا نظریہ تجدید (Sublimation) پیش کر کے انسان کے ذوق صناعانہ کو محض جذبہ جنسی کی متغیر صورت بتاتا ہے، فاسٹر اسکاٹ اپنی کتاب "شعور جنسی" میں فنون جمیلہ شعر و ادب، رقص و سرود الغرض کمالات اور نمود کمالات کو صرف جمالیات نسواں کا مظاہرہ ثابت کرتا ہے، اسی طرح میکڈوگل اپنی کتاب "نفسیات اجتماع" کے ایک باب "شعور جنسی" میں نفسیاتی اصول کے مطابق ان مباحث پر غور کرتا ہے کہ ادب لطیف اور فنون جمیلہ کو شعور جنسی سے کیا تعلق ہے اور اس تعلق کے کیا اسباب ہیں؟ وہ لکھتا ہے

"شعور جنسی اور صناعانہ پیداوار میں بہتر سے اعتبار سے ایک بلا واسطہ تعلق پایا جاتا ہے: تہیج جنسی کی تحریک جسم میں ایک قوت اور دماغ میں معمولی جذبہ اور ایک ناقابل

تصریح آرزو پیدا کر دیتی ہے، اور یہ مزید قوت جس کے پیش نظر شعوری طور پر کوئی خاص منزلِ مقصود نہیں رہتی اور چونکہ اُسے موقعہ اور حالات دستیاب نہیں ہوتے جہاں یہ حرکت و خیال کے ذریعہ اپنی قوت کا مظاہرہ کرے۔ تو یہ ایسی حرکت و عمل کی صورت اختیار کر لیتی ہے، جس میں ذاتی طور پر اس کا سامان سکون پیدا ہو جاتا ہے جیسے بازیچہ گری (Gambolling) رقص و سرود وغیرہ، اگر یہ تسلیم کر لیا جائے تو یہ دقت طلب مسئلہ حل کرنا باقی رہ جاتا ہے، کہ کیسے اور کیوں شعور جنسی کے بر سرِ عمل لانے کے لئے یہ طریقے ایسی صورتیں اختیار کر لیتے ہیں جنھیں ہم لوگ اصطلاح میں "صناعانہ" کہتے ہیں، غالباً فنون جمیلہ (Asthetics) کا بنیادی مسئلہ ہے اگر ہم لوگ حیوانی زندگی کی سادہ سطح پر واقعات کا مطالعہ کریں تو میرا خیال ہے کہ ہم لوگوں کو شعور جنسی اور ذوق صناعانہ کے باہمی ربط کی کنجی دستیاب ہو جائے گی ہم لوگ شبہ نہیں کر سکتے کہ مادہ بلبل نر کے نغمہ کی بہ نسبت کسی دوسری آواز سے نہیں تھرتھراتی اور یہ کہ نر کبوتر کی نشو ونما مادہ کبوتر کو زیادہ پسند ہے ان دونوں صورتوں میں یہ صحیح ہے کہ شعور جنسی اس طریقہ سے منظم رہتا ہے کہ ان خیالات سے متحرک ہو جائے شعور جنسی کی ترغیب مرد و عورت کے اندر ایک احساس لذت پیدا کرتی ہے، اور یہ اس وقت بھی جبکہ اس کے (لذت) مزید حصول کا خیال بھی نہ ہو۔ اس کے شواہد ہم لوگ اس حد تک مطالعہ کرتے ہیں جس حد تک تہیج جنسیہ گی لذگدی کے ذریعہ صنعت ادب، اور لطف عوام کی ادنیٰ صورتوں پر عام دعوت نشاط دینے کے لئے اعتماد

کیا جا سکتا ہے، جب مصوّری اور نقاشی میں انسان کے حسین مرقعے تیار کئے جاتے ہیں تو اُن میں بھی یہی عنصر کارفرما رہتا ہے، لیکن یہ فنون اپنے اظہار کے اعلیٰ مدارج میں ان چیزوں کو اس صورت میں پیش کرتے ہیں جن سے جذبات حیرت واحترام بھڑک اُٹھتے ہیں، اُس وقت نقاش یا مصور کی روش جذبات اعزاز و تقدیس سے بھری ہوئی رہتی ہے جو سلسلۂ خیالات پر تہیج جنسیہ کا استقرار قائم نہیں رہنے دیتے اور اسے (مصور) مظاہر جسمانیہ سے، بجائے اس کی اس قوت جنسیہ کو دوسری راہوں پر لگا دیتے ہیں[1]۔ یہ تفریحی قوت ایک ذہنی جستجو پیدا کر دیتی ہے جس کی ضرورت خطوط، نور اور رنگ کا توازن و تناسب سمجھنے کے لئے لاحق ہوتی ہے، یعنی جو قوت شعور جنسیہ کی نمائش میں صرف ہوتی تھی اب خالص ادراک جمالیاتی کی جستجو کے لئے وقف ہو جاتی ہے،

[1] اسی لئے مصورین اسلام کے کارناموں میں اکثر جسمانیات کے اعتبار سے کوئی جمال رائحہ نہیں پایا جاتا لیکن مصوری کے وہ تمام محاسن پائے جاتے ہیں جن کے اسباب حدوث پر میکڈوگل نے سطور بالا میں بحث کی ہے، اسلامی مصوری ایک پیام روح ہوتی ہے اسکے بغور مطالعہ سے انسان کے قلوب میں فکر و احساس کا ایک تموج پیدا ہو جاتا ہے اسلامی مصوری کو اگر مادی آلائشوں اور جسمانی کثافتوں کی نظر سے دیکھیں تو ایک فضول چیز سمجھ سکتے ہیں لیکن نیرنگئی خیال، پاکیزگی ذوق اور جمالیات روحانیہ کے اعتبار سے اسکی رفعت اور گرانمائگی کا اعتراف کرنا پڑیگا "مرقع چغتائی" میں ایک حد تک یہ خصوصیت پائی جاتی ہے لیکن فن سے قطع نظر، تاریخ، معاشرانہ فضا، (موجودہ) اور دعوت و تبلیغ کے اعتبار سے اس میں چند در چند نقائص موجود ہیں اور میں کسی وقت ایک مستقل مضمون کے ذریعہ اس پر روشنی ڈالوں گا ع۔م

اسی کو اصطلاح نفسیات میں "اشتقاق جذبی Derived Emotion" کہتے ہیں، اور "قانون تجدید" اسی کی ایک ارفع صورت کا نام ہے۔ جب انسان کے جذبات حیوانیہ رفعت خیال اور علوئے روحانیہ کی اس منزل پر پہونچ جاتے ہیں تو اسی کو قانون تجدید کا نتیجہ" یا "ارتفاع جذبہ" کہتے ہیں۔

جب انسان بلا واسطہ جذبۂ جنسی کی کامرانیوں میں فائز نہیں ہوتا تو یہ ولولہ دوسری صورتیں اختیار کر لیتا ہے۔ یہیں سے ہم ارتقاء تمدن کا مسئلہ بھی حل کر سکتے ہیں جہانتک شہوات بہیمیہ پر انسان قابو پاتا جائے گا، اس کا جنسی ولولہ روحانی لطافتوں کے ساتھ مل کر جسمانیات اور مادیات کی دنیا میں وہی روحانی پاکیزگی، وہی باطنی لطافت، وہی روحانی کیفیات پیدا کر دیگا جن کی بنا پر فنون جمیلہ اور ادب لطیف کی تخلیق ہوئی۔ عورت پیدا ہوئی تو ایک قدرتی حسن اس کے ساتھ تھا اور اس کی فضائے ماحول میں ایک فطری کشش ہنگامہ آفریں تھی، مرد ازل سے ایک اثر پذیر دل لے کر آیا تھا اس نے جلوہ گاہ ناز پر نظر ڈالی تو بیخود ہو گیا، درد اٹھا تو درماں طلبی سوجھی، حسن کو غرہ، عشق کو نیایش، وہاں انانیت، یہاں عبودیت، آخر سامانِ سکون ہو تو کیسے ہو، مجبوراً عشق نے دوسری تدبیریں نکالیں، اس نے پُردرد نغموں کے ساتھ، اپنے جوش و ولولہ، اپنے جذبات و احساسات، اپنی اثر پذیری و وارفتگی، اپنی درماندگی و بیچارگی کے حالات قلمبند کرنا شروع کئے، اصطلاح میں اسی کا نام "غزل" ہو گیا۔ لیکن تصور نے بتایا کہ صرف روح اور خیال کی دنیا اثر نہیں رکھتی، ناچار عشق نے چند مشت خاک یا ایک پارۂ سنگ سے دل بہلانا شروع کیا،

جمال یار کا نقشہ جما ہوا تھا اسی نقشہ کی مثال بنانا شروع کی، اور بڑی کاوش ومحنت، بڑی شوق وذوق، بڑے اہتمام واعزاز کے ساتھ مجسمہ تیار کیا، مدتوں اس کی پرستش کی، دردِ دل کہا، اشک حسرت بہایا، لیکن کوئی فائدہ نہ نکلا، حسن نے شرط کی اور عشق سے عمارت بنوانی چاہی یہ مرد میدان تیشہ لے کر اٹھا، اور پہاڑ کھود ڈالا، اور ایک خاص نشہ میں تنہا وہ کر گیا جو شاید سیکڑوں مل کر بھی انجام نہ دے سکتے، اس پر بھی ناکامی رہی، آخر کار ان تمام ہنگامہ آفرینیوں اور شورشوں کے بعد عشق اس نتیجہ پر پہونچا کہ اس "وابستگی داماں جاناں" سے اتنے مراحل طے کرنے کے بعد بھی سراسیمگی روح میں کمی ہوئی، نہ کوئی کامل لطف حیات میسر آیا، زحمت "من وتو" نے سرگرداں رکھا، کیوں نہیں اپنی ہی عقدہ کشائی کی جائے کہیں میرا سکون اور بہجت روحانی میرے اندر ہی تو پنہاں نہیں عشق کی اسی آخری منزل پر پہنچکر رومی نے اس حقیقت کا اعتراف کیا تھا ؎

من وتو بے من وتو جمع شویم از سر ذوق — خوش وفارغ زخرافات پریشاں من وتو

فرائیڈ کے "نظریۂ تجدید" کو میکڈاوگل نے بھی "نفسیات اجتماع" میں تسلیم کیا ہے اور یہ اس قدر اہم مسئلہ ہے کہ میکڈاوگل کے نزدیک فرائیڈ کے تمام افکار وآرار قابل اعتراض ہیں یا کم از کم ایسے ہیں کہ ان سے فاضل محقق کو اپنی کتاب میں استفادہ کرنے کی ضرورت نہ پڑی، لیکن فرائیڈ کے نظریۂ تجدید پر میکڈاوگل کو بھی گردن تسلیم خم کر دینا پڑی۔
نظریہ تجدید کا ماحصل یہ ہے کہ جب اصل جذبہ بلا واسطہ اپنی نمائش میں کامیاب نہیں ہوتا تو دوسری صورتیں اختیار کر لیتا ہے، یعنی اب اس کی نمائش تمدن اور معاشرت کے اعتبار

سے نافع اور خوشگوار ہوتی ہے تو اُس کو قانون تجدید کا نتیجہ کہتے ہیں۔ میں نے علی حزیں (مطبوعہ نگار بابت اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء) کے سلسلہ میں لکھا تھا کہ غزل گوئی قانون تجدید کا نتیجہ ہے اور آج صوفیانہ ذوق کو اسی نظریہ کے ماتحت لانا چاہتا ہوں۔

صوفی ادبیات کی ایک مشہور تصنیف "منطق الطیر" سے کون واقف نہیں۔ حضرت شیخ فریدالدین عطار اس کے مصنف ہیں، اور ایک مشہور فرانسیسی عالم گارسن ڈیٹاسی کے فرنچ ترجمہ کی بدولت مغربی دنیا میں بھی اس نے کافی شہرت حاصل کر لی ہے، یہ وہی کتاب ہے جس نے رومی کے خیالات پر گہرا اثر کیا[1]۔ اس میں حسن و عشق کی ایک ایسی روایت جمیل لکھی ہوئی ہے کہ پڑھنے کے بعد انسان دل ہی دل میں محسوس کرنے لگتا ہے کہ اُسے کوئی روحانی درس ملا، اُس کی روح بےچین ہونے لگتی ہے، اور یہ بےچینی شاید اس ساعت کی یاد کا نتیجہ ہوتی ہے جبکہ روح کو وہ بلند نشیمن حاصل تھا جہاں عشقیات و جمالیات کے سوا نہ کوئی دوسری چیز ہے نہ سکون، و بہجت روحانی کے علاوہ کوئی دوسرا منظاہرہ، یہ ہی "صوفیانہ ذوق" جس کی بنا پر نکلسن اپنے "مقدمہ دیوان شمس تبریز" میں تصوف کو عشق و جمال کا مذہب بتاتا ہے، اور خود صوفیانہ فکر و عقائد میں سرشار نظر آتا ہے، میں

---

[1] میں اس وقت اس مسئلہ پر بحث کرنا نہیں چاہتا، کہ منطق الطیر اور مثنوی رومی میں کیا علاقہ ہے، اور یہ تو ڈاکٹر نکلسن نے بھی لکھا ہے کہ مولانا روم جب قونیہ جا رہے تھے، تو نیشاپور میں حضرت عطار رح سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے اسرارنامہ دیا، رومی کی خصوصیاتِ شاعری اور یورپ کی موجودہ رومی پرستی، پر میں بہ تفصیل ایک تحقیقی مقالہ لکھوں گا جو جلد ہی شائع ہوگا ۱۲

اس وقت عورت کے صرف ذوق صوفیانہ اور اُس کے جمال بدیع کی زاہد فریبی پر ایک مختصر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔

شیخ صنعان ایک بہت بڑے عارف باللہ اور زاہد گزرے ہیں، پچاس سال تک حرم میں چار سو مریدوں کے ساتھ زندگی بسر کی، ظاہر و باطن دونوں میں کامل زمانہ تھے پچاس مرتبہ حج کیا، زندگی بھر عمرہ کرتے رہے نماز روزہ کا خاص شغف تھا سنت کے نہایت پابند تھے، آپ سے کشف و کرامات بھی صادر ہوتے تھے، مختصراً یہ آپ کی بزرگی کے حالات تھے، لیکن اُنھوں نے چند راتوں تک مسلسل خواب میں دیکھا کہ میں حرم آنے کی راہ میں ایک مقام پر ایک بُت کو سجدہ کر رہا ہوں، خواب سے بیدار ہوئے تو سخت گھبرائے، اپنے تزلزل ایمانی پر بہت نفرین کی، لیکن قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا، قدرت جو کرنا چاہتی ہے کرتی ہے خواہ اس میں دوسروں کو لذت ملے یا الم، ہمارے دُکھ سُکھ سے علیحدہ ہو کر قدرت صرف اپنے نقوش و نگارش سے لطف حاصل کرنا چاہتی ہے، چنانچہ شیخ صنعان نے مریدوں سے کہا کہ چلو روم کا سفر کریں تاکہ اس خواب کی تعبیر معلوم ہو، چار سو مریدوں کی جمعیت طیار ہو گئی جب قافلہ ملک روم میں پہونچا تو وہاں ایک بہت بڑا محل نظر آیا اور اُس کے جھروکے پر آتش پرست کی ایک مہ جبین لڑکی بیٹھی ہوئی نظر آئی اُسکے حُسن کے نکھار اور اعضا کی موزونیت میں سحر کی کیفیتیں تھیں حضرت عطار نے اُس کے جمال رابعہ کی صفت میں پوری داد سخن سنجی دی ہے ؎

در سپہر حُسن در بُرج جمال ! آفتابے بود الّا بے زوال

هر کہ دل در زلف آں دلدار بست	از خیالِ زلف او زنار بست
ہر دو چشمش فتنۂ عشاق بود	ہر دو ابرویش بخوبی طاق بود
روئے او در زیر زلف تابدار	بود آتش پارۂ بس آبدار
لعل سیرابش جہانے تشنہ داشت	نرگس مستش ہزاراں دشنہ داشت
گوہر خورشید وش در موئے داشت	برقع شعر سیہ بر روئے داشت

یہ تھی اُس کے جمال بدیع کی ایک مختصر تفسیر، شیخ صنعان نے دیکھا تو بیخود ہو گئے اور ایسے کہ نہ اپنی شیخوخیت کا پاس رہا نہ مریدوں کا لحاظ، علم و فضل، زہد و ورع، عبادت و ریاضت کچھ کام نہ آئی۔

شیخ ایماں داد و ترسائی خرید	عاقبت بفروخت و رسوائی خرید

شیخ کی حالت بگڑی، مرید سخت گھبرائے، بعضوں نے ہمدردی سے نصیحت کی، بعضوں کو اس عشق پیرانہ سری پر غصہ آیا، نفرین کی، لیکن شیخ پر بہ برق طور، کام کر چکی تھی اُن کے مذہب عشق میں اب ترسازادی ہی بوجود واجب کی حیثیت رکھتی تھی، وہی اُن کا کعبۂ ایمان تھی، اور وہی اُن کا ساز ہستی! اپنی شد بُد نہ رہی، مریدوں اور شیخ میں اس مسئلہ پر پُر لطف بحث و تمحیص شروع ہوئی اسے منطق الطیر میں ایک نہایت لطیف اسلوب سے بیان کیا گیا ہے ؎

مرید	ہمنشینے گفتش اے شیخ کبار	خیز و ایں وسواس را غسلے بیار
شیخ	شیخ گفتش امشب از خونِ جگر	کردہ ام صد بار غسل اے بیخبر

مرید: وان دگر گفتا کہ تسبیحت کجاست — کے شود کار تو بے تسبیح راست

شیخ: گفت تسبیحم بیفگندم ز دست — تا توانم بر میاں زنار بست

مرید: وان دگر یک گفتش اے پیر کہن — خیز و در خلوت خدا را سجدہ کن

شیخ: گفت اگر مہ روئے من اینجاستے — سجدہ پیش روے او زیباستے

مرید: آں دگر گفتہ کہ اے دانائے راز — خیز و خود را جمع کن اندر نماز

شیخ: گفت کو محراب ابروئے نگار — تا نباشد جز نمازم ہیچ کار

مرید: وان دگر گفتش پشیمانیت نیست — ذرۂ درد مسلمانیت نیست

شیخ: گفت کس نبود پشیماں بیش ازیں — تا چرا عاشق نبودم پیش ازیں

مرید: وان دگر گفتہ کہ ہر کہ آگاہ شد — کاینچناں شیخے چنیں گمراہ شد

شیخ: گفت بس بس فارغم از نام و ننگ — شیشۂ سالوس بشکستم بہ سنگ

مرید: آں دگر گفتش کہ یاران قدیم — از تو رنجورند و ماندہ دل دو نیم

شیخ: گفت چوں ترسا بچہ خوشدل بود — دل ز رنج ایں و آں غافل بود

مرید: آں دگر گفتہ کہ با یاراں بساز — تا رویم امروز سوئے کعبہ باز

شیخ: گفت اگر کعبہ نباشد دیر ہست — ہوشیار کعبہ ام در دیر مست

مرید: آں دگر گفت ایں زماں کن عزم راہ — در حرم بنشین و عذر خود بخواہ

شیخ: گفت سر بر آستان آں نگار — عذر خواہم خواست دست از من بدار

مرید: آں دگر گفتا کہ دوزخ در رہست — مرد دوزخ نیست ہر کہ آگہ است

پیر — گفت اگر دوزخ بود ہمراہ من ۔۔۔ ہفت دوزخ سوزد از یک آہ من

مرید — آں دگر گفتا بہ اُمید بہشت ۔۔۔ باز گردد تو بہ کن زیں کار زشت

پیر — گفت چوں یار بہشتی روئے ہست ۔۔۔ گر بہشتے بایدم آں کوئے ہست

مرید — آں دگر گفتا کہ از حق شرم دار ۔۔۔ حق تعالیٰ را بہ خود آزرم دار

پیر — گفت ایں آتش چو حق در من فگند ۔۔۔ من بہ خود نتوانم از گردن فگند

مرید — آں دگر گفتش بر دایمن بباش ۔۔۔ باز ایمان آور و مومن بباش

پیر — گفت جز کفر از من حیراں مخواہ ۔۔۔ ہر کہ کافر شد از و ایماں مخواہ

مرید — مکالمہ سے آسانی کے ساتھ ہر شخص شیخ کی والہانہ زندگی اور از خود رفتہ شیفتگی کا اندازہ لگا سکتا ہے، خیر بڑی مشکل سے حضرت شیخ کے عشق کی پہلی رات تمام ہوئی، مریدوں کی تمام نصیحتیں، طنز آمیز لہجہ بیکار ثابت ہوئے صبح کے وقت پھر وہی ترسازادی کی گلی تھی اور حضرت شیخ کوچۂ یار کے کتے شیخ کی رفاقت اور انس کا سامان تھے۔ اسی طرح چند دن گذرے، شیخ نہایت رنجور ہوئے لیکن آستان یار سے نہیں ٹلے، آخر کار لڑکی کو بھی اُن کی شیفتگی کا حال معلوم ہو گیا شیخ سے تجاہل عارفانہ رنگ میں خطاب کر کے پوچھا کہ آپ کی اس بیقراری کا کیا سبب ہے؟ اب کیا تھا شیخ نے اپنی کیفیات عشق کا ایک دفتر کھول کر رکھ دیا، لڑکی بگڑی اور ایک ایسے لہجہ میں جس میں ظرافت خفگی اور حقارت کے تمام آثار تھے، شیخ سے کہا کہ حضرت، یہ کہنہ سالی اور آپ کا یہ طوفان عشق! جائیے کافور و کفن کا سامان کیجئے، بھلا آپ کو اس دنیا سے کیا سروکار، شیخ نے کہا ایسی ہزاروں صلواتیں سناؤ تو

کیا، اب ممکن نہیں کہ اس دل سے تمہارا در نکل جائے لڑکی نے کہا اگر آپ سچے ہیں تو مذہب
اسلام ترک کیجئے، بت کو سجدہ کیجئے، قرآن کو جلائیے، شراب نوش کیجئے اور ایمان سے
ہاتھ دھوئیے۔ شیخ نے ترک اسلام کیا، شراب پی اور کہا کہ بقیہ تینوں سے مجھے کوئی علاقہ
نہیں نہ قرآن سے مطلب نہ ایمان سے غرض۔ دختر کی خلق آمیز مہربانی، شراب کا نشہ،
عشق کا جنون، حضرت شیخ آپے میں نہ رہے، آتش پرست انھیں دیر میں لے گئے، زنار
باندھا۔ شیخ نے دختر سے کہا یہ تمام مصیبتیں میں نے تمہارے وصل کے لئے اٹھائیں اب کیا
کہتی ہو؟ اس نے کہا اجی حضرت، آپ بوڑھے ہوئے کس خیال میں پڑے ہیں، میرا
آپ کا جوڑ ہی کیسا؟ دل پر جبر کیجئے۔ اگر روپے کی ضرورت ہے تو لیجئے۔ جہاں سینگ
سمائے چلے جائیے، شیخ نے کہا میں اور آستان یار سے جدائی، جو کچھ گذرے نہیں ہوگا
لڑکی کا دل کچھ ملائم ہوا اس نے کہا میرا مہر یہ ہے کہ میرے یہاں ایک سال تک خوک بانی
(سور چرانا) کرو، شیخ نے یہ بھی اختیار کیا اور ایک سال تک خوک بانی کرتے رہے ابھی تک
مریدوں نے شیخ کا ساتھ دیا تھا، لیکن اب سب کے سب ان سے علیحدہ ہوگئے، ان کی
رفاقت ترک کردی ایک مرید شیخ کے پاس آیا اور کہنے لگا یا تو ہم لوگ بھی آپ ہی کی
طرح ترسائی اختیار کریں اور زنار باندھیں یا جلد از جلد اس سرزمین سے نکل کر خانہ کعبہ
میں مقیم ہو جائیں تاکہ یہ دلگداز منظر نہ دیکھ سکیں، شیخ نے کہا کہ تم لوگوں کا جہاں جی چاہے
چلے جاؤ مجھے تو فقط دریار سے مطلب ہے۔ جب یہ لٹا ہوا قافلہ مکہ میں پہونچا تو سب ادھر
ادھر چھپ گئے، شیخ کا ایک مرید کہیں دوسری جگہ سے خانقاہ میں آیا اور شیخ کی حالت

دریافت کی، حالات معلوم ہوئے تو مریدوں پر خفا ہوا کہ اگر اُنھوں نے ترسائی اختیار کی تھی تو تم بھی ترسائی اختیار کرتے، اُنھوں نے زنار باندھا تو تم بھی زنار باندھتے، بیوفاؤ ایسے وقت میں ترک رفاقت کر بیٹھے۔ چلو اور شیخ کی خبر لو، روم کے سفر کے لئے قافلہ تیار ہوا مُرید روم میں پہونچے تمام لوگ معتکف ہو گئے اور شیخ کے لئے دعائیں کرنے لگے، چالیس شبانہ روز اُنھوں نے گریہ وزاری کی، خواب و خور ترک کیا اسی حال میں تھے کہ چالیسویں دن اس جماعت زہاد کا جو امام تھا اُس نے خواب میں دیکھا کہ محمد مصطفےٰ تشریف لائے، فضا خوشبو سے معطر ہے اور آپ تبسم فرما رہے ہیں لوگ نظارۂ جمال سے حیران ہیں، مُرید سرور کائنات کو دیکھ کر اپنی جگہ سے اُٹھا اور آپ سے فریاد کرنے لگا کہ یارسول اللہ! ہمارے شیخ گمراہ ہو گئے ہیں اُنھیں راہِ حق کی ہدایت کیجئے، آپ نے فرمایا کہ اے بلند ہمت انسان جا، تیری دُعا کارگر ہوئی، تیرے شیخ کو میں نے ہدایت کی، شیخ اور خُدا کے درمیان میں بہت دنوں تک تاریکی تھی، میں نے اُس تاریکی کو دور کر دیا، یہ کلمات جانفزا کہہ کر آپ مرید کی نظروں سے غایب ہو گئے، جب وہ بیدار ہوا تو ایک روح نشاط اس کے جسم کے اندر موج زن تھی، اُس نے سب کو مژدہ سُنایا، سب لوگ شیخ کی خدمت میں گئے، دیکھا تو نہ اب شیخ کے منہ میں ناقوس تھا نہ کمر میں زنار، اُنھوں نے آتش پرستوں کی ٹوپی پھینک دی تھی، اور ترسائی کو خیرباد کہہ ڈالا تھا۔ مریدوں پر جب شیخ کی نظر پڑی، شرم سے کپڑے پھاڑ ڈالے اپنے سر پر خاک ڈال کر عاجزی کا اظہار کیا، کبھی آہ کرتے کبھی حسرت سے زرد ہو جاتے اب آپ کا ضمیر روشن اور دل نورِ ایمان سے مشرف

ہو چکا تھا، تمام بھولے ہوئے کشف و اسرار یاد آگئے۔ اب آپ روم گئے وہ "بُت پرست" نہ تھے بلکہ فیض الٰہی نے آپ کی یزدان پرستی کی طرف رہنمائی کردی تھی، مریدوں نے شیخ کو سمجھایا کہ حضرت اب اس قدر غم و حسرت، خجالت و ندامت کی ضرورت ہی کیا ہے، خدا نے آپ کی حق کی طرف رہنمائی کی، شیخ نے غسل کیا اور مریدوں کے جھرمٹ میں حجاز کی طرف روانہ ہو گئے۔

ادھر اُس آتش پرست لڑکی نے بھی خواب میں دیکھا کہ میری گود میں ایک آفتاب آگیا ہے، اور کہہ رہا ہے کہ شیخ کے ہمراہ جا، اُن کا مذہب اختیار کر، وہ راہِ حجاز چھوڑ کر تیرے مبتلا ہوئے اب تو ان کی راہ اختیار کر، تو اُن کی رہزن تھی، اب ان کی رفیقۂ سفر بن، لڑکی کی آنکھ کھُلی تو دیکھا کہ قلب ایک بقعۂ نور بنا ہوا ہے اور دل میں درد کی ٹیک موجود ہے، ناچار شیخ کے پیچھے روانہ ہوئی، حضرت عطارؒ نے ایک خاص موثر انداز میں لڑکی کے جذبات و کیفت کی ترجمانی کی ہے، فرماتے ہیں۔

درمیان آں ہمہ ناز و طرب	ہمچوں باراں اشک می ریختن لے عجب
نعرہ زن جامہ دراں بیروں دوید	خاک بر سر درمیان خوں دوید
با دلِ پُردرد و شخص ناتواں	از پئے شیخ و مُریداں شد رواں
می ندانست او کہ در صحرا و دشت	از کدامیں سوئے می باید گزشت
عاجز و سرگشتہ می نالید زار	روئے خود در خاک می مالید زار
زاری گفت اے خدائے کارساز	عورتے ام ماندہ ام از کار باز

مرو راہ چو توئے را زدہ زدم | تو مزن بر من کہ بے آگہ زدم
بحر قہاریت را بنشاں زجوش | می ندانستم خطا کردم بہوش
ہر چہ کردم بر من مسکیں مگیر | دیں پذیرفتم، بریں بے دیں مگیر
گر بمیرم از کسے یاریم نیست | حصۂ دیگر بجز خواریم نیست

یعنی اس حسن بدیع اور جمال رائع کے ہوتے ہوئے وہ زار و قطار رو رہی تھی، کبھی کپڑے پھاڑتی، صحرا میں دوڑتی، لیکن فکرِ منزل سے آزاد ہو کر، کبھی خدا سے دعائیں کرتی، خداوندا! میں ایک مجبور عورت ہوں مجھے تو نے اپنا درد دیا، اب میری مدد کر، مجھ بیکس کا کہاں ٹھکانا، جب تیرے ایسے ایسے برگزیدہ بندوں کا یہ حال ہو جاتا ہے تو مجھ پر کیا گذریگی میری دستگیری کر، میں نے شیخ کو برباد کیا لیکن تو مجھے برباد نہ کر اب نہ مجھے کسی سے محبت ہے نہ دوستی اگر میں مروں تو ذلت ہی میرا حصہ ہے۔

ادھر شیخ کو کشف ہوا وہ بادِ صرصر کی طرح اس دلنواز روم کی طرف چلے، مرید چلائے کہ توبہ و استغفار کے بعد پھر عاشقی پر کمر باندھی، انھوں نے اس لڑکی کی حالت بیان کی، قافلہ چلا، اور جہاں وہ خدا رسیدہ عورت تھی پہونچا شیخ کو دیکھ کر عورت کو غش آگیا، شیخ کی اشک ریزی سے اُس کی آنکھیں کھلیں تو زار و قطار رونے لگی، اور اسی حالت زار میں شیخ کے پیر پر گر گئی، شیخ کے وہ تمام نقوش دفا اُس کی نظر کے سامنے آگئے، اُس نے ترسائی ترک کی شیخ کے ہاتھ پر اسلام سے مشرف ہوئی، اور کہا کہ اب یہ میری زندگی کی آخری گھڑیاں ہیں، مجھے معاف کر دیجئے اور میری گستاخیاں درگذر کیجئے، اور یہ کہہ کر آنکھیں

بند کرلیں۔

این بگفت آں ماہ دست از جاں فشاند ☆ نیم جانے بود برجاناں فشاند

شیخ پر اس حادثہ نے گہرا اثر کیا اُن کی حالت بھی نازک ہوگئی، صبح کو لڑکی نے انتقال کیا تھا، دوپہر سے قبل شیخ نے بھی عالم بالا کا سفر کیا، شاید خواجہ فریدالدین عطار کی اس حکایت کے مطالعہ یا اسی قسم کے دوسرے مناظر سے متاثر ہوکر رومی نے وہ غزل کہی بھی جس کا ایک نہایت تاثر انگیز شعر یہ ہے ؎

تو باز خاص بدی در وثاق پیرزنے ☆ چو طبل باز شنیدی بہ لامکاں رفتی

اس کے بعد حضرت عطار نے ایک ایسے موثر اور دلکش انداز میں "صور شعریہ" کی مثال پیش کی ہے، کہ بے اختیار دل لوٹ جاتا ہے، مصر کا ایک جدید ادیب اور دلفریب انشا پرداز ڈاکٹر زکی مبارک اپنی کتاب "موازنہ بین الشعرا" میں عربی شعرا کے اس کلام کی نظیریں پیش کرتا ہے، جن میں فنی اعتبار سے "صور شعریہ" پائے جاتے ہیں "صور شعریہ" یہ ہے کہ کوئی شاعر مناظر قدرت یا جذبات وکیفیات کی ایسی ترجمانی کرے کہ پڑھنے والے کو ہو بہو ایسا معلوم ہو کہ وہ کسی منظر فطریہ کا مشاہدہ کر رہا ہے یا خود اپنے ذہن کے اندر جذبات وکیفیات کا طوفان پا رہا ہے، اسی لئے ایک کامیاب شاعر وہی ہو سکتا ہے جس کے ذہن میں حقیقی مصوری کی صلاحیت ہو، شاعری اور مصوری دونوں ایک ہی مرکزی نقطہ کے دو خطوط ہیں، ہر چند ہر شاعر عملیات کے اعتبار سے مصور نہیں ہوتا، لیکن فنی اعتبار سے شاعر کا مصور ہونا ضروری ہے، اس کے خلاف مصور کے لئے ضروری نہیں کہ

وہ شاعر بھی ہو۔ شاعری مصوری سے ایک بالاتر فن ہے، خیر ان چند اشاری سطور کے بعد میں حضرت عطار کی اس قدرت کلام کا نمونہ پیش کرنا چاہتا ہوں، جس میں "صورِ شعریہ" بہ درجہ کمال موجود ہے اور منطق الطیر کی حکایات کے ان آخری سطور میں فطرت نگاری کا ایک ایسا زبردست نمونہ سامنے آجاتا ہے "جسے سحر نگاری" سے تعبیر کریں تو زیادہ مناسب ہے۔ حضرت عطار صوفی ہونے کے ساتھ ہی ایک بڑے پایہ کے شاعر بھی تھے اور اُن کی شاعری میں وہ تمام نقوش موجود ہیں جنھیں ادب لطیف گراں مایہ قرار دیتا ہے۔

یہ چند آخری سطور ملاحظہ ہوں۔

قبرِ شیخ و قبرِ دختر ساختند — ہر دو را پہلوئے ہم پرداختند
چو دو عاشق دائماً مدہوش ہم — چوں دو موزوں دست در آغوش ہم
زاں دو قبر آں دو یار دردمند — دست از آں حسرت زدہ سرو بلند
وانکہ آنجا ایزد از لطف و کمال — کرد پیدا چشمۂ آب زلال
چند فرسنگ آں جہاں خرم بود — ہمچناں جائے بہ گیتی کم بود
گر رہی آنجا بہ بینی از خوشی — عرصۂ ہمچوں بہشت از دلکشی
گر دراں منزل ترا باشد قرار — چار فصل آنجا نہ بینی جز بہار
ہیچ فصل از میوہ خالی نیستند — تا نہ پنداری کہ عالی نیستند
ہر دو می آرند بار عاشقی — بوالعجب کاریست کار عاشقی
درمیان کعبہ دردم آں مقام — شد زیارتگاہ خلق از خاص و عام

خلاصہ یہ کہ شیخ اور "زاہد فریب جوگن" کی قبر پہلو بہ پہلو بنائی گئی۔ قدرت نے دونوں کی قبر سے دو سرو کے درخت اُگائے، اور وہ دونوں درخت اس طرح ملے ہوئے ہیں گویا وہ جوگن اور شیخ اپنی ہم آغوشی کا پتہ دے رہے ہیں وہاں نظری مناظر ایسے فرحت افزا اور دلکش ہیں کہ دنیا میں اس کی مثال نہیں مل سکتی، لطف یہ دیکھیے وہاں میٹھے پانی کا ایک چشمہ بھی ہے، وہاں نہ خزاں کی ویرانگی ہے، نہ برشگال کی صعوبت، ہمیشہ بہار ہی بہار ہے اور لطف یہ کہ چاروں فصل کے میوے بھی ہمیشہ موجود ہیں یہ مقام کعبہ اور روم کی درمیانی راہ میں ہے یہاں خاص و عام کا میلہ لگا رہتا ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ کسی قدرتی منظر کی اس سے بہتر مثال بھی مل سکتی ہے، فن تعمیر کے ہزاروں دلکش آثار ملتے ہیں، انسانوں نے اپنی دولت و حکومت کے ذریعہ ہزاروں اسباب آرائش اور یادگاریں بنائیں، لیکن شاید ان میں ایسا جمال رائع نہ پایا جائے گا۔ ل

مولانا جامی نے نفحات الانس میں بہتیری صالحات، عابدات کی زندگی کے حالات

ل میں اپنے دوست چودھری عزیز الدین صاحب آروی کی معیت میں جب ایک بار نمیر گیا تو حضرت شاہ یحییٰ نمیری قدس سرہٗ کے مقبرہ اور اس کے گرد و جوانب کے مناظر سے کچھ ایسا متاثر ہوا کہ بیان نہیں کر سکتا بعض اعتبار سے ٹھیک وہی نقشہ تھا جیسا حضرت عطار نے بیان کیا ہے، میں نے ہوش سنبھالا تو خود کو ایک غیر مقلد (اہلحدیث) باپ کی گود میں پایا میں خوش ہوں کہ میرا قدرتی حق یعنی حریت فکری میری تاریخ ولادت سے میرے ساتھ رہی اور یہ غیر مقلدین کے مسلک کا اہم جزو بھی ہے، صوفی ہوں نہ بادیہ پیما زاہد لیکن نمیر کے اس منظر نے سچ مچ ایک ایسے التہاب و ورد سے مجھے آشنا کیا کہ شاید یہ چاشنی مدت العمر نہ بھولونگا

لکھے ہیں میرا خیال ہے کہ عورتوں کے تمام کمالات اور اُن کی نمائش مرد کے اندر وہی تخیلات
متحرک کر دیتے ہیں جو شعور جنسی (Sex Instinct) کے لطائف سے پیدا ہوتے
ہیں لیکن ذوق صوفیانہ اس سے مستغنی ہے اگر ہم کسی خدا رسیدہ عبادت گذار اور پاکدامن
عورت کو دیکھ لیں تو ہمارے اندر احترام Admiration کی کیفیات پیدا ہوتی ہیں،
علمائے نفسیات کے نزدیک "احترام" ایک مخلوط جذبہ ہے جس کے اندر مختلف جذبی عناصر کار
فرما رہتے ہیں، خود زاہدہ عورتیں اُسوقت کوئی نسوانی جھجک محسوس نہیں کرتیں بلکہ اپنے قلب میں ایک
ایسا جذبہ لطیف محسوس کرتی ہیں جسے اصطلاح میں "جذبۂ مادرانہ" (Maternal Instinct)
کہتے ہیں، جامی نے جس انداز میں قرون اولیٰ کی ایک جاریہ (لونڈی) بی بی تحفہ کے پاک حالات
لکھے ہیں اور اُن کے ساتھ حضرت سری سقطی کی عقیدت دنیا لیش کے واقعات پیش کئے ہیں انھیں
دیکھنے کے بعد نسائیات کا یہ اہم مسئلہ حل ہو جاتا ہے کہ عورت کی بہترین زندگی کیونکر گذر سکتی ہے، انکی
حقیقی عظمت عاشقانہ شعر گوئی اور افسانہ تراشی میں ہے یا خانگی انتظامات، بچوں کی پرورش
و تربیت، شوہر کی اطاعت و محبت، اور عبادت و ریاضت میں، عورت اپنے حسن اور
عشوہ فروشی، اپنے ادبی ذوق اور موسیقی نوازی، مغربی تقلید و عریانیت، کورانہ حقوق
طلبی اور مساویانہ کشمکش سے مردوں کے قلوب کو مسخر نہیں کر سکتی، ممکن ہے عارضی جوش خیر مقدم
مردوں کی صحیح ذہنیت کا معیار متعین کرنے میں اُن کیلئے دقتیں پیدا کرے لیکن یہ انہیں یاد
رکھنا چاہیئے کہ عورت ایک ادنیٰ اسی "دو لغزشس پا" کے بعد کائنات کی زشت ترین چیز
بنکر رہجاتی ہے اور کسی کے ہیجان "صنم پرستی" کی فریب خوردہ ہونے کے بعد وہ محسوس کرتی ہے
کہ کاش دوسروں کے حالات "آیۃ الکبریٰ" بن کر اُس کی رہنمائی کرتے۔

سلاطین آستانہ فقرا پر

ایران کا ایک خوش فکر شاعر ظہوری ترشیزی جو اپنی طنزیات رندانہ کے لئے فارسی ادبیات میں ایک خاص امتیاز رکھتا ہے اپنے مزاحیہ لہجہ میں کہتا ہے۔

زاہدا نام کعبہ خود نہ بری
مدہ آلودگی کنشت مرا

یہ وہ دور تھا جب زہد و ورع، فقر و درویشی اپنی شان بے نیازی و استغنا کی بدولت ایک قابل رشک چیز سمجھی جاتی تھی اور شعرا اپنی ندرت پسندیوں کے لئے اس کو ایک شگفتہ اور جاذب نظر موضوع خیال کرتے تھے، جب کسی شے کا کمال حقیقت مسلمہ بن جاتا ہے تو دنیا میں ہمیشہ یہ اصول رہا ہے کہ اس کے نقائص کی جستجو کی جاتی ہے، اس کے معائب طشت از بام کئے جاتے ہیں، اس پر پھبتیاں اُڑائی جاتی ہیں، اور یہی شے اپنے کمال اور رفعت کے دور سے گذر کر ایک فرومایہ چیز بن کر رہ جاتی ہے تو پھر کسی کو اس کی طرف التفات نہیں ہوتی آج ظہوری زندہ ہوتا تو اس کی ندرت پسند طبیعت کبھی اس کو گوارا نہیں کرتی کہ اس قدر عام اور روزمرہ کے مشاہدات کو شعر و سخن کا موضوع قرار دے، بلکہ بجائے یہ خیال کرنے کے کہ زاہد اپنے کعبہ کا نام لے کر میرے بتکدہ کو آلودہ کر رہا ہے، وہ یہ کہتا کہ رند کی معصیت گاہ سے زاہد کے خلوت کدہ کی بو آتی ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ زہد و درویشی کی موجودہ بے مائگی فقرا اور گوشہ نشینوں کی زندگی کے موجودہ افسوسناک تجارب میں کبھی خلوص و پاکبازی کی جلوہ ریزیاں نہ تھیں اب ان کے اخلاق میں سلف کے لطائف طبیعت کی اثر آفرینی نہ سہی، ان کی خلوت میں جلوت میں یگانت مفقود ہو تو ہوا کرے، ان کے پندار و خودی نے ان کو انتہائی انکسار کے پردہ میں کبریائی کا دیوتا بنا کر رکھ دیا ہو، ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک زمانہ ایسا گذر چکا ہے، جب درویش فضل و کمال کا ایک ایسا نمونہ خیال کیا جاتا تھا کہ دنیا کے بڑے بڑے گردن کش اور جابر سلاطین اس کی آستان پاک پر جبہ سائی کو فخر جانتے تھے ایک وہ دور بھی گزرا ہے جب صاحب سطوت بادشاہوں اور ناز و نعم کی گود میں پرورش پانے والے امیروں نے انتہائی لاپرواہی اور بے نیازی کے ساتھ فقر کے مقابلہ میں جاہ و ثروت کو ٹھکرا دیا۔ محلوں کی آسائش میں بسر کرنے والے انسانوں میں ایسے لوگ گزرے ہیں جنھوں نے عرفان ایک جھلک دیکھ کر سارا ساز نشاط درہم برہم کر دیا انھوں نے قصر کی راحت پر بادیہ پیمائی کو ترجیح دی، وہ حسن کی بے مائگی کا احساس کر کے اس سے برداشتہ خاطر ہو گئے وہ بہار سے خزاں کا لطف لینے لگے، شاخسار چمن میں طیور کی نواسرائیاں اُن کے گداز و رقت کا سامان بن گئیں، خیابان گلستان میں نسرین و نسترن کی پتیوں پر شبنم کے چھوٹے چھوٹے قطرے انکو کسی باطنی خلش کی یاد دلا کر رلانے لگے، دنیا ان کے پیچھے سرگرداں تھی اور وہ اس سے غزال وحشی کی طرح گریزاں۔ امرا اور سلاطین ان کے پاس ہدیہ نیاز لے کر جاتے تھے اور ان کی بے نیازیاں ان کو بے پرواہ رکھتی تھیں ہندوستان کے لئے گوتم بدھ کی زندگی یقیناً

یا یہ نازش ہے لیکن مشرق نے اور بھی ایسے ہی بزرگ پیدا کئے۔ لوگ حضرت ابراہیم بن ادہم کا اسم مبارک زبان پر لاتے ہیں ڈاکٹر نکلسن کہتا ہے آپ کی زندگی گوتم کی تاریخ زندگی کو دہراتی ہے ذرا تاریخ و سیر کے صفحات الٹ جائیے آپ کو شاہ شجاع کرمانی (تیسری صدی)، خواجہ احمد بن حمدان (پانچویں صدی)، رکن الدین علاؤ الدولہ (آٹھویں صدی)، احمد بن محمد البیابانکی السمنانی، شاہ علی فراہی (آٹھویں صدی) خواجہ ابو احمد ابدال چشتی (چوتھی صدی) کے اسمائے گرامی نظر آئیں گے۔ یہ لوگ تخت و تاج کے مالک تھے، سلاطین و امرا کے جگر گوشے تھے لیکن زندگی کی فریب کاریوں اور دنیا کی ابلہ فریبیوں کا راز ان پر کھل گیا وہ "مایا جال" کی سحر طرازیوں سے واقف ہو گئے انھوں نے حکومت پر فقر کو ترجیح دی۔

ایک بڑے سے بڑا جابر بادشاہ جب بزم درویشی میں پہونچتا ہے تو فقر کی ہیبت و وقار کے سامنے اس کا سارا پندار حکومت زائل ہو جاتا ہے، اس کا کبر و نخوت اور اس کی انانیت محو ہو جاتی ہے اور وہ خلوص و نیاز کا ایک مجسمہ بن جاتا ہے گویا وہ ایک چینی عقیدت کیش ہے، جو "کوان۔ ان" (Kuan An) دیوی کے بت کے سامنے نذر پیش کر رہا ہے یقین نہ ہو تو ذرا پیچھے مڑ کر ہند کے ماضی کا جائزہ لیجئے سلطان علاؤ الدین کیقباد (بادشاہ روم)، شیخ بہاؤ الدین کے ہاتھ میں ہاتھ دیتا ہے تو اس کے سارے جسم میں کپکپی ہو جاتی ہے، ناصر الدین قباچہ (حاکم ملتان) کے سامنے دو خطوط پیش ہوتے ہیں جو قاضی شرف الدین اصفہانی اور شیخ بہاؤ الدین زکریا نے سلطان شمس الدین التمش کو

سکھے تھے اور ناصر الدین کے لوگوں کی بیدینی اور فسق و فجور کی شکایت کی تھی۔ ناصر الدین سخت برہم ہوتا ہے، قاضی کو اور خواجہ کو بلاتا ہے اور پوچھتا ہے کہ یہ خطوط تم نے لکھے ہیں؟ قاضی گردن جھکا لیتے ہیں۔ سلطان گردن مارنے کا حکم دیتا ہے فوراً وہ راہی عالم بقا ہوتے ہیں، اس کے بعد خواجہ بہاء الدین زکریا سے سوال ہوتا ہے، آپ نہایت بیباکی کے ساتھ فرماتے ہیں کہ ہاں میں نے لکھا ہے اور حکم خدا سے لکھا ہے، تم کیا کر سکتے ہو؟ ابو القاسم فرشتہ کہتا ہے ،، ناصر الدین قباچہ را از استماع آن لرزہ بر اندام افتاد ،، سلطان محمود غزنوی، حضرت خواجہ ابو الحسن خرقانی کو دربار میں بلاتا ہے آپ صاف انکار کرتے ہیں۔ خود حاضر خدمت ہوتا ہے تعظیم کو نہیں کھڑے ہوتے، جب سلطان رخصت ہوتا ہے تو آپ اس کی تعظیم کرتے ہیں۔ محمود پوچھتا ہے، حضور! جب میں خدمت میں حاضر ہوا تو آپ تعظیم کے لئے نہیں کھڑے ہوئے، اب میں رخصت ہوتا ہوں تو تعظیم کیوں کرتے ہیں؟ خواجہ ابو الحسن خرقانی فرماتے ہیں پہلے تم پندار حکومت لے کر آئے تھے، اب انکسار درویشی لے کر جاتے ہو سلطان شمس الدین التمش خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے آستانہ پر جبہ سائی کے لئے آتا تھا حضرت خواجہ معین الدین سنجری جب دہلی میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مہمان ہوتے ہیں تو خواجہ قطب الدین عرض کرتے ہیں، اجازت ہو تو بادشاہ کو خبر کر دی جائے آپ صاف انکار کر دیتے ہیں اور ملنا نہیں چاہتے، علاؤ الدین خلجی باایں شان و شوکت شیخ صدرالدین عارف اور شیخ رکن الدین ابو الفتح کی پیشوائی کے لئے سوار ہو کر جاتا تھا۔ سلطان فیروز شاہ بہمنی اور احمد شاہ بہمنی نے جس خلوص و نیاز کے ساتھ سید محمد گیسو دراز کا خیر مقدم کیا تاریخ

کے صفحات شاہد ہیں۔ شیخ طاہر کے ساتھ برہان نظام شاہ کی عقیدتمندیاں، میر صالح ہمدانی کے ساتھ ابراہیم عادل شاہ کی ارادت، میر محمد مومن استر آبادی کے ساتھ قطب شاہ کا انعقادِ صاف بتا رہا ہے کہ ارباب حکومت نے ہمیشہ آستانۂ فقرا پر جبیں سائی کی ہے یہ اور بات ہے کہ اب خود فقرا امیروں کے در پر لجاجت و تملق کا مظاہرہ کرتے ہوں۔

فقر و درویشی کی اس کایا پلٹ کا آخر کوئی راز بھی ہے؟ یہ سوال ہے جو قدرتی طور پر تاریخ درویشی کا مطالعہ کرنے کے بعد پیدا ہوتا ہے، فقرا کی بوریا نشینی وہی ہے، خانقاہوں کی رونق میں بھی کوئی فرق نہیں، اربعین (چلہ) و ریاضت، ذکر و تسبیح کا ہنگامہ آج بھی دیکھا جاتا ہے، بیعت و ارشاد کے مشاغل میں بھی گرما گرمی ہے بظاہر کوئی ایسی چیز نہیں جو آج فقرا کے یہاں ناپید ہو، پھر اس زوال کا سبب۔ اس کا صرف ایک راز ہے جس کو غالب کے رشتہ سے شاعرانہ نکاہات سمجھئے لیکن ہے یہ ایک حقیقت ؎

کفر و دیں چیست جز آلائشِ پندارِ وجود ۔۔۔ پاک شو پاک کہ ہم کفر تو دینِ تو شود

شاعر کہتا ہے کہ اپنی ہستی کے غرور کا نام کفر ہے۔ اور اسی آلائش ہستی سے پاک ہو جانے کا نام دین ہے، آج درویشوں اور فقرا پر جو بلا مسلط ہے وہ "پندار وجود" ہے اسی لئے شاعر مجبور ہو کر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے ؎

سبحہ و سجادہ دارد صد خطر ۔۔۔ در پناہِ ساغر و پیمانہ باش

غربا تختِ شاہی پر

دنیا ایک بازیگاہ فطرت ہے جہاں خرق والتیام شکست و تعمیر، علو و حضیض، غم و مسرت، اور اسی قسم کے سینکڑوں مظاہرے ہمارے لئے دعوت پریشاں نظری بن گئے ہیں۔ مناظر کی ان بوقلمونیوں کے ساتھ انسانی زندگی کی ایک اہم تقسیم نظر آتی ہے جسے امتیاز فقر و ثروت، یا غربت و امارت سے تعبیر کیا جاتا ہے، ایک طرف تو ایک پر شکوہ قصر نظر آتا ہے اور دوسری طرف ایک خرابہ عبرت آگیں، ایک طرف زنگ و بو ریشم و حریر، نور و طلا کی ایک عجیب و غریب دنیا دکھائی دیتی ہے۔ عالیشان قصر کے بڑے بڑے کمرے زر کار پردے۔ نقرئی و طلائی ظروف، برنجی و سنگی مجسمے ماہرانہ تماشیلوں و صناعیوں کا ایک دلکش جلوہ گاہ بن گئے، احاطہ کی وسعت اور چمن و فواروں، طیور و وحوش نے اس قصر ارضی کو ہماری اس دنیائے آب و گل سے کوئی جداگانہ بستی بنا رکھا ہے۔ پھولوں کی نکہت، طیور کی نغمہ سنجیاں، فواروں کا اُبل اُبل کر خیابان چمن میں بہنا۔ رومانیت کا ایک ایسا بے پناہ منظر پیش کر رہا ہے کہ انسان تخیل کی دنیا میں گم ہو جاتا ہے، "ورڈسورتھ" اور "کالرج" جن کو نقادانِ فن "جھیل کے شعرا" کے نام سے پکارتے ہیں۔ قدرت کی دنیا میں اسی معصوم رومانیت پر مٹے ہوئے تھے اسی

نامناسب ہے ایک غریب کی جھونپڑی کی تنگی و شکستگی، ظلمت و بے کیفی کا دلگداز منظر پیش کر رہی ہے، یہاں ریشم و طلا کی جگہ کاسۂ سفالیں و خرقہ پارینہ نظر آتا ہے۔ یہاں نہ شعر و موسیقی کی وہ رومانی کیفیتیں ہیں نہ رنگ و بو کی دلربائیاں زندگی یہاں تعبیر ہے، "ایک سوز و دردوں سے قدرت کے ساتھ ایک شکوۂ پیہم سے اور الم و حزن کی اس دنیا سے جو کبھی ہومر، گرے اور میر جیسے "دردمند" شعرا پیدا کر دیتی ہے، ایک فلسفی جب امعان نظر سے اس پر غور کرتا ہے تو اس کے دماغ میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے تو وہ قدرت کے اس انتخاب اور ذوق چمن آرائی پر نکتہ چینی کرتا ہے، ایک امیر دوسرا غریب کیوں ہوا، ایک ساز و نشاط دوسرا سوز و غم میں کیوں بسر کرتا ہے دنیا ایک کو سر آنکھوں پر کیوں بٹھاتی ہے اور دوسرے کو بلا کسی جرم و تقصیر کے نظر سے کیوں گراتی ہے؛ خیال و تصور کی خارزار وادیوں میں وہ پہروں آوارہ پھرتا ہے! بہت سے کلیات قائم کرتا ہے اور مسترد کر ڈالتا ہے۔ آخر کار ایک دوسرا سوال پیدا کرتا ہے امیر و غریب دونوں میں پہلے کس کا وجود ہوا؟ اب قدرت کے خلاف اس کے مشبہات ٹلنے لگتے ہیں اور رفتہ رفتہ وہ ایک نخمندانہ تبسم کے ساتھ قنوطیت سے رجائیت کی طرف کھنچنے لگتا ہے۔

اُمید کی ضوفشانیاں اس کے اندر ایک متفاول روح پیدا کر دیتی ہیں اب وہی دماغ جو قدرت کے خلاف شکوہ سنجیوں اور نقاش فطرت کی صلاح کاریوں پر خردہ بینی سے کام لے رہا تھا، ہنگامۂ ہستی اور زور خودی کا امتحان لیتا ہے، جب حقیقت یہ ہے کہ امارت کا وجود غربت کے بعد ہوا تو ظاہر ہے کہ غریبی ہی امارت کے درجہ تک پہنچی ہوگی

اب سوال یہ ہے کہ انسان اپنی موجودہ کمزوری و پستی، اپنی موجودہ بے سروسامانی و فلاکت پر رو رو کر زندگی بسر کر دے یا قدرت کی طرف سے اس کے ذمہ کوئی دوسرا فریضہ ہے، تھوڑی دیر کے لئے اس خشک اور بے کیف بحث کو چھوڑیئے اور شعر و ادب کی دنیا میں آیئے، عہد شاہجہانی کا مشہور شاعر میر صیدی کہتا ہے ؎

براہ انتظارش گر گداز دتن چہ خواہد شد   زاعضا چشمے دپائے چو نرگس بس بود مارا

اُمید کی یہ انتہا ہے صیدی کا یہ شعر شاعرانہ جھوٹ نہیں بلکہ ایک واقعہ ہو ایک عاشق ایام فراق کی مصیبتیں اُٹھاتے اُٹھاتے جاں بلب ہے، قویٰ مضمحل ہو گئے۔ عناصر میں اعتدال باقی نہ رہا، ناکامیاں ساتھ ہیں لیکن اللہ رے آرزو کی بے پناہیاں! وہی عاشق اب بھی محبوب کے انتظار کی مصیبتیں اُٹھانے کے لئے تیار ہے۔ جان جا رہی ہے تو جائے تن خاک میں مل رہا ہے تو ملے، لیکن وہ کہتا ہے کہ نرگس کی آنکھیں اور پیر مجھ سے مل جائیں کہ ٹلنے کے بعد محبوب کے رُخ محبوب کا نظارہ کر سکوں اسی کو انگلستان کا مشہور شاعر "شیلی" کہتا ہے، "اُمید اپنے ویرانہ سے پھر وہ چیز پیدا کرتی ہے جس کا اُسے خیال ہوتا ہے"۔ "ٹینی سن" اسی "طاقتور" اُمید کے متعلق لکھتا ہے "انسان کو انسان بناتی ہے"، "کیمپبل" اُمید کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

زندگی کی تاریک راہ کا جمال تیرا ہی حصہ ہے، وہ جمیل تاریکی جو افسردہ دلولہ کو مصروف بازی بنا دیتی ہے۔

اُمید و یاس کے فلسفہ پر مشرقی و مغربی شعراء کی رنگین بیانیاں سُن چکے آیئے

ماہرین نفسیات کی فلسفہ طرازیاں دیکھئے۔

شینڈ کہتا ہے :۔

"امید آرزو کی تیزی بڑھا دیتی ہے، مصیبت کے رد کرنے میں معاون ہوتی ہے، اور دبا دینے والے جذبات کے اثر سے محفوظ رکھتی ہے اور دونوں صورتوں میں حصول غرض کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، اُمید ہمیشہ مستقبل کو حال سے بہتر صورت میں پیش کرتی ہے اور اس صورت سے آرزو کو مستحکم کرتی ہے"

میک ڈاؤگل رقم طراز ہے :۔

"اُمید حصول کے خوشگوار خیال کی معاون ہوتی ہے، اور رغایت آرزو کو پختہ کرتی ہے اس کے برعکس افسوس میں ناکامی کے الم انگیز خیال سے ہماری آرزو میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے، افسوس میں ہم لوگ جھکے ہوئے سر اور ڈھلے ہوئے بازوؤں سے آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہیں۔ اس صورت میں ہم لوگ اپنی آرزو میں اپنی پوری قوت کے ساتھ تازگی پیدا کرتے ہیں یعنی اس وقت ہم کو اپنی خودی کا خیال آتا ہے، ہم اپنی بیدار وجود میں اشتعال دیتے ہیں۔

اسی طرح فلسفہ قنوطیت کے متعلق شینڈ (Shand) نے کلیات اربعہ پیش کئے ہیں وہ کہتا ہے کہ یاس آرزو میں ایک ایسا زور اور

ارادہ میں ایسی قوت پیدا کرتی ہے، کہ ہم نہایت خطرناک اور غیر متعین حرکات کر بیٹھتے ہیں یاس ساری اُمید کو آرزو سے نکال دیتی ہے اور یاس کا وجود ہی اس وقت ہوتا ہے جب ساری اُمیدیں محو ہو جاتی ہیں یاس اس آرزو کو کمزور کردیتی ہے جو اس سے اثر پذیر ہوتی ہے۔ لیکن اس آرزو کو مضبوط کردیتی ہے جو اس پر فتح پالیتی ہے۔

پروفیسر میک ڈاؤگل "ادبی اصطلاح" "یاس کی ہمت" کے متعلق لکھتا ہے

جب تک ہماری غایت آرزو کا حصول ناممکن نہیں ہو جاتا۔ ہم ہشیاری اور خبرگیری کے ساتھ اپنے مجوزہ لائحہ عمل پر گامزن رہتے ہیں اور ہر زینہ پر صورت حال کے مطابق متردانہ خیال کے ماتحت عمل کرتے ہیں لیکن جب ہم لوگ دیکھتے ہیں کہ ہماری کل ہشیاریاں اور دانشمندانہ مجوزات بے فائدہ ہیں تو ہمارے ہاتھ سے ذاتی تصرف کی عنان چھوٹ جاتی ہے ہماری دانشمندانہ کوششیں درہم برہم ہو جاتی ہیں اور ہم نیم وحشیانہ رجحانات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہم پر ان رجحانات کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ جن کو ہم نے اپنے تدبر و ہوشیاری سے دبا دبا کر رکھا تھا اب ہم آنکھیں بند کر کے خالص بہیمانہ اور وحشیانہ انداز میں تگ و دو کرتے ہیں۔

ہیوم کہتا ہے:۔

"ہم جیسے تکمیل آرزو کے استحالہ سے واقف ہوتے ہیں ویسے ہی خود آرزو

ہی ناپید ہو جاتی ہے۔"

پروفیسر میک ڈاوگل کہتا ہے کہ یہ ایک حقیقت کی پیچیدگی ہے، حق یہ ہے کہ جب ہمارے ذہن میں غایت غرض کے حصول کا ناممکن ہو جانا معلوم ہو جاتا ہے تو اس کے بعد ہماری تمام کوششیں آخر ہو جاتی ہیں ہم لوگ یا تو حصول غایت کی طرف قدم ہی بڑھاتے ہیں ہم لوگ مافات کی طرف مڑ کر دیکھتے ہیں لیکن آرزو "حسرت" کی شکل میں قائم رہتی ہے

شیخ علی حزیں نے اپنے شاعرانہ انداز میں حسرت کا یہی فلسفہ پیش کیا ہے ؎

زحسرت ہر نگاہ من نگاہ واپسیں باشد ‌ ‌ ‌ ازیں دہشت کہ ہجرانے مبادا در کمیں باشد

فرض کرو تم ایک دوست کو مصائب میں مدد دینے کے آرزومند ہو لیکن تم نے بہت تاخیر کر دی اور اس کو مرنے سے بچانے میں ناکافی تدبیریں کیں اس وقت بھی تمہاری آرزو بالکل ناپید نہیں ہو جاتی بلکہ ایک صورت سے یہ زیادہ تیز آہنگ ہو جاتی ہے۔ تم کہتے ہو "میری کیسی خواہش ہوتی ہے کہ میں فی الفور تدبیریں کرتا"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اب بھی تمہارا دل اس آرزو کا مستقر ہے اور گو اب کچھ نہیں ہو سکتا پھر بھی تم سب کچھ کر ڈالنے کے آرزومند ہو اگر تم اس وقت ضرورت کی اہمیت محسوس کرتے، ہر ایسے خیال کے اندر جو ہم ظاہر کرتے ہیں ایک محروم اور خوں شدہ آرزو الم کی رنگ آمیزی کے ساتھ نمایاں ہوتی ہے ایسی طرح رہی ہوئی آرزو جس کی تکمیل اب نہیں ہو سکتی اسی کو حسرت کہتے ہیں اور اگر ذاتی ملامت اس کیفیت میں داخل ہوتی ہے، تو یہ "ندامت" کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

یہ تو فلسفیوں اور شاعروں کی خیال آرائیاں ہوئیں ذرا تاریخ کے ورق الٹ جائیے

صرف اسلامی تاریخ کو لیجیے، آپ کو ایسے ہزاروں افراد اور خاندانوں کا حال ملے گا جنکو زمانہ نے نہایت حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھا لیکن وہ اپنی محنت اور کارگزاریوں کی بدولت دنیا میں آفتاب بن کر چمکے اصل زندگی کی افتتاح جذبات کی پامالی سے شروع ہوتی ہے۔ اگر ناتواں کو یہ احساس ہو جائے کہ وہ کمزور ہے تو پھر اسکی برق قوت کی بڑے بڑے جابرہ اور زور آوروں کے خرمن پندار کو جلا کر خاک سیاہ کر ڈالے گی اگر کوئی بڑا انسان اپنی مشیخت اور بزرگی کا صحیح احساس کرے تو اُس کے بُرے دن زیادہ دور نہیں۔ دنیا میں ازل سے یہی ہوتا آیا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔ بدیہیات کا انکار کیونکر کیا جا سکتا ہے، مختلف شاہی خاندان کے بانیوں کی زندگی پر ایک نظر کیجئے۔ صفاریہ کا بانی یعقوب لیث ایک بُت تراش کا بیٹا تھا سامانیہ کا بانی اسمٰعیل ایک چرواہا تھا یا رہزنی کیا کرتا تھا۔ سلسلہ دیالمہ کا پہلا شخص ابو شجاع بویہ ماہی فروش تھا خوارزم شاہیہ کا مشہور حکمراں سلطان تکش بقول صاحب زبدۃ التواریخ ملک شاہ سلجوقی اور دوسری روایت کے مطابق سلطان سنجر کا طشت دار تھا، مملوکیوں کی حکومت کا حال معلوم ہے۔ دہلی کے غلام بادشاہوں سے کون ناآشنا ہے، دکن کے بہمنی خاندان کا بانی علاء الدین حسین ایک برہمن کا غریب نوکر تھا عادل شاہی خاندان کا بانی یوسف سادی ایک چرکسی غلام کی حیثیت سے بہمنی دربار میں مول لیا گیا تھا اسی طرح قطب شاہیوں کا بانی سلطان قلی قطب شاہ نظام شاہیہ کا بانی ملک نائب نظام الملک بحری اور عماد شاہیہ اور برید شاہیہ کے بانی فتح اللہ عماد الملک اور قاسم برید سب غلام تھے۔

حکومت فاروقیہ کا بانی ملک راجہ فاروقی سلطان فیروز شاہ بہمنی کا ایک معمولی نوکر تھا لیکن

کیا ان عظیم الشان شخصیتوں کو ان کی افتادگی و بیچارگی، ان کی کمزوری و بے سروسامانی نے مضمحل کر دیا کیا یہ واقعہ نہیں کہ جو آنکھیں ان کو ذلیل سمجھ کر نظروں سے گراتی تھیں انھیں نے ان کو آنکھوں سے لگایا، صفاریہ کے رعب و سطوت نے بغداد کے ایوان خلافت میں ہل چل ڈالدی، عضدالدولہ دیلمی کی عظمت کا ادنیٰ کرشمہ یہ ہے کہ وہ خلافت عباسیہ کا حقیقی تاجدار بنا رہا، خوارزمشاہیہ کا ایسا نصیب چمکا کہ مشہور بزرگ خواجہ بہاؤالدین ولد (مولانا رومی کے والد) کی ننھیال ہوا آج صوفیہ فخر و مباہات کی حیثیت سے خواجہ بہاؤالدین ولد کو اس خوارزمشاہی خاندان کا رشتہ دار بتاتے ہیں کیوں؟ اس لئے کہ وہ منصب طشت داری سے بادشاہت تک پہونچ گئے حالانکہ اگر یہ فخر کی بات ہوسکتی ہے تو خوارزمشاہ کے لئے، وہی قطب شاہ غلام سے بادشاہ ہوتا ہے۔ تو شاہ طہماسپ صفوی جیسا رفیع المرتب بادشاہ جو نہ صرف ایک مشہور بزرگ کی اولاد تھا بلکہ فاطمی الاصل بھی تھا اس سے رشتہ جوڑتا ہے۔ اسی طرح فاروقیہ کے اچھے دن آئے تو ان کے یہاں حکومت کے ساتھ بیعت و ارشاد کا بھی سلسلہ شروع ہوا۔ دنیا والوں کی روحانی ارادت بھی انکے شامل ہو گئی۔

اسی طرح شاہی خاندان کے آخری فرمانرواؤں کے حالات و نفسیات پر بھی ذرا غور کر لیجئے، جب عجز کی جگہ پندار و انکسار کی جگہ نخوت اور محنت کی جگہ تن آسانی نے لے لی تو پھر کیا ہوا؟ جا کے ابوعبداللہ (خلیفہ غرناطہ) سے پوچھئے، المستعصم سے سوال کیجئے، شاہ کلیم اللہ بہمنی کے حسرت انگیز واقعات کا مطالعہ کیجئے۔ غلاموں کے آخری فرمانروا

کا حال پڑھیئے، مبارک شاہ خلجی کی درد بھری کہانی سنیئے، یا پھر اپنے عہد سے قریب تر مغلیہ خاندان اور بہادر شاہ ظفر کے مآل پر غور کیجئے خود ظفر کہتے ہیں ؎

نہ پائے گا کوئی ہم کو برنگ نقش قدم ہم ایسا خاک میں اپنا نشاں ملا دینگے

آج جو اپنی کبریائی میں بھولا ہوا ہے کل اس کو دنیا کے سامنے خراب وخستہ ہونا ہے، ماحول پر ایک نظر کیجئے کیا کل جن کا اکابر واعاظم میں شمار ہوتا تھا آج وہ نان جویں اور ستر پوشی کو محتاج نظر نہیں آتے، علم ان سے رخصت ہو چکا عزت ان کی خاک میں مل چکی اب ان کے پاس سوائے بزرگوں کی باقیات کہلانے کے کچھ نہ رہا اور جب تک اس ،، مئے شبانہ کا نشہ" اُن کو رہے گا ان کی نشاۃ الثانیہ کی کوئی اُمید نہیں بلکہ قدرت کا انتقام ان کے لئے اس سے بدتر شکستگی و بے پناہی کا متمنی ہے، تاریخ ہمیں پکار پکار کر کہتی ہے، لیکن ہمارے بدن پر جوئیں نہیں رینگتیں، ہیئت اجتماعیہ کا انقلاب ہمیں درس عبرت دے رہا ہے لیکن ہم اپنی خودی اور روایاتی بزرگی پر مطمئن ہیں

،، مساوات ،، کے اغراض ومقاصد اور ان کی اہمیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے، فرقہ وارانہ ارشاد وبلاغ کے لئے اس کی افادیت مسلم، لیکن ذرا غور تو کیجئے کہ اس ،، کمزور وناتواں ،، کا اطلاق مسلمانوں کے کن کن طبقات پر ہوتا ہے، اب وقت تو یہ ہے کہ مسلم جماعت کے ہر ہر طبقہ کی اصلاح کی جائے۔ نہ صرف ،، بنی فاطمہ" کی اصلاح وبہبودی سے اسلام کی ترقی ہے، نہ جمیعۃ الانصار ومومن کے فروغ سے مسلمانوں کا ہر طبقہ آج ذلت وافتادگی کی حالت میں ہے یہ اور بات ہے کہ بعض لوگ اپنے خلوتکدوں میں

بیٹھ کر ماضی کے چند خود وضع داستانوں کو دُہرا کر اپنی مٹی ہوئی عظمت و برتری پر ماتم کر لیا کرتے ہیں۔ اور یہی اُن کے لئے مایۂ نازش ہے۔ ممکن ہے آج بھی مسلمانوں کے بعض طبقات غریب مسلمانوں کو ذلیل سمجھتے ہوں اہل حرفہ کو اپنے سے نیچا خیال کرتے ہوں لیکن یہ وقت ان سے انتقام لینے اور شیرازہ اسلامی میں انتشار پیدا کرنے کا نہیں کوئی گدائے خاکستر نشیں اگر اپنی حماقت کی بنا پر خود کو مالک تاج و تخت سمجھ بیٹھے تو کیا ہم اسے اُلجھیں گے یا اُس کے خبط (MANIA) کو حسنِ تدبیر سے دور کرنے کی سعی کرینگے مُسلمان اگر ترقی چاہتے ہیں تو یہ اُن کو فرقہ وارانہ جذبات کی پرورش میں میسر ہونے والی چیز نہیں۔ بلکہ ایک عالمگیر "انسانی درد" ایک کُلی اخوت سے حاصل ہو سکتی ہے یہ وقت فرقہ بندیوں کے بے مایہ و رکیک تخیل میں اُلجھنے کا نہیں بلکہ سب کو ایک روحانی دائرہ میں جمع کر دینے کا ہے البتہ دنیا کو ایک مخلص پیامبر کی ضرورت ہے، جو نبی برحق کے نقوش قدم پر چل کر عصبیت و جہل، تکبرِ نفس اور پندارِ وجود کو مٹا دے اور وہی خلوص وہی محبت پیدا کر دے جو مہاجرین کو انصار سے اور انصار کو مہاجرین کے ساتھ تھا آہ! آج ہم وہ پیام فراموش کر بیٹھے، لوٹ کا مال ہے مہاجرین و انصار دونوں برابر کے حقدار ہیں، دونوں نے لڑائی میں سینہ سپر کیا ہے، لیکن انصار کی حالت اچھی ہے۔ مہاجرین خانماں برباد ہیں۔ بے پناہ ہیں مغرورِ قریش کے وہی افراد جو کبھی انصار کو میدان رزم سے یہ کہہ کر واپس کر دیتے تھے کہ تم ہماری برابری کے نہیں، آج انصار کے زیر سایہ ہیں کیا اس وقت انصار نے انتقام لیا، کیا اسوقت اُنھوں نے بھولی بسری باتوں کو دُہرا کر مہاجرین کو شرمایا؟ نہیں

والذین تبوءو الدار والایمان من قبلھم یحبون من ھاجر الیھم ولا یجدون فی صدورھم حاجۃ مما اوتوا ویؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ (حشر)

وہ لوگ جو ان سے (مہاجرین سے) پہلے گھر والے مومن ہیں جو کچھ ان (مہاجرین) کو دیا جاتا ہے اس کی ضرورت (اپنے لئے) نہیں محسوس کرتے اور اپنی جانوں سے ایثار کرتے ہیں گو تنگدستی

خدا کیلئے آپ اعلیٰ خیال کئے جاتے ہوں یا ادنیٰ، آپ پہلے اپنے خیالات کو استوار کر لیجئے، اگر آپ کو کوئی بڑا خیال کرے تو اس پر مغرور نہ ہو جئے کیونکہ اسی استعلا اور استکبار نے فراعنہ مصر کو برباد کیا اگر آپکو کوئی چھوٹا اور ذلیل سمجھے تو سمجھنے والے کی فہم کا قصور ہے وہ یہی نہیں کہ آپ کی توہین کر کے اپنی تنگ دلی اور سطح نظر کا ثبوت دے رہا ہے، بلکہ آپ کو ایک شاندار مستقبل کا پیام دیتا ہے۔ اس کو سمجھئے کہ وہ میرا ایک بھائی ہے جو ہم کو ذلیل کر کے اپنے ہی ماں باپ کو رسوا کر رہا ہے۔

«مساوات»، غریب اور کمزور مسلمانوں کا ہمدرد ہی ایسا اللہ بروحہ منا اگر سوال یہ ہے کہ زور آور مسلمان کون ہیں؟ شاید «مساوات» کا مطلب قریشی اور غیر قریشی مسلمانوں میں امتیاز کرنا ہو اگر یہ ہی تو واقعات اس کے مخالف ہیں آج صرف صوبہ بہار کے قصبات اور دور دست دیہاتوں میں گھوم کر دیکھئے ہزاروں سادات و شیوخ کے بچے علم و اخلاق سے معرا اور اسی طرح فقر و فاقہ میں مبتلا ہیں۔ ممکن ہو ان میں روایتی "بزرگی" کا فخر باقی ہو، لیکن ان کے کردار نے ان کو حد درجہ قابلِ رحم بنا دیا ہے کیا «مساوات» ان کی حمایت کے لئے بھی تیار ہے؟

خاتونِ صحرا کے نام

ساون بھادوں کے مہینہ میں جبکہ سارا "تھال" ایک دشتِ زمردین بنا ہوتا ہے "دُھوا" ندی جوش پر ہوتی اور اس کی خوفناک موجیں اس کا حوصلہ آزما ہوتیں، تلاطم، اس کی بیتاب روانی بڑے بڑے شناور دیہاتیوں کو بھی تنہا عبور کرنے نہیں دیتی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ حمزہ پور سے بھوجپور تک سارا لق و دق بیابان ایک بحیرہ کی شکل اختیار کر لیتا۔ فصلیں برباد ہو جاتیں، میں شیروانی، پاجامہ، ترکی ٹوپی، جوتے ایک بقچہ میں باندھ لیتا۔ چھتری بغل میں دباتا، قمیص جسم میں چپکی ہوتی، بھیگی ہوئی لنگی پیٹی ہوتی، پیر ٹخنوں تک کیوال مٹی سے آلودہ ہوتے، لیکن "جمالِ کعبہ" کا فرطِ شوق، منزل کی دشواریوں کو کبھی خیال میں نہ لاتا۔ میں چلا کھڑا ہوتا، اور کبھی دن کو برسات کی بوچھاروں میں کبھی آدھی رات گئے جبکہ ساری کائنات ایک ظلمت کدہ معلوم ہوتی۔ کشتی سے اس ساحلِ دلنواز پر اُتر جاتا۔ جو اُجین کی سی کافر آفریں اور حسن خیز سرزمین کی طرح اپنے دامن میں ایک حدیثِ جمال چُھپائے ہوئے ہے۔

جیٹھ کا مہینہ ہے سارا دن قومِ عاد والے "صرصرِ عاتیہ" کی نذر ہے۔ ٹھیک اس وقت جبکہ آفتاب نصف النہار پر ہوتا اور بادِ سموم کا تموج انسانوں کو میدان سے ہٹا کر

گھروں اور جھونپڑیوں میں زاویہ نشین بنا دیتا میں فتوحہ سے پاپیادہ خسرو پور آتا اور حمزہ پور
طے کرتا ہوا تین میل تک پھیلے ہوئے اُس پُر خطر وادی میں قدم رکھ دیتا جس میں اکثر مسافر
پانی کے لئے تڑپ تڑپ کر مر چکے ہیں اس سُنسان دشت میں جس کو "دو ہوا" کی رعنائیاں
اور "بین" کی جوش آفرینیاں بڑی دور تک وادی نجد کی طرح ریگ زار بنا دیتی ہیں
ایک ہُو کا عالم ہوتا ہاں دور دور پر کاشتکار مصطفیٰ پور، ہتون چک زرنگر وغیرہ
بستیوں کے سامنے منہ چپیٹے "دو ہوا ہیں" کرتے ہوتے میں شہری زندگی کے اسی پیکر میں
اس آستانِ محبوب پر پہنچتا، جس پر خدا جانے موسم کی صعوبتوں کے باوجود میں کتنی بار جبہہ
سائیاں کر چکا ہوں۔

بستی سے ابھی نصف میل کی فصل ہوتی کہ گاؤں کے بچے، رشتہ کی بزرگ عورتیں، میرے
سالہ کی بیوی میری پھوپھی (جو میری خوشدامن بھی ہیں) میری چھوٹی بچّی کو لیکر دروازہ پر میرا
انتظار کرتی ہوتیں، میں تیزی سے ایک محبوبانہ پندار کے ساتھ قدم بڑھائے جاتا۔ گاؤں
کا ہر فرد مجھ سے ایک اُنس رکھتا تھا اور اس کا ہر ذرّہ میرے لئے سامانِ سکون تھا گھنٹوں
مجھ سے خیریت پوچھی جاتی فرداً فرداً مرد عورتیں آکر ملتیں، میری بھاوجیں جمع ہوتیں
اور مجھے اس قدر سیراب لطف کر جاتیں کہ میں کچھ گرانی سی محسوس کرنے لگتا اور پھر مجبوراً
راستہ کی صعوبت کا بہانہ کر کے، بستر پر لیٹا ہوا آنکھیں بند کر لیتا، جب میں واپس آتا تو پھر
وہ سماں بھی حد درجہ لذت آگیں ہوتا۔ مجھے وداع کرنے کے لئے سارے لوگ جمع ہوتے اور
کبھی ایسا نہ ہوتا کہ لذت سے سرشار ہو کر میری آنکھیں پُرنم نہ ہو جاتیں، زندگی کے سات

سال دسمبر ۱۹۲۷ء سے جنوری ۱۹۳۵ء تک محبوبیت کی اسی منزل میں بسر ہو گئے۔ ماضی کا جائزہ لیتا ہوں تو اب یہ خواب کی باتیں معلوم ہوتی ہیں نومبر ۱۹۳۴ء میں خدا نے مجھے تیسرا فرزند دیا اسے میں نے مجد الدین (ر؟ بندادی) کے نام سے پکارا ولادت کے سلسلہ میں کچھ طبیعت ناساز ہوئی گھر میں کوئی دیکھنے والا نہ تھا، بہیم اصرار ہوا، میں نے وجہ معقول دیکھ کر سب کو بھوجپور پہنچا دیا، میں واپس ہونے لگا تو میری "انیرہ" نے ایک ایسی نگاہ حسرت آگیں سے دیکھا جو پیکاں کی طرح میرے دل میں پیوست ہو کر رہ گئی۔

گاؤں سے باہر ہوا تو میں نے مُڑ کر اپنی سُسرال کے مکان پر نظر ڈالی۔ خدا جانے شعور نے مستقبل کے ان سوگوار ایام کا کیونکر ادراک کر لیا کہ دل بھر آیا سخت رقت طاری ہوئی، ظہوری کہتا ہے ؎

ہوشش آگاہی دگر دارد — تا ظہوری شدہ است بیہوشت

مجھ پر ایک غیر معمولی کیفیت غم طاری تھا، میں اس سے قبل بھی انیرہ کو چھوڑ کر آیا تھا اور اس میں شک نہیں کہ یہ وقت میرے لئے ازبس صبر آزما ہوتا تھا لیکن اس مرتبہ درد وحزن نے والہانہ انداز اختیار کر لیا تھا۔ انہیں حقائق کی بنا پر انسانی مسلمات کی حد بندیاں ٹوٹ جاتی ہیں، ہمارا تعقل وتدبر ہماری نکتہ دانی واصول فہمی الغرض ہمارا سارا کارگاہ حکمت وفراست ناکارہ ثابت ہوتا ہے اور ہمیں روایاتی سطح سے ہٹا کر ایک ایسی دنیا میں پہونچا دیتا ہے جہاں ہم ماورائے عقل وشعور کی کارفرمائیوں کا مشاہدہ کرتے ہیں والکر ایٹکنسن کہتا ہے۔

"دنیا میں شعراء اور فلاسفہ کی دو جماعتیں ہوتی ہیں ایک جماعت تو اپنے داخلی تاثرات کی بناء پر کوئی پیام دیتی ہے دوسری جماعت انسانی عقل و تجارب اور مسلّمات متداولہ کی بنا پر کسی خیال کا اظہار کرتی ہے، یہ فرقِ امتیاز آپ کو ہربرٹ اور پوپ جیسے شعراء، اسپینوزا، کینٹ، اور کالرج جیسے فلاسفہ اور لاک، بیلے، میکنٹوش اور اسٹوارٹ جیسے فلسفیوں میں ملے گا۔ یہ امتیازی شان آپ دنیا کے بڑے بڑے باکمال خطیبوں اور اِدھر اُدھر کے مست صوفیوں میں پا سکتے ہیں ان میں ایک جماعت تو اپنے اندر سے بولتی ہے اور دوسری باہر سے کلام کرتی ہے[1]۔"

اگر فطرت بخل سے کام لیتی اور انسان کو تعقل و تدبر کی سطح سے بلند کر کے کبھی کبھی اس نوع کا کشفِ حجاب نہ کرتی تو واقعہ یہ ہے کہ مذہب کے مسائل روح و معاد وغیرہ کی تبلیغ بڑی حد تک ناکامیاب رہ جاتی مشرق تو ہمیشہ سے اس روحانیت کا گہوارہ رہا ہے۔ مغربی علماء بھی جن کو ناموسِ فطرت کی رازدانی کا بڑا ادعا ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر اپنی درماندگی کا اعتراف کر چکے ہیں۔ چنانچہ جرمنی کے مشہور قیافہ شناس جان کیسپر لاوٹیر کے ایک واقعہ زندگی سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

اگست ۱۷۷۸ء میں جان کیسپر لاوٹیر نے "رچرڈ سویل" (Richard Sual) کا سفر کیا تاکہ اپنے دوست ڈاکٹر ہوز سے ملاقات کرے جب وہ وہاں پہنچا تو اس نے اپنی اہلیہ کو ایک خط لکھا کہ میری صحت اچھی ہے اور کوئی حادثہ واقع نہ ہوا، لیکن

---

[1] Subconcious & Superconcious planes of mind

دوسرے ہی دن اُس کی اہلیہ بے چینی سی محسوس کرنے لگی. اس کی روح مضطرب ہوتی گئی اور اس کے دماغ پر ایک عجیب تاثر کی کارفرمائیاں ہونے لگیں اس پر یہ خیال بُری طرح طاری ہونے لگا کہ اس کا شوہر کسی خطرناک مصیبت میں گرفتار ہوا، یا کسی ہلاکت آفریں خطرہ میں گھرا ہے. وہ بالائی کمرہ سے نکل کر زینہ سے اُتری اور اپنے خسر سے اپنی تشویش اور درد کا حال بیان کیا اس نے کہا کہ کل ہی تم کو ایک خط تمہارے شوہر کے ہاتھ کا لکھا ہوا ملا ہے جس میں اس نے اپنی صحت وسلامتی کی خبر درج کی ہے پھر کوئی وجہ نہیں کہ تم ان توہمات کو راہ دو، اس جواب نے تھوڑی دیر کے لئے عورت پر ایک سکون آفریں اثر کیا لیکن جیسے ہی وہ اپنے کمرہ میں آئی. انھیں غمناک خیالات سے مغلوب ہوگئی. وہ گھٹنوں کے بل زمین پر ٹیک گئی اور التہاب غم میں زار وقطار روکر اپنے شوہر کی صحت وسلامتی کے لئے دُعائیں کرنے لگی، یہ وہ ساعت تھی جبکہ لاڈیر ایک چھوٹی سی کشتی پر ”مدز درتج“ کی جھیل سے گزر رہا تھا تاکہ ”ایم ڈینیکر“ سے جو ایک معزز وزیر تھا ملاقات کرے اسی وقت ایسا طوفان اُٹھا کہ مستول وغیرہ نذر آب ہوگئے، اور ملاح خود ہی کشتی کو بچانے سے مایوس ہوگئے تھے لاڈیر کو بھی موت سے قریب ہونے کے خطرات تھے، جو بالکل قطعی معلوم ہوتے تھے، بہت ہی تشویش ناک تاثر کے ساتھ وہ اپنی بیوی اور بچوں کو یاد کررہا تھا اور دل میں کہہ رہا تھا کہ اب وہ ان کو اس عالم آب وگِل میں نہ دیکھ سکے گا. اسی حالت میں وہ اپنی رستگاری کی دُعا کرنے لگا. یہاں تک کہ خدا نے مدد کی اور کشتی طوفان سے نکل آئی

اور جو لوگ اس پر تھے، صحت و سلامتی کے ساتھ ساحل پر پہنچ گئے[1]۔

"ایم لاویٹر" نے اس طرح کا ایک واقعہ جو پروفیسر بولز ر کے متعلق ہے اپنے ایک دوست کو ایک خط میں لکھا ہے، "پروفیسر نے لاویٹر سے کہا کہ جب اس کی عمر بائیس سال کی تھی تو یکایک اس پر ایک غیر معمولی غم و تشویش کا غلبہ ہوا لیکن ظاہر حالت کے ماتحت اس کا سبب اس کو معلوم نہ ہوتا تھا اس کے دماغ پر یہ خیال غالب ہوا کہ اس کی ہونے والی بیوی اس وقت ایک سخت خطرناک حادثہ میں مبتلا ہو گئی ہے، درآنحالیکہ اس وقت تک نہ تو اس نے شادی کا تہیہ کیا تھا نہ اس ہستی سے جو آئندہ چل کر اس کی بیوی ہوئی اس کو کوئی واقفیت تھی دس برس کے بعد جب اس کی شادی ہوئی اس وقت وہ یہ حادثہ بالکل فراموش کر چکا تھا اس کو اپنی بیوی سے معلوم ہوا کہ جب وہ دس سال کی تھی تو وہ اس بری طرح گر پڑی تھی کہ گویا مر چکی تھی اور اس کے جراحت انگیز اثر سے اس کو کامل افاقہ نہ ہوا۔

صوفی ادبیات میں اس نوع کی بےشمار روائتیں پائی جاتی ہیں مادیین ان روایات کشف و کرامت کو افسانوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے اس میں شک نہیں اس صنف کے بہت سے اجزاء مُریدوں کی خوش اعتقادی کی پیداوار ہیں لیکن ہم کو یہ بھی حق نہیں کہ سرے سے ان واقعات کا انکار کر دیں عام انسانوں کی زندگی میں

---

[1] ترجمہ ٹامس ہلکرافٹ *Essays on Physiognomy By Lavater.* (*English Edition.*)

جب مادہ اور شعور کی ایسی عجوبہ آفرینیاں پائی جاتی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ کسی برگزیدہ صوفی کے صدورِ کرامت کے ہم منکر ہوں ڈاکٹر اٹیکنسن کہتا ہے "جو قلب خود کو عقل کے حوالے کر دیتا ہے وہ خود کو اس کے تمام کاموں سے وابستہ پاتا ہے اور مخصوص معارف اور قدرتیں اس کے زیرِ نگیں ہو جاتی ہیں، ہر انسان کے اندر صلاحیت موجود ہے کہ وہ "عقلِ کل" سے سیراب ہو، بڑے بڑے صوفیا و انبیا سے وجد، حال اور الہام وغیرہ کے واقعات منسوب ہیں وہ انفرادی حالت کے فرق و امتیاز کے مظاہرے ہیں، سقراط کا حال، فلاطینوس کا وصل، افرافیری کا شہود، پولوس کا تزکیہ بہمن کا "اور ورہ"، سویڈنبرگ کی تجلی انفرادی صلاحیت کے نتائج ہیں لیکن ان تمام مظاہروں کے عناصر ہم عام زندگی میں بھی پاتے ہیں گو وہ اس اعلیٰ پیمانہ پر نمایاں نہیں رہتے۔"

الغرض میں چل رہا تھا، دل بیٹھا جا رہا تھا، آنکھیں اشکبار تھیں، بستی پر جو نگاہ پڑتی تھی وہ نگاہ واپسیں بن کر ٹھیر جاتی تھی یہاں تک کہ اسی استغراق میں بستی سے دور نکل گیا اب اس کے در و دیوار آنکھوں سے اوجھل ہونے لگے۔ لیکن میرے غمناک تصور کا سلسلہ اس وقت تک ختم نہ ہوا جب تک میں مکان پہنچکر "غمِ روزگار" میں مبتلا نہ ہو گیا۔

ابھی پندرہ دن بھی نہیں گزرے تھے کہ ۲۴ رجنوری ۳۵ء کو جمیل بھائی کا ایک تار ملا "تمہاری اہلیہ خطرناک طور پر بیمار ہیں"، بس اب نہ پوچھئے۔ میر ضیاء کا ایک شعر ہے

بات تھی کچھ یاس کی یا ہجر کا پیغام تھا
کیا کہا قاصد صبا سنتے ہی جھٹکے مر گیا

باحالِ زار شب ہی کو روانہ ہوا۔ اور دن کے ۹ بجے بھوجپور پہنچا، میری بیوی

کی حالت میرے خیال میں خطرناک نہ تھی، میں نے تار کو جمیل بھائی کے اضطراب کا نتیجہ تصور کیا لیکن آہ! ابھی تیسرا ہی دن تھا کہ اتوار کے روز تقریباً ایک بجے دن کو میری آغوش میں ایرہ نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کرلیں۔

ایرہ کے خاندان میں بہت سے لوگ ہیں پانچ پانچ بھاوجیں، خالہ کے بیٹے، چچا کے بیٹے، حقیقی بھائی ان کے بچے ماں، باپ، پھوپی، خالہ، گاؤں کی عورتیں، الغرض کوئی ایسا نہ تھا جس نے نوجوان خاتون کی موت پر آنسو نہ بہائے ہوں، سارے گھر میں ایک کہرام مچا تھا، ایک ٹیس پڑی تھی۔

یہ ماتم کس دوانے کا ہے یارب آج صحرا میں
کہ سیلیں روتی پھرتی ہیں بگولے خاک اڑاتے ہیں

مجھے تو یاد نہیں آتا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے کسی کی موت پر ایسی خونفشانیاں دیکھی ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری کائنات میں تاریکی چھاگئی، زندگی کے لئے اب کوئی لطف باقی رہا نہ کوئی کیف، سیلاب اشک تھمتا نہ تھا ہفتے گزرے، مہینے گزرے یہاں تک کہ سال گزرا لیکن میرا دور حزن ختم نہ ہوا۔ میری خیالی دنیا اب بھی "ایرہ" سے آباد تھی خواب میں وہ آتیں، مسکراتیں، مہر و پیار کی باتیں کرتیں اور ماضی کے ایام نشاط کی یاد دلا جاتیں، مجھے ہیولاک ایلس کے اس نظریہ سے بالکل اتفاق ہے کہ محض شباب کی سرمستیاں ہی عورت و مرد کی محبت میں کارفرما نہیں ہوا کرتیں "گوئٹے" کو "فرودان اسٹین" "ڈیگنز" کو "میتھلڈ ڈیلسنڈراک" اور "رابرٹ" کو "ایلزبتھ براؤننگ"

کے ساتھ جو عشقیہ لگاؤ تھا، وہ شہوانی دلربائیوں کا مظاہرہ نہ تھا، "انیرہ" میری پھوپھی زاد بہن بھی تھیں، ان کی معصومانہ اور سادہ زندگی، ان کی خدمت گزاری اور اطاعت شعاری ان کی شیریں کلامی اور عفت مآبی، الغرض ان کی شخصیت و کردار کے مختلف پہلوؤں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جاپانیوں کے عقیدہ کے مطابق وہ کوہ فیوجی کی "سنجن" دیوی ہیں یا چین کی "کوین ین" تقریباً ایک سال میرے بچے میاں محب اللہ اور حمیرہ اپنی ننہیال ہی میں رہے۔ میں برابر بھوجپور جاتا لیکن اس حال میں کہ "گریاں و خاک اڑاتا جوں ابر جوں بگولا"۔ کبھی "ٹال" کے سنسان بیابان کو مخاطب کرتا اور اپنی حدیث درد کہتا کبھی "دھوا" ندی پر ایک نظر ڈالتا اور وہ وقت یاد کرتا جبکہ ندی میں کشتی ہوتی تھی اور اس پر انیرہ کا محافہ رکھا جاتا تھا بے اختیار آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔ ضیا کیا خوب کہہ گیا ہے۔

کبھی جا گل کو دیکھے ہیں، کبھی دیکھے ہیں نرگس کو
خدا جانے یہ چشم اپنی پھرے ہے ڈھونڈھتی کس کو

قائم بھی "پریشان نظری" کو "بینائی" کا جرم بتاتا ہے اور ایک حد تک اس کا خیال صحیح ہے۔

سات ماہ تک میرا چھوٹا بچہ (مجدالدین)، جو میری انیرہ کی آخری نشانی تھا کسی نہ کسی طرح زندہ رہا۔ پھوپھی نے سارے جتن کر ڈالے مہینوں، راتیں آنکھوں میں کاٹ ڈالیں خدمت و پرورش کے لئے جتنی کوششیں ہو سکتی ہیں صرف کی گئیں، لیکن "لکل اجل کتاب"، وہ بھی ہمیشہ کے لئے ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا میں اس

ننھی سی جان کو آغوش مادر سے محروم دیکھتا تو میرا دل قابو میں نہیں رہتا تھا حضرت زینبؓ کا چھوٹا بچہ دم توڑ رہا تھا بی بی نے سرورِ کائنات کو بلا بھیجا دو مرتبہ پیام آیا، آپ تشریف لے گئے۔ آپ نے بچہ کو دیکھا بخاری کی روایت کے مطابق "عیناہ تذرفان" آپ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، حضرت سعد بن عبادہؓ نے کہا یا رسول اللہ یہ کیا آپ نے ان کو رافت و رقت کی حقیقت بتائی اور فرمایا "انما یرحم اللّٰہ من عبادہ الرحماء" مجدالدین کو دیکھ کر میری حالت ناگفتنی ہو جاتی تھی، سیلاب اشک تھمتا نہ تھا یہاں تک کہ سات ماہ کی مسلسل "گریہ حسرت" کے بعد بقول قائم وہ منزل بھی آگئی کہ ؎

دل بھرا ہے نہ اب نم رہا ہے آنکھوں میں
کبھی جو روئے تھے خوں جم رہا ہے آنکھوں میں

اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ ظہوری کے "آرزو ہا ہمہ زدیدہ چکید" کے صحیح معنی کیا ہیں۔

آخر وہ کون سی قوت تھی جس نے اس آنے والے حادثۂ فاجعہ کا قبل از وقت ادراک کر لیا، میں کچھ سمجھ نہیں رہا تھا لیکن غیر ارادی طور پر اشک ریزیاں کر رہا تھا دل کیوں بیٹھا جاتا تھا، مڑ مڑ کر بستی کے در و دیوار پر ایک حسرت آگیں نگاہ کیوں ڈالتا تھا۔ ولیم والکر اٹکنسن نے اپنی کتاب "تحت شعوری و ماوراء شعوری سطح دماغ" میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے:

بیرٹ (Barret) کہتا ہے "بہت سی ارفع اور مقتدر تر قوتیں ہماری قوت شاعرہ، ارادہ، اور عقل کے ماوراء ہیں بہت سی ماورا طبعی اور لطیف قوتیں ہیں۔ جن کی بہ حالت موجودہ ہم صرف کبھی کبھی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ ہماری قوت شاعرہ اس منتہائے حقیقت کا محض ایک عکس یا دُھندلا ادراک ہے۔"

ڈاکٹر مرّے (Murray) کا قول ہے "ہماری روح اپنی قوت شاعرہ کے ساتھ جس گہرائی تک پہنچ سکتی ہے اس سے زیادہ عمق میں روح وادہ میں پیوستہ انسان کو اتصال باری نصیب ہوتا ہے اور ہماری عقل اور احساسات یا ادراک سے زیادہ گہرائی میں چھپی ہوئی زندگی کی غیر مرئی گہرائی میں خدا کی روح جلوہ ریز ہے۔"

شوفیلڈ (Schofield) کہتا ہے "ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا دماغ محض مرئی یا شوری حصہ تک۔ یا جس کو ہم تحت شوری کہتے ہیں۔ اسی تک محدود نہیں بلکہ ہمارے دماغ کا تعلق ماورا شعور سے بھی ہے جو آخری حد پر قائم ہے یہ مخزن ہے ساری نفسی و روحی زندگی کا جس سے ہم لوگ بعض اوقات سرسری طور پر واقف ہو جاتے ہیں لیکن جو ہمیشہ موجود ہے ابدی بوقلمونیوں سے ہمارا رشتہ ملا دیتا ہے۔ شہود، مراقبہ، ریاضت بلکہ خواب بھی بلاشک و شبہ روحانی الہامات کے مواقع ہیں اور ثبوت میں بہت سی ایسی نظیریں پیش کی جاسکتی ہیں۔ جن سے معلوم ہوگا کہ روح کے کارنامے عقل یا دماغ کے اعمال سے جداگانہ ہوا کرتے ہیں۔"

وان ہارٹمین کہتا ہے "اکثر انسان جبکہ اپنے "شوری" خیال کے ذریعہ اپنی

مدد نہیں کرسکتا ایک "غیر شعوری" خیال کنایہ یا احساسات کے ذریعہ اس کے اعمال میں رہنمائی کرتا ہے"

اگر ہم حیات شاعرہ اور غیر شاعرہ کے درمیان موازنہ کریں تو یہ بات ظاہر ہوجائیگی کہ حیات غیر شاعرہ کیلئے ایک سطح مخصوص ہے کیونکہ کبھی یہاں تک حیات شاعرہ کی بدولت ہماری رسائی نہیں ہوسکتی، صوفیہ غالباً اسی کو اپنی اصطلاح میں "مقام" سے تعبیر کرتے ہیں

میں نے شعر بہت کم کہے ہیں جو کچھ بچپن میں اشعار قلم سے نکلے تھے، وہ نومشقانہ آورد کا نتیجہ تھے، ان پر صحیح معنی میں شعر کا اطلاق نہیں ہوسکتا، بایں ہمہ شعریت کا یہ عالم تھا کہ خواب میں کسی کا شعر پڑھتا اور اپنے اوپر ایک عالم سکر وخمول طاری ہوجاتا نفس میں ایک عجیب طرح کی سنسناہٹ اور دل و جگر میں ایک ہیجان محسوس کرتا، میرے چند دوست جو مجھ سے واقف تھے میرے اس شغف شعر وادب کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ رائے قائم کئے بیٹھے تھے کہ میں ازدواج کا مسئلہ حل کرنے میں ضرور اس ذوق کا بھی لحاظ رکھوں گا لیکن ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی، جب میں نے تمدن سے دور گاؤں کی ایک اُمّی خاتون کا انتخاب کیا۔

عورت کا حسن و جمال، اس کی تعلیم وتربیت اس کی دولت و جائداد، اس کا معاشری رتبہ۔ یہ چیزیں ہیں جو عموماً ہمارے نوجوان حریصانہ نگاہ سے دیکھتے ہیں ہر انسان کے اندر کچھ نہ کچھ اخلاقی کمزوری ہوتی ہے۔ یہ محض خلاف حقیقت ہوگا اگر

کوئی کہے کہ اس میل مرکزی کا مجھ پر اثر نہیں ہوتا مگر یہ واقعہ ہے، کہ مجھے اس معاملہ میں زیادہ نفس کشی نہیں کرنی پڑی، اور میں نے آسانی کے ساتھ اپنے رجحان و نصب العین کیمطابق یہ مسئلہ طے کر لیا۔

میرے ایک دوست جو حکیم بھی ہیں عورت کی شعریت پر بہت زور دیتے ہیں یا یوں سمجھ لیجئے کہ آپ ایک عاشق مزاج سخن فہم اور مہذب بیوی چاہتے تھے، بدقسمتی سے آپ کو اس میں سخت ناکامی ہوئی، آپ اکثر حسرت کے ساتھ اپنی اہلیہ کی بے حسی اور اپنے ذوق کی پامالی کا گلہ کرتے ہیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ مرد اپنی عورت میں شعر و ادب کا ذوق کیوں تلاش کرتا ہے کیا عورت کا نیک کردار، اور اس کی وفا شعاری اس کا مقدس چہرہ، اور اس کی نرم و حزیں آواز پرستش و نیائش کے لئے کافی نہیں، محترم حضرت نیاز صاحب کا افسانہ "ازدواج مکرر" ہمارے حکیم صاحب جیسے ذوق پرست اصحاب کے لئے بڑا درس عبرت ہے!

عورت بذات خود تعبیر ہے ایک ہیجان آفریں صنعت سے، اُس کے حسنِ ذات کے نکھار کے لئے اگر کسی شے کی ضرورت ہے تو وہ اس کا عفت مآب ہونا ہے اور بس! عورت کی سیرت کے متعلق علماء کے نظریات مختلف ہیں جرمنی کے مشہور قیافہ شناس "جان کیسپر لاوٹیر" نے اس پر ایک دلچسپ بحث کی ہے۔

"لاوٹیر، ۱۷۷۴ء میں بمقام "ویلڈشٹ" پہنچا یہاں شہنشاہ جوزف موجود تھا اُس نے سُنا کہ لاوٹیر اس شہر میں آیا ہے تو اس کو بلا بھیجا اور اس سے علم قیافہ پر گفتگو

کی اس بحث و نظر کو خود لاوبیٹر نے اپنی زبان میں ادا کیا ہے، وہ مختلف امور پر بحث و تحیص کرتے ہوئے لکھتا ہے، کہ شہنشاہ نے سوال کیا کہ عورتوں کی سیرت کا پتہ لگانا کیا زیادہ دشوار نہیں اور یہ کہ حقیقتاً مردوں کی طرح عورتوں کا کوئی کردار نہیں ہوتا، لاوبیٹر نے کہا بعض حیثیت سے میں اس کا جواب اثبات میں اور بعض حیثیت سے نفی میں دوں گا۔ شہنشاہ نے طنزاً مسکرادیا اور ایک تجربہ کار انسان کی طرح پُر معنی انداز میں کہا کہ عورتیں مردوں کی محکوم ہیں اور وہ نقل و محاکات کی عادی ہیں ان کا کوئی ذاتی چلن نہیں ہوتا وہ جس کو پسند کرتی ہیں اُسی کو اختیار کر لیتی ہیں ان کا چلن مرد کا چلن ہوتا ہے جس کو وہ بروقت خوش کرنا چاہتی ہیں ان کو غالباً ایک ایسے شخص سے واسطہ ہوتا ہے جو خشک، متین اور تمیز دار ہوتا ہے اور جو ان کو بعض خاص یا دوسری حیثیت سے اچھا معلوم ہوتا ہے تو وہ فوراً متین اور خشک بن جاتی ہیں، فوراً ایک دوسرا شخص آتا ہے جو خوش باش اور پُر جوش ہوتا ہے وہ اس وقت یہی انداز اختیار کر لیتی ہیں محض اس لئے کہ اپنے رفیق جدید کو خوش کر سکیں، پھر ان کا کونسا چلن ہوا؟ کون ہے جو ان کی صورت سے ان کی سیرت کا پتہ چلائے۔ ایک قیافہ شناس بہت دنوں تک مطالعہ کرتا رہتا ہے جب وہ کسی عورت کے متعلق رائے قائم کر لیتا ہے تو وہ یکایک بدل جاتی ہے۔ لاوبیٹر نے جواب دیا کہ حضور نے جو کچھ فرمایا وہ بالعموم صحت رائے پر مبنی ہے اور ایک حد تک آپ کا یہ خیال بلاشک و شبہ صحیح ہے کہ عورتیں جو کچھ ہیں وہ مردوں کا عکس ہیں یا وہ مردوں کے سامنے وہی انداز اختیار کر لیتی ہیں جس کو وہ مناسب خیال کرتی ہیں پھر بھی بعض ایسی

استوار نا تغیر پذیر صورتیں ہیں جن پر نقاب نہیں پڑ سکتی، اور ان کے چلن کی باطنی بنیاد کی علامتیں قیافہ شناس کو حقیقت تک پہنچا کر رہتی ہیں اور وہ دہوکہ نہیں کھاتا ہر چند یہ بالکل صحیح ہے کہ مردوں کے استوار قیافہ کی طرح عورتوں کے قیافہ کو آسانی کے ساتھ واضح نہیں کیا جا سکتا ہم لوگ ہمیشہ سب سے پہلے مقدار پذیرائی اور قوت، ان کے چلن کی بنیاد اور شکل وشباہت کے بزرگ ترین خاکہ پر اپنی توجہ مبذول کرتے ہیں اور اس صورت میں ہم لوگ زیادہ غلطی نہیں کرتے

ہر انسانی صورت میں کچھ نہ کچھ ایسی بات ہوتی ہے جو فنون تصنع

(Arts of Dissimulation) کی منت کش نہیں اور اس لئے ہم کو اس تصنع سے کوئی خوف نہیں ہوتا صرف متحرک صورتیں ہی تصنع کے زیر اثر ہوتی ہیں حقیقی طلعت یا ان صورتوں کی بنیاد اس تصنع کی قوت سے باہر ہے۔

عورت ہنگامی طور پر جو روپ بھی اختیار کر لے

"ہیولاک ایلس" کا یہ نظریہ بالکل حقیقت ہے کہ "محبت نسوانی میں مادرانہ عنصر پایا جاتا ہے" کیمپر لاڈیر کہتا ہے کہ مرد بہت زیادہ راسخ ہے۔ اور عورت بہت زیادہ تغیر پذیر ہوتی ہے۔ لیکن یہ نتیجہ ہے اس امر کا کہ مرد زیادہ عمق نظر کے ساتھ مشاہدہ کرتا ہے مگر عورت ایک نظر ڈالتی ہے اور محسوس کرتی ہے۔ کیمپر کا قول ہے کہ ننانوے فیصدی عورتوں کو جو کسی مرد کے ساتھ محبت رکھتی ہیں یہ یقین ہوتا ہے کہ گو ہزاروں مردوں نے اپنے محبوبوں کو بھلا دیا ان سے ناروا سلوک کیا لیکن میرا محبوب اس قسم کے مردوں سے

مستثنیٰ ہے، اس سلسلہ میں بیجا نہ ہو گا اگر میں عورت کے متعلق اپنا نقطۂ خیال کسی قدر واضح طریقہ سے بیان کردوں۔

عورت نے اپنی زندگی میں کردار کے مختلف نقوش پیش کئے ہیں جن کو تاریخ نے محفوظ رکھا ہے اُنھوں نے میدان حرب کے ہالہ زاروں میں بھی اپنی ہمت و بسالت کی داستان چھوڑی ہے اور نہاں خانۂ حرم میں بیٹھ کر بھی اپنے بدلیۂ افکار سے اہل زمانہ کو متاثر کیا ہے۔ کبھی وہ جان ڈی آرک کی شکل میں آئی اور کبھی قلوبطرہ اور سائگی کے روپ میں کبھی وہ بلقیس، الزبتھ، صفیہ اور نورجہاں کی طرح حکومت پر نظر آتی ہے اور کبھی خنساء، عبیدہ طنبوریہ، فضل اور زیب النساء کی طرح بزم شعر و ادب میں بھی، کبھی دہکینہ بنت حسین، زینب ام المویدہ، تقیہ بنت ابو الفرج کی طرح مسند فقہ و حدیث پر درس و املا بھی کرتی ہے۔ اور کبھی رابعہ عدویہ، شوانہ اور فاطمہ نیشاپوریہ کی طرح سجادۂ تصوف پر رشد و ہدایت سے بھی کام لیتی ہے۔ الغرض زندگی کا کوئی شعبہ ہو، سیاسیات یا تمدن، شعر یا ادب، موسیقی یا غنا، ہر جگہ اس کی جگر کاویاں موجود ہیں اس میں نہ مشرق و مغرب کی تخصیص ہے، اور نہ قدیم و جدید کا فرق و امتیاز!

اب آیئے اسلامی تاریخ کی روشنی میں کسی قدر تفصیل سے اس مسئلہ پر بحث کی جائے حضرت عائشہ کی مرویات، آپ کا فقیہانہ طرز استدلال، ”خولہ“ کی جنگی معرکہ آرائیاں قرون اولیٰ کے برکات میں سے ہیں امویہ و عباسیہ کے آدان حکومت میں عورت کی زندگی میں انقلاب ہوا۔ امیر علی کے الفاظ یہ ہیں۔

عباسیہ کے اولین دور میں عورتوں کا درجہ امویہ کے زمانہ سے مختلف نہ تھا ذکور و اناث کی زندگی کا فرق و امتیاز ان کا ایک دوسرے سے علیحدہ ہونا خلیفہ قادر باللہ کے زمانہ میں رواج پذیر ہوا۔ اس خلیفہ سے بڑھ کر کسی دوسرے فرمانروا نے اسلامی دنیا کی ترقی میں رکاوٹ نہیں پیدا کی خلیفہ منصور کے زمانہ میں وہ شہزادیاں مردانہ لباس پہنکر بازنطینی لڑائیوں میں شریک ہوئیں، خلیفہ ہارون الرشید کے وقت میں عرب لڑکیاں گھوڑے پر سوار ہو کر فوج کی سرداری کیا کرتی تھیں، خلیفہ مقتدر کی ماں دیوان اعلیٰ کی کرسی صدارت پر مقدمات کی اپیل سنا کرتی تھیں متوکل کے زمانہ تک بلند پایہ کی تعلیم یافتہ عورتوں کے مکان پر مردوں کا اجتماع ہوتا وہاں وہ باہم تبادلہ خیالات کرتے۔

رشید اور مامون کے عہد میں عورتیں مشاعرہ میں شرکت کرتیں زبیدہ خود بڑی شاعرہ تھی، عبیدہ طنبوریہ شعر کہا کرتی اور موسیقی نواز بھی تھی مامون اور معتصم کے زمانہ میں اس کے کمال کا اوج تھا، وہ شکل و شباہت کے اعتبار سے "سہی قدان سیہ چشم ماہ سیما" میں سے تھی، ذہانت بھی خداداد تھی، طنبورہ بجانے میں اس کو کمال تھا۔ اسی وجہ سے "طنبوریہ" کے لقب سے مشہور ہوئی۔ فضل خلیفہ منصور کے محل کی رونق اور مشہور شاعرہ تھی اس عہد کے اکابر شعرا کی صف میں اس کو جگہ دی جاتی تھی "شیخہ شہدہ" چھٹی صدی ہجری میں تھیں اور بغداد میں تاریخ و ادبیات پر لکچر دیا کرتی تھیں۔ فقیہہ عورتوں میں ایک مشہور ترین خاتون زینب ام المویدگزری ہیں جو چھٹی صدی کے وسط میں تھیں صلاح الدین ایوبی کے زمانہ میں: بوالفرج کی لڑکی "تقیہ" گزری ہیں جو بہت بڑی

محدثہ تھیں اسی کے ساتھ ان کو شاعری میں بھی کمال حاصل تھا۔[۱]

"عزۃ میلار" انصار کی ایک لونڈی تھی، مدینہ میں قیام تھا بدیۂ جمال کے ساتھ اور امیر بھی ایک خاص نوع تھی صاحب الآغانی کی روایت ہے وسمیت بالمیلاء لتمایلھا فی مشیتھا" اس کی چال میں ایک لچک تھی اس لئے اس کا نام" میلا" پڑ گیا۔

"جمیلہ" بنی سلیم کی ایک شاخ بنو بہز کی ایک لونڈی تھی، اس کا شوہر بنی حرث بن خزرج کا غلام تھا وہ اسی کے ساتھ رہتی تھی اسی لئے لوگ اس کے شوہر کی نسبت سے اس کو انصار کی لونڈی کہنے لگے۔ ابوالفرج اور فرانسیسی عالم پروفیسر" جول روانیت" دونوں لکھتے ہیں "ھی اصل من اصول الغناء" آغانی کی روایت کے مطابق اسلامی دنیا کی مشہور مغنیوں معبد وابن عائشہ، حبابہ وسلامہ، عقیلہ العقیقیہ اور خلیدہ وربیحہ نے اس سے اکتساب فن کیا صاحب تاریخ الموسیقی العربیہ نے اس پر ابن سریج کا اضافہ کیا ہے۔[۲]

"سلامۃ القس" یہ بھی ایک لونڈی تھی اور مدینہ میں رہا کرتی تھی، اس کے نام کے ساتھ "القس" کا لفظ ایک تاریخی واقعہ سے منسوب ہے۔ القس مدینہ کے ایک مشہور عابد زاہد آدمی تھے، اتفاقاً مدینہ کی ایک گلی میں "سلامہ" کا گانا سن لیا بہت متاثر ہوئے اس کے مالک نے القس سے کہا اگر فرمائیے تو اس کو آپ کے سامنے لاؤں یا آپ کو

A short History of The Saracens; Amir Ali, p. 455/57 [۱]

[۲] دائرۃ المعارف الموسیقیہ (الجزء الاول) للعلامہ الاستاذ جون روانیت (معربہ از مصطفیٰ سکندر شلفون) ص ۴۳، ۹۳، ۹۰، ۱۵۹، ۵۰۰۔

وہاں لے چلوں الفس نے انکار کیا پھر کہا اگر یہ نہیں تو ایسا کیجئے کہ میں ایک ایسے مقام پر اس کو لے کر رہتا ہوں جہاں سے آپ اس کا گانا سُن سکیں دیکھ نہ سکیں۔ الفس نے اس سے بھی انکار کیا۔ وہ شخص الفس کو ایک مکان میں لے گیا اور پردہ کے پیچھے سلامہ گانے لگی، سلامہ کے آقا نے کہا فرمایئے تو باہر چلی آئے الفس نے ردا نہ رکھا۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ آ کر مدینہ کے اس مشہور عابد کے پہلو میں بیٹھ ہی گئی اور گانے لگی۔ لیل و نہار کے انقلاب کے ساتھ ایک کو دوسرے کے ساتھ شغف بڑھتا گیا اہل مدینہ سے بھی اب یہ حقیقت چھپی نہ رہی ایک دن سلامہ نے الفس سے کہا خدا کی قسم میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ الفس نے کہا واللہ مجھے بھی تم سے محبت ہے۔ پھر سلامہ نے کہا میرا جی چاہتا ہے کہ اپنا منہ تمہارے منہ پر رکھوں الفس نے کہا میری بھی یہی آرزو ہے بابا فغانی کہتے ہیں "نہادم روئے بر روئے گل واز خود گشتن رفتم" سلامہ نے کہا تو پھر کونسی چیز مانع ہے۔ تنہائی بھی ہے اور رقیب روسیاہ بھی نہیں الفس نے کہا میں نے سُنا ہے اللہ کہتا ہے۔

الاخلاء یومئذ بعضھم لبعض	ترجمہ:۔ آج کے دن بعض دوست اپنے دوستوں
عدو ا انا اکرہ ان تکون خلۃ	کے دشمن ہو جائینگے اور میں ناپسند کرتا ہوں کہ
ما بینی و بینک تؤل الی عداوۃ	ہماری تمہاری دوستی کا انجام عداوت ہو

یہ کہتا ہوا اُٹھا اور چلدیا۔ اس کے بعد اس کی وہی شب زندہ داریاں تھیں اور وہی عزلت پسندیاں اسی طرح شہزادی "علیہ" (جو خلیفہ مہدی کی بیٹی تھی)، اور علیہ کی ماں بصبص کو موسیقی میں کمال تھا۔ یحییٰ بن خالد برمکی کی لونڈی "دنانیر" خلیفہ امین کی معشوقہ "غوثیا"

فن موسیقی کی زبردست کاملہ گزری ہیں "غریب" کو بقول پروفیسر جول رووانیت ایک ہزار پانسو راگنیاں معلوم تھیں۔ شاہزادہ ابراہیم بن مہدی نے جو خود بڑا ماہر موسیقی تھا بصرہ کی ایک مولدہ "شاربہ" کی تربیت کی شاربہ کی رفعت اعزاز اور شہرت کے لئے یہی کیا کم ہے کہ شاہزادہ "ابن المعتز" نے جو خلیفہ کا بیٹا اور عربی زبان کا مشہور شاعر گزرا ہے بنفس نفیس اس کی تاریخ لکھی ہے۔

عصر جدید کے علماء نے نسائیات پر کافی معلومات جمع کر دی ہیں۔ سیاسیات دتمدن تاریخ و شرائع وغیرہ میدانوں میں عورت نے جو کارنامے چھوڑے ہیں ان کی پوری تفصیلات ہمارے سامنے ہیں۔ عورت وفلاسفر کی رائیں عہد قدیم اور عہد جدید کی عورت جیسے اہم موضوع پر جو تصنیفات پائی جاتی ہیں، شعروادب کے متعلق تو کچھ کہنا ہی نہیں الغرض مصری علماء نے انگلستان وفرانس، اور جرمنی و اطالیہ، روس و ترکی کے دور نہضت کا مطالعہ کرنے کے بعد عورت کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ ہندوستان میں بھی عورتیں فضا میں اڑا کرتی ہیں۔ قاف کی پریوں کا افسانہ اب حقیقت بن گیا۔ پانی پر تیرتی ہیں اور اب گویا ہندو نوافیات کی دریائی دیوی ہندوستان کی بہت سی نوجوان خواتین کے روپ میں نظر آتی ہے، کاؤنسل کے چیمبر اور عدالت کی کرسیاں بھی ان کی رونق سے خالی نہیں مگر سوال یہ ہے کہ عورت کے ذمہ فطرت کے جو خدمتیں تفویض کی ہیں انکی تکمیل میں عہد حاضر کی عورت کہاں تک کامیاب ہے اور اس کے بعد انکی زندگی کا امن سکون اس کے اخلاق کی گہرائیوں سے برقرار بھی ہے یا نہیں اس کا جواب آپ کو مغربی

عورت کے صیغۂ زندگی کے ہر ہر ورق سے لے کر جو ترقی کی رفتار میں سب سے آگے ہے
مغرب کے مرد اور ہم کے مشرقی مقلدین آج عورتوں کی غیر آل اندیشانہ آزادی پر مبنی
خوافشانیاں کر رہے ہیں ان سے اخبارات کے کالم اور جرائد کے صفحات بھرے پڑے
ہیں۔

انسان جب تمدن کے گہوارہ میں تھا اس وقت بھی عورت زندگی کی
مسابقت میں مرد سے پیچھے نہ تھی، اقوام و ملل کی خرافیات و اساطیر سے ایک محقق
اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ عورت ہر قوم میں پرستش و نیایش کی چیز سمجھی جاتی تھی اور آج
بھی اس کی بلندی اخلاق و تقدیس کی روایتیں مختلف ممالک میں متداول ہیں آیئے
سرسری طور پر خرافیات عالم کا جائزہ لیں۔

اشتار دیوی

بابل و اسیریا کی خرافیات میں عموماً خشک قسم کی مذہبی و قومی روایتیں
پائی جاتی ہیں۔ یہاں جاپان کی طرح عشقیہ و رومانی افسانوں کا وجود نہیں پایا جاتا پھر
بھی گلگمش (جو بابلی خرافیات میں ہندو خرافیات کے "ہنومان جی" کے مقابل ہے اور
جس کو "میکنزی" ہرقل اور سکندر کے مثل بتاتا ہے) اور تموز (جو مصر کے "اوسیرس"
کی طرح زراعت کا دیوتا سمجھا جاتا ہے) سے "اشتار" دیوی (عشقباز ملکۂ خلد) کا
عشق ای بنی (Ea-Ba ni) کا اپنے شکاری محبوب کے دام محبت میں گرفتار ہونا ایسی

روایتیں ہیں جو ہماری توجہ اس کلیہ کی طرف مبذول کراتی ہیں کہ امم سابقہ کی خرافیات میں ہمیشہ عورت، محبت و تقدیس کا مجسمہ سمجھی جاتی تھی[1]۔

کوین ین

خرافیات چین میں کوین ین کو "رحم کی دیوی" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ "کوین ین" کے معنی یہ ہیں کہ وہ "جو آواز سنے اور غم کو دور کرے"۔ اہل چین کے یہاں یہ دیوی ایک پیکر تقدس اور مجسمۂ مہر و کرم سمجھی جاتی ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اگر آگ کے درمیان کوین ین کا نام لیا جائے تو آگ اثر نہیں کرے گی۔ جہاز جب طوفان میں گھر جائے اور اس کا نام لیا جائے تو جہاز سلامتی کے ساتھ ساحل سے ہم آغوش ہوگا۔ یہاں تک کہ تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کے لئے بھی اس دیوی کے نام کا ورد نہایت مفید ہے۔

کوین ین چین کے شاہی گھرانہ میں پیدا ہوئی وہ بادشاہ کی تیسری بیٹی تھی۔ لیکن اس کو بادشاہ بیٹے کی طرح عزیز رکھتا تھا اور چونکہ بادشاہ کے کوئی اولاد ذکور نہ تھی اس لئے وہ تاج و تخت کا وارث بھی اس لڑکی کو بنانا چاہتا تھا۔ اس کا پہلا نام "میاؤ شن" (Mio Shan) تھا۔ جب یہ لڑکی سیانی ہوئی تو باپ نے تاج و تخت حوالہ کرنے کی غرض سے اس کی شادی کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن لڑکی شروع ہی سے حکومت و دولت سے متنفر تھی، وہ ایک عزلت گزیں جوگن کی طرح کسی پہاڑ کے گوشہ میں زندگی بسر کرنا چاہتی تھی

---

[1] Myths of Babylonia & Assyria: Donald A. Mackenzie ص ۸۹، ۹۰، ۹۱

اس کی آرزو تھی کہ انسان کے فرق و مراتب کا سوال اٹھ جائے اور لوگ دنیا میں سادہ زندگی گزاریں وہ بڑے لوگوں کو نیک چلن بنانا چاہتی تھی وہ دکھ درد میں مبتلا ہونے والے انسانوں کو نجات دلانا چاہتی تھی۔ بادشاہ سے اس نے عرض کیا کہ وہ شادی کرنا نہیں چاہتی اور ایک راہبہ کی طرح زندگی کے دن گزار دینا چاہتی ہے وہ جب اپنی بڑی بہنوں کے ساتھ شاہی محل کے سدا بہار باغ میں کھیلا کرتی تو کہتی کہ دولت اور شوکت کی حقیقت موسم بہار کی جھڑی یا صبح کے وقت گریۂ شبنم سے زیادہ نہیں بس ایک ساعت اور پھر غائب۔ بادشاہ اور شہنشاہ خیال کرتے ہیں کہ آخر آخر تک وہ اپنی قسمت کی بہار آفرینیاں دیکھتے رہیں گے جو ان کو دوسرے انسانوں سے ممتاز بناتی ہیں لیکن بیماری ان کو جھکا دیتی ہے اور ساری فریب خیالیاں ختم ہو جاتی ہیں اب وہ زور آور شاہی خاندان کہاں ہیں، جنھوں نے دنیا کے سامنے اپنے آئین پیش کئے جانتک میری ذات کا تعلق ہے میں اس کے سوا کوئی آرزو نہیں رکھتی کہ کسی سنسان پہاڑ پر امن و سکون کے ساتھ گوشہ گیر ہو جاؤں اگر میں اپنی عبادت و ریاضت کی بدولت "کمال" حاصل کر لوں گی تو میں ایک لمحہ میں مشرق سے مغرب تک کائنات کے اندر سفر کر دوں گی میں اپنی ماں اپنے باپ کو نجات دلاؤں گی، اور ان کو خلد میں پہونچاؤں گی میں دنیا کے مصیبت زدہ اور اور دردمند انسانوں کو بچاؤں گی میں ایسے انفاس کو جو مکروہات میں مبتلا ہیں برگزیدہ اخلاق کا پیکر بناؤں گی یہی میرا حوصلہ ہے اور بس!

یہ تھے زاہدانہ تخیلات جو بچپن سے میاؤشن کے دماغ پر مسلط تھے اور حقیقت

یہ ہے کہ اسی "رجحان" نے اس سے تخت شاہی چھڑا کر اس کو "کوین ین" کے رتبہ تک پہنچایا باپ بیٹی کا مکالمہ اس افسانہ کا ایک نہایت دلچسپ اور سبق آموز پہلو ہے۔[1]

سنجن دیوی

خرافیات جاپان اپنی عشقیہ روایات کے لحاظ سے دنیا کی دوسری قوموں سے ممتاز ہے۔ عشق و رومان اس ملک کی خصوصیات میں سے ہیں اور یہ نتیجہ ہے یہاں کے قدرتی مناظر اور سرزمین کی شادابی کا۔ جاپان کے خرافی افسانوں میں دیویوں کے عشق و محبت کے نہایت دلکش نقوش پائے جاتے ہیں "یوکی آنا" (برف کی خاتون)، "کرلیا را اور درخت ماہ" جس میں "گگویا" دیوی کا کردار پیش کیا گیا ہے اور "کوہ فیوجی کی دیویاں" کے نام سے جو افسانے پائے جاتے ہیں ان کے پڑھنے کے بعد انسان بے اختیارانہ شعر و رومان کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔

"یاساجی" کی ماں ایک معمولی دیہات کی عورت تھی اس کو چیچک کا عارضہ ہو گیا یاساجی نے "کامویاماکیکو" جادوگر سے مشورہ کیا چونکہ اس کی ماں ایسی علیل ہو گئی تھی کہ ہر لمحہ موت سے ہمکنار ہونے کا خدشہ تھا۔ جادوگر نے اس کو صلاح دی کہ وہ اس چھوٹے سو چشمہ پر جائے جو "کوہ فیوجی" کے جنوبی مغربی پہلو میں بہتا ہے۔ جادوگر نے کہا کہ اس چشمہ کے دہانے پر "لمبی سانس" کے دیوتا کا مندر ہے اس لئے پانی لے آؤ اور اپنی ماں کو

---

[1] Myths and Legends of China: E.T.C. Werner ص ۵-۲۵۱

پلاؤ، چونکہ صرف یہی ایک دوا ہے جس سے تمہاری ماں کو شفا ہو سکتی ہے۔

یاساجی اُمید سے بھرا ہوا سفر میں روانہ ہوا، اور جب وہ اس مقام پر پہنچا جہاں تین رستے ایک دوسرے کو قطع کرتے تھے تو وہ گھبرایا کہ صحیح رستہ کون ہے وہ اس معاملہ پر غور و خوض ہی کر رہا تھا کہ ایک بھولی بھالی لڑکی سفید کپڑا پہنے ہوئے جنگل سے نکلی اور اس سے کہا کہ میرے ساتھ چلے آؤ۔ میں تم کو وہاں لے چلتی ہوں جہاں ”لبنی سائنس کے دیوتا“ کے مندر کے نزدیک وہ قیمتی چشمہ بہتا ہے۔ جب وہ اس چشمہ کے نزدیک پہنچے تو لڑکی نے یاساجی سے کہا کہ تم اس کا پانی پیو اور اپنی ماں کے لئے لے جاؤ جب وہ یہ سب کر چکا تو وہ حسین لڑکی اس کو اس مقام پر لے آئی جہاں پہلی مرتبہ اس کو دیکھا تھا اور کہنے لگی تین دن کے بعد مجھ سے پھر اسی مقام پر ملو چونکہ تم کو پھر اس پانی کی احتیاج ہوگی۔

پانچ مرتبہ مندر سے پانی لانے کے بعد یاساجی نے مسرت کے ساتھ یہ محسوس کیا کہ اب اس کی ماں بلکہ دیہات کے اور دوسرے لوگ بھی جنھوں نے یہ پانی پیا شفایاب ہو گئے۔ یاساجی کی بہادری کا غلغلہ بلند ہو گیا۔ جادوگر کے پاس تحائف بھیجے گئے چونکہ اس نے وقت پر مشورہ دیا لیکن یاساجی ایک دیانتدار لڑکا تھا وہ دل میں سمجھ رہا تھا کہ حقیقتاً اس ساری تعریف کی مستحق وہ حسینہ ہے۔ جس نے اس کی رہنمائی کی۔ اس نے خواہش کی کہ وہ پوری طرح سے اس لڑکی کا شکریہ ادا کرے اور اسی ارادہ سے ایک بار پھر وہ چشمہ کی طرف روانہ ہوا۔ جب یاساجی ”لبنی سائنس“ کے دیوتا کے مندر“ کے نزدیک

پہنچا تو اس نے اس چشمہ کو خشک پایا اور بہت حسرت اور فرطِ غم کے ساتھ گھٹنوں کے بل ٹک گیا اور دعائیں کرنے لگا کہ ایک بار پھر وہ حسینہ ظاہر ہو جائے جو اس کی ماں پر اس قدر مہربان ہوئی تا کہ وہ اس کا شکریہ ادا کرے اس طور سے جس طرح وہ اس کی حقدار ہے جب یاساجی اٹھا تو اس نے اس حسین لڑکی کو دیکھا کہ سامنے کھڑی ہے یاساجی نے بہت پر جوش اور فصیح الفاظ میں اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور درخواست کی کہ وہ حسینہ اپنا نام بتائے جس نے اس کی ماں کو صحت دی تھی لیکن لڑکی اس پر مسکراتی رہی اور اور اپنا نام نہیں بتایا۔ مسکراتے ہوئے اس نے ہوا میں "کیملیا" کی ایک شاخ پھینکی اس کے جواب میں کوہ فیوجی سے ایک چادرِ سحاب نمایاں ہوئی اس نے اس پیاری لڑکی کو لپیٹ لیا اور اس مقدس پہاڑ کی طرف لے چلا جہاں سے وہ آئی تھی۔ اب یاساجی نے جانا کہ اس کی رہنما "کوہ فیوجی کی دیوی" کے سوا اور کوئی دوسری ہستی نہ تھی وہ جوش ارادت میں زمین پر چہرہ ملنے لگا۔ دیوی اس سے جدا ہو رہی تھی اور وہ دیکھ رہا تھا کہ یاساجی یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے تشکرہ میں محبت کا عنصر بھی شامل ہے۔ وہ جھکا ہی تھا کہ فیوجی کی دیوی نے "کیملیا" کی وہ شاخ اس کی طرف پھینکی یہ دیوی کی طرف سے محبت کی ایک یادگار تھی[1]۔

ہیپن زن

میکسیکو میں یہ روایت بہت اہمیت کے ساتھ مشہور ہے کہ کس طرح ہیپنزن

---

[1] ص ۱۳۵ Myths and Legends of Japan: F. Halland Davis.

(Papantzin) مرنے کے بعد اپنے مقبرہ سے برآمد ہوئی اور اپنے بھائی مانٹیزو کے سامنے اس کے انجام اور اہلِ اسپین کے ہاتھوں زوالِ حکومت کی پیشنگوئی کی۔

شہزادی کا انتقال ہو گیا تو مقبرہ کے دہانہ پر متوسط درجہ کا ایک پتھر رکھ دیا گیا۔ شاہی خاندان کے رسوم کے مطابق سب تقریبات انجام پاگئیں تو سب لوگ چلے گئے دوسرے دن سویرے شاہی خاندان کی چھ سال کی ایک بچی اپنی انّا کو تلاش کرنے باغ میں گئی اور دیکھا کہ شہزادی پیپنزن غسل خانہ کے نزدیک جہاں اس کو دفن کیا گیا تھا کھڑی ہے شہزادی نے جو اس بچی کی پھوپھی یا خالہ ہوتی تھی اس سے کہا کہ اپنی انّا کو میرے پاس لے آؤ۔ بچی اپنی انّا کے پاس گئی اور سارا قصہ کہا۔ پہلے تو اس نے کہا کہ بچی کو التباس ہو گیا اس لئے اس نے اس کی بات پر زیادہ توجہ نہ دی لیکن جب بچی نے اپنے بیان پر اصرار کیا تو انّا اس کے ساتھ چلی اور باغ میں دیکھا کہ سچ مچ "پاپن" غسل خانہ کے نزدیک سیڑھی پر بیٹھی ہے۔ انّا یہ سماں دیکھ کر بیہوش ہو گئی اس کے بعد ملکہ خود دو سہیلیوں کے ساتھ آئی اور "پاپن" کو اپنے کمرہ میں لے گئی۔ بادشاہ وہاں آیا اور دونوں بھائی بہن ملے۔ بہن نے کہنا شروع کیا کہ تم نے دیکھا ہے کہ میں مرگئی تھی لیکن میں اپنے آباد اجداد کے حکم کے مطابق تم کو ایک نہایت اہم معاملہ کے متعلق باخبر کرنے آئی ہوں۔

مرنے کے تھوڑے وقفہ کے بعد میں نے خود کو ایک وسیع وادی میں پایا جس کی

The Myths of Mexico & Peru: Lewis Spence صفحہ: ۱۴۱-۴۲

نہ تو ابتدا معلوم ہوتی تھی نہ انتہا۔ اس کے چاروں طرف اونچے اونچے بلند پہاڑ تھے۔ وسط میں ایک سڑک پر میں پہنچی۔ جس کے مختلف سمت چھوٹی چھوٹی راہیں تھیں۔ وادی کے پہلو میں ایک بڑا دریا بہہ رہا تھا جس کی روانی سے شور مچ رہا تھا۔ اس کے کنارے پر میں نے ایک نوجوان آدمی کو دیکھا جو ایک لمبی قبا پہنے ہوئے تھا اور ریشم کا ایک تکمہ اس پر لٹکا ہوا تھا۔ اس کی پیشانی پر تثلیث کی ایک علامت بنی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں بازوؤں پر تحو جو عجیب و غریب قسم کے چمکیلے عکس اور رنگ پیدا کر رہے تھے شکل و شمائل کے اعتبار سے وہ بہت حسین تھا اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا کہ ابھی وقت نہیں آیا ہے کہ تم اس دریا سے پار گزرو، تم خدا کی جستجو رکھتی ہو جو ہر اس چیز سے جس کو تم جانتی ہو یا سمجھ سکتی ہو بڑا ہے۔ تب وہ مجھے وادی کے درمیان لے چلا اور میں نے دیکھا کہ مردہ آدمیوں کی بہت سی ہڈیاں اور کھوپڑیاں پڑی ہیں۔ تب میں نے کچھ سیاہ مخلوقوں کو دیکھا جن کے سر پر سینگ تھی اور پیر ہرن کے سے تھے وہ ایک مکان کی تعمیر میں مشغول تھے جو تقریباً مکمل ہو رہا تھا۔ تھوڑی دور پر مشرق کی سمت بہت سے جہاز دیکھے جن پر بہت سے لوگ سوار تھے، ان کا لباس ہمارے لباس سے مختلف تھا ان کی آنکھیں صاف بھوری تھیں ان کا رنگ ٹیالا تھا اور وہ اپنے ہاتھوں میں جھنڈیاں لئے جا رہے تھے وہ سر پر خود پہنے ہوئے تھے وہ لوگ اپنے کو "آفتاب کے بیٹے" کہتے تھے، وہ آدمی جو مجھے لئے جا رہا تھا کہنے لگا کہ خدا کی مرضی نہیں ہے کہ تم ابھی اس دریا سے عبور کرو، بلکہ تم کو ابھی زندہ رہنا ہوگا تاکہ تم اس دین کے منافع حاصل کرو جو یہ اجنبی آدمی لائے ہیں۔ اس نے بتایا کہ ہڈیاں جو

میدان میں پڑی تھیں وہ ہمارے ملک کے ان آدمیوں کی تھیں، جو اس دنیا کا علم حاصل کیے بغیر مر گئے اور وہ مکان جو تعمیر ہو رہا تھا ان لوگوں کی ارواح کے قیام کے لئے تھا جو میدان جنگ میں گر گئے اس کے بعد اس نوجوان آدمی نے کہا کہ تم اپنے لوگوں کی طرف جاؤ اور جو کچھ تم نے دیکھا ہے اس کی خبر دو، تاکہ وہ لوگ بھی فائدہ حاصل کریں۔

موت کے بعد "پنیپزن" کا دوبارہ زندہ ہونا میکسیکو کی تاریخ کا بہت ہی مستند واقعہ تھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جب اہل اسپین نے میکسیکو میں مسیحیت کی تبلیغ کا علم بلند کیا تو سب سے پہلے شہزادی "پنیپزن" نے بپتسمہ لیا۔

فریجہ دیوی

نیوٹانک خرافیات میں سوپڈیگ (Svipdag) ہیرو کی شخصیت میں نظر آتا ہے اس کی ماں مرتے وقت اس کو وصیت کرتی ہے کہ وہ "ہیلفڈن سے" انتقام لے، جس کے باعث اس کی سخت رسوائی ہوئی اور اسی غم میں وہ مر رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ جب کبھی مصیبت کا سامنا ہو تم میری قبر پر آ کر مجھے پکارنا میں تمہاری مشکل آسان کروں گی، چنانچہ "سوپڈیگ" اور ہیلفڈن سے لڑائی ہوتی ہے۔ سوپڈیگ گرفتار ہوتا ہے، وہ قید تنہائی میں اپنی ماں کے بتلائے ہوئے منتر پڑھتا ہے اس کو رہائی ہوتی ہے اور وہ فریجہ دیوی اور فریے دیوتا کو دیو کی قید سے نجات دلانے کے لئے کوہ "جوٹون ہیم" کا رخ کرتا ہے یہی افسانہ جس میں فریجہ دیوی کی رہائی، سوپڈیگ دیو سے مقابلہ اور

خوفناک وادیوں اور پُرشور سمندروں سے اس کا گزر ناندکورہے، ٹیوٹانک خرافیات میں وہ فتح عشق کے نام سے مشہور ہے۔[۱]

سوٹڈیگ اپنی سوتیلی ماں "دستھ" کی تحریک سے فریجہ دیوی کی رہائی کے لئے اپنے سوتیلے بھائی "ال" کو ساتھ لے کر روانہ ہوا جو اسی کی طرح ایک نوجوان ہیرو تھا۔ سفر بہت خطرناک تھا درمیان میں پرشور سمندر حائل تھا، طوفان کا دیو معرکہ آرا ہوا، لیکن سوٹڈیگ "دستھ" کی تیار کی ہوئی غذا جو تین سانپ کی چربی سے بنائی گئی تھی اور اپنی ماں "گروا" کے منتر سے وہ سلامتی کے ساتھ اس ساحل پر پہنچ گیا جس کے متصل وہ محل واقع تھا جہاں دیو نے فریجہ دیوی اور فرے دیوتا کو مقید کر دیا تھا دیو کے تین لڑکوں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں ایک فریجہ کو اپنی دلہن بنانا چاہتا تھا وہ سوٹڈیگ اور ال پر بہت برہم ہوا۔ اور ان کو کہا جہاں سے آئے ہو اسی طرف چلے جاؤ۔ لیکن انھوں نے دیو زاد کی بات کو حقارت سے ٹھکرا دیا اور محل کا رُخ کیا، محل میں پہنچے تو فریجہ دیوی اور فرے کو ڈھونڈھنے لگے، دیوزادوں نے چاروں طرف سے طوفان برپا کیا بھیانک آوازیں بلند کیں، وحشی درندوں کی طرح چنگھاڑنے لگے۔ اس سماں کا مقابلہ آسان نہ تھا مگر سوٹڈیگ اور ال پہلو میں نڈر دل رکھتے تھے، وہ اپنے کام میں مشغول رہے، صحن میں فریجہ دیوی اور فرے دیوتا سے جن کو دیوزاد گھیرے ہوئے تھے ان کی ملاقات ہوئی سوٹڈیگ نے فریجہ کو گلے لگا لیا اور اس کا منہ چوم لیا فریجہ کو معلوم تھا کہ وہ سوٹڈیگ کی دلہن ہوگی۔

۱ے Teutonic Myths & Legends: Donald A. Mackenzie. ص ۶۲-۶۳

دیو نے فریجہ اور فرے پر منتر پڑھ کر پھونک دیا تھا جس کے باعث وہ لوگ فراموش کاری میں مبتلا تھے، ان کو ماضی کی یاد محض دھندلی سی رہ گئی تھی، وہ بدیعۂ جمال کی دیوی تھی، لیکن جادو کے اثر سے اس کا حسن ماند پڑ گیا تھا۔ اس کی نرگس شہلا جیسی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ان میں اب ایک نشاط انگیز سوگواری کے بدلے باطنی درد و حزن کی کارفرمائیاں تھیں، سوپڈریگ اور ال کی آمد پر اُس کو خوش ہو جانا چاہیے تھا لیکن ایسا نہ ہوا، اس کا دل سرد پڑ گیا تھا اس میں ولولہ و جوش باقی نہ تھا۔

محل کے ایک بڑے وسیع کمرے میں دیوؤں کا اجتماع تھا وہ ان لوگوں کو دیکھ کر بہت غضب ناک ہوئے اور ان کو مار ڈالنا چاہا۔ دیو زاد جو فریجہ پر عاشق تھا میدان میں کودا، اور سوپڈریگ سے مقابل ہوا اُل نے اپنی شمشیر سے اُس کا خاتمہ کیا اس کے بعد لڑائی ہوئی اور ان دونوں بھائیوں کو کامیابی ہوئی۔ ان لوگوں نے فرے کو ساتھ چلنے کی ترغیب دی۔ لیکن اُس نے فرط ندامت سے انکار کیا اور کہا میں دیوتاؤں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ فریجہ کو لے کر روانہ ہوئے اور جادو کے سمندر سے پار ہو کر اس پہاڑ پر پہنچے جہاں "ستھ" ان لوگوں کا انتظار کر رہی تھی سوپڈریگ سے فریجہ سرد مہری برت رہی تھی وہ نہ تو اپنے پُرسرد عاشق پر نظر التفات ڈالتی نہ کلام کرنے کے لئے لب ہلاتی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دیو کی قید سے نجات پانے کی نہ تو اسے خوشی ہے اور نہ وہ سوپڈریگ کی ممنون نظر آتی ہے سوپڈریگ کو فریجہ کی یہ ادائیں کچھ اچھی معلوم نہ ہوئیں اس نے غصہ میں آ کر اس کو تنہا چھوڑ دیا فریجہ ماری ماری پھری یہاں تک کہ دیونیوں کی قیام گاہ

خوفناک وادیوں اور پُر شور سمندروں سے اس کا گزرنا مذکور ہے، ٹیوٹانک خرافیات میں "فتح عشق" کے نام سے مشہور ہے۔[۱]

سوڈیگ اپنی سوتیلی ماں "ستھ" کی تحریک سے فریجہ دیوی کی رہائی کے لئے اپنے سوتیلے بھائی "ال" کو ساتھ لے کر روانہ ہوا جو اسی کی طرح ایک نوجوان ہیرو تھا۔ سفر بہت خطرناک تھا درمیان میں پرشور سمندر حائل تھا، طوفان کا دیو معرکہ آرا ہوا۔ لیکن سوڈیگ "ستھ" کی تیار کی ہوئی غذا جو تین سانپ کی چربی سے بنائی گئی تھی اور اپنی ماں "گروا" کے منتر سے وہ سلامتی کے ساتھ اس ساحل پر پہنچ گیا جس کے متصل وہ محل واقع تھا جہاں دیو نے فریجہ دیوی اور فرے دیوتا کو مقید کر دیا تھا دیو کے تین لڑکوں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں ایک فریجہ کو اپنی دلہن بنانا چاہتا تھا وہ سوڈیگ اور ال پر بہت برہم ہوا۔ اور ان کو کہا جہاں سے آئے ہو اسی طرف چلے جاؤ۔ لیکن انھوں نے دیو زاد کی بات کو حقارت سے ٹھکرا دیا اور محل کا رُخ کیا، محل میں پہنچے تو فریجہ دیوی اور فرے کو ڈھونڈھنے لگے، دیوزادوں نے چاروں طرف سے طوفان برپا کیا بھیانک آوازیں بلند کیں، وحشی درندوں کی طرح چنگھاڑنے لگے۔ اس سماں کا مقابلہ آسان نہ تھا مگر سوڈیگ اور ال پہلو میں نڈر دل رکھتے تھے، وہ اپنے کام میں مشغول رہے، صحن میں فریجہ دیوی اور فرے دیوتا سے جن کو دیوزاد گھیرے ہوئے تھے ان کی ملاقات ہوئی سوڈیگ نے فریجہ کو گلے لگا لیا اور اس کا منہ چوم لیا فریجہ کو معلوم تھا کہ وہ سوڈیگ کی دلہن ہوگی۔

۱؎ Teutonic Myths & Legends: Donald A. Mackenzie. ص ۶۲-۶۳

دیو نے فریجہ اور فرے پر منتر پڑھ کر پھونک دیا تھا جس کے باعث وہ لوگ فراموش کاری میں مبتلا تھے، ان کو ماضی کی یاد محض دھندلی سی رہ گئی تھی، وہ بدیہہ جمال کی دیوی تھی، لیکن جادو کے اثر سے اس کا حسن ماند پڑ گیا تھا۔ اس کی نرگس شہلا جیسی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ان میں اب ایک نشاط انگیز سوگواری کے بدلے باطنی درد و حزن کی کارفرمائیاں تھیں، سوبڈریگ اور ال کی آمد پر اُس کو خوش ہو جانا چاہیے تھا لیکن ایسا نہ ہوا، اس کا دل سرد پڑ گیا تھا اس میں ولولہ و جوش باقی نہ تھا۔

محل کے ایک بڑے وسیع کمرے میں دیوؤں کا اجتماع تھا وہ ان لوگوں کو دیکھ کر بہت غضب ناک ہوئے اور ان کو مار ڈالنا چاہا۔ دیوزاد جو فریجہ پر عاشق تھا میدان میں کودا۔ اور سوبڈریگ سے مقابل ہوا ال نے اپنی شمشیر سے اُس کا خاتمہ کیا اس کے بعد لڑائی ہوئی اور ان دونوں بھائیوں کو کامیابی ہوئی۔ ان لوگوں نے فرے کو ساتھ چلنے کی ترغیب دی۔ لیکن اُس نے فرط ندامت سے انکار کیا اور کہا میں دیوتاؤں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ فریجہ کو لے کر روانہ ہوئے اور جادو کے سمندر سے پار ہو کر اس پہاڑ پر پہنچے جہاں "ستھ" ان لوگوں کا انتظار کر رہی تھی سوبڈریگ سے فریجہ سرد مہری برت رہی تھی وہ نہ تو اپنے پیسر د عاشق پر نظر التفات ڈالتی نہ کلام کرنے کے لئے لب ہلاتی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دیو کی قید سے نجات پانے کی نہ تو اسے خوشی ہے اور نہ وہ سوبڈریگ کی ممنون نظر آتی ہے سوبڈریگ کو فریجہ کی یہ ادائیں کچھ اچھی معلوم نہ ہوئیں اس نے غصہ میں آ کر اس کو تنہا چھوڑ دیا فریجہ ماری ماری پھری یہاں تک کہ دیونیوں کی قیام گاہ

تک پہنچی انھوں نے اس کو اپنی بکریاں چرانے کے لئے پکڑ لیا۔ سوہڈیگ کے دل میں فریجہ کی سچی محبت تھی، اُس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا فریجہ کے لئے اُس کا دل بھر آیا وہ اسکی تلاش میں روانہ ہوا، اس نے دیونی کی قید سے اُسے چھڑایا۔ پھر بھی فریجہ کی کم نگاہیاں بدستور قائم تھیں سوہڈیگ کی طرف نہ تو دیکھتی تھی نہ اسکی بات کا جواب دیتی۔ بیرد سنے پھر اس کو تنہا چھوڑ دیا اور پہاڑ پر ماری ماری پھری، اس کے بعد وہ ایک چڑیا کی شکل میں سوہڈیگ کے مکان میں پہنچی، ستھ نے اس کو نہیں پہچانا۔ فریجہ نے کہا میں ایک غریب خانہ خراب عورت ہوں۔ ستھ نے اس کی پذیرائی کی سوہڈیگ نے اس کو دیکھا اور پہچانا کہ یہ میری بیوی ہے۔ چنانچہ شادی کی رسوم رچائی گئیں۔ مگر فریجہ ابھی تک سرد مہر تھی۔ اس کے اندر کوئی ولولہ نہ تھا۔ دونوں عاشق و معشوق حجلۂ عروسی میں داخل ہوئے۔ فریجہ کے ہاتھ میں شمع تھی۔ شمع کی لو سے اس کا ہاتھ مس ہوگیا اور جلنے لگا۔ سوہڈیگ نے اُسے ہشیار کیا لیکن اس کو کوئی تکلیف نہ تھی کیونکہ اس کے قلب میں زیادہ درد موجود تھا آگ سے دیو کے جادو کا اثر زائل ہوگیا فریجہ نے اپنا رُخ زیبا اُٹھایا محبت بھری آنکھوں سے اپنے نجات دہندہ کو دیکھا۔ یہی وہ بہت بڑا انعام تھا جو سوہڈیگ کو ملا، اس کے بعد فریجہ غائب ہوگئی اور ایک باز کی شکل میں بمقام "الیگارڈ" پہنچی۔

اس کے بعد اس افسانہ میں ایک دوسری جنگ کا منظر دکھایا گیا ہے اس منظر میں "ایڈن" دیوی اور اس کے تین عجیب و غریب سیب کا حال مذکور ہے اور پھر دکھایا گیا ہے کہ کس طرح سوہڈیگ "ایرج" کے "تیغ خارا شگاف" کی طرح ایک

طلسمی "شمشیر فتح" لے کر سفر کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ سلسلہ شروع ہوتا ہے جس میں مقام "ایسگارڈ" کی فتح کا سماں پیش کیا گیا ہے۔ افسانہ کا یہ حصہ بالکل ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ "شہزادہ اسد" ملکہ مہ جبین کے عشق میں "طلسم ہوشربا" کی فتح کے لئے سرگرم ہیں سونڈیگ کے ہاتھوں ایسگارڈ فتح ہوتا ہے فریجہ ہمیشہ کے لئے اس کی ہو جاتی ہے۔

پھر دیوی کی وہی دلربائیاں ہیں اور وہی خوش ادائیاں جن کے لئے سونڈیگ بیتاب تھا۔

گلیشیا کا بُت

جزیرہ قبرص کا بادشاہ پگمیلین جنگجو سے زیادہ ایک بُت تراش کی حیثیت سے مشہور تھا اپنے فن کا وہ اس قدر دلدادہ تھا کہ اس نے شادی تک نہ کی۔ وہ کہا کرتا کہ کوئی عورت ایسی حسین نظر نہیں آتی جیسا اس کے ہاتھ کا بنایا ہوا انسانی پیکر، اس نے ہاتھی دانت کا ایک مجسمہ بنایا تھا اور بہت وقت صرف کر کے اپنی فنی مہارت سے اس کی تکمیل کی تھی وہ اس کو اس قدر عزیز رکھتا گویا وہ اس کے دل کی ملکہ بن گئی تھی، اس کی شیفتگی نے یہ صورت اختیار کر لی کہ وہ اب اپنی ساری متاع دنیوی لٹا کر چاہتا تھا کہ کسی طرح مجسمہ کے اندر ایک خوش خوبی کے ساتھ روح پیدا کر دے سارے دن وہ محنت کرتا اور اس غیر ذی روح مجسمہ کی تکمیل جمال میں کھویا رہتا۔ ساری راتیں وہ اپنی بے بسی پر آہیں بھرتے گزار دیتا۔ کاش! اسے قدرت ہوتی اور وہ مجسمہ کے اندر خون و گوشت کی کمی پوری کر سکتا۔

اس مجسمہ کو وہ "گلیشیا" کے نام سے پکارتا تھا۔ صناع نے اس کو طرح طرح کے اسباب

زینت سے آراستہ کیا تھا۔ گردن وبازو میں چمکتے ہوئے جواہرات آویزاں تھے۔ گوناگوں پھولوں کا ہار بنا کر سر پر لپٹیا تھا لیکن مجسمہ پھر بھی مجسمہ ہی تھا۔ اس کی ساری دلربائیاں اس تصور سے رو در محض ایک تصویر تھیں۔

پگمیلین کے فنی کمال نے تصور کی یہی گمرہی پیدا کر رکھی تھی۔ اس پیکر خموش کی تزئین وتجمیل اس کا وظیفہ صبح اور ورد شام تھا مگر اس کی گلیشیا زندگی کے آثار سے محروم ہی تھی اسی عرصہ میں جزیرۂ قبرص کی ایک بڑی دیوی "افروڈائیٹ" کے میلہ کا زمانہ آیا۔ پگمیلین اس کے مندر میں حاضر ہوا۔ وہ نذر ونیاز کے لئے بہت سا قیمتی سامان ساتھ لایا۔ پرستش گاہ سے دھواں نکل رہا تھا۔ اس نے بڑے خشوع وخضوع سے دعائیں کیں "اے ملکۂ عشق اس شخص پر رحم کر جو کہ اتنے زمانہ تک تیری قدرت کے سامنے سر نیاز خم کئے رہا ہمارے ہی ہاتھوں کے بنائے ہوئے مجسمہ کو میری دلہن بنا دے اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو پھر زمین کی کوئی ایسی عورت عطا کر جو ایسی ہی موہنی ہو جیسی میری گلیشیا ہے۔ پرستش گاہ سے آگ کا شعلہ بلند ہوا اور تین مرتبہ اس نے ہوا میں لپکاریاں لیں۔ یہ اجابت دعا کا ایک اشارہ تھا۔ پگمیلین کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ وہ جلد جلد گھر کی طرف روانہ ہو تھا کہ اس مجسمہ کے نزدیک کھڑا ہو جس نے سینکڑوں مرتبہ اس کی آنکھوں کو زندگی کا فریب دیا تھا۔ اس نے اپنا بازو پھیلاتے ہوئے "میری گلیشیا" کہہ کے پکارا۔ اس کی خوف زدہ حیرت نے آخر وہ سماں مشاہدہ کر ہی لیا جس کے لئے اس کی تمنائے دید ہمیشہ آشفتہ رہا کرتی تھی۔ اس نے بغور دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہاتھی دانت کے مجسمہ میں ایک تغیر ہو رہا ہے اس کے سینے سے

سانس کی آمد و شد نمایاں تھی۔ اس کی رگوں میں خون رواں دواں تھا۔ اس کی آنکھیں اب پتھریلی نہ تھیں جو ٹکٹکی باندھ کر اس کو دیکھا کرتی تھیں بلکہ ان سے تغافل و تمکین بھی ٹپک رہی تھی۔ یہ فریب نظر نہ تھا۔ اس نے مجسمہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور اس میں زندگی کی گرمی و نرمی محسوس کی۔ وہ نبض کی حرکت کا بھی احساس کر رہا تھا۔ وہ چہرہ کو دیکھ کر مسکرایا۔ مجسمہ نے بھی تبسم کیا۔ پگمیلین نے سلسلۂ سخن چھیڑا۔ گلیشیا کے ہونٹوں میں بھی جنبش ہوئی۔ اور وہ بھی تکلم نواز ہوئی۔ افروڈائیٹ نے اپنا معجزہ دکھایا۔

زنانِ مصر

بابل اور اسیریا کی طرح مصری قوم کی خرافیات میں بھی زیادہ تر مذہبی عنصر کا غلبہ پایا جاتا ہے۔ وہی عالم آخرت کے متعلق دور از کار معتقدات اعبادت و ریاضت موت و حیات کے مسائل پر خشک زاہدانہ۔ جہاں اس مذہبی زندگی میں عورت کو بھی بہت بڑا درجہ حاصل تھا چنانچہ اکثر دیویوں کے نام خرافیات مصر میں نظر آتے ہیں۔ مثلاً اُتتُ (مَر سکُنتُ) ہتھر آئی سس، نیتھ وغیرہ ان کے علاوہ برلن اور لندن کے عجائب خانوں میں بعض ایسے سنگین مجسمے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مصری قوم میں اور بھی جلیل القدر دیویاں گذری ہیں چنانچہ برلن میوزیم میں سیکھٹ دیوی کا مجسمہ ہے اور اس کا سر شیر کا ہے اسی طرح برٹش میوزیم میں باسٹ اور آئی سس کے مجسمے ہیں اول الذکر مجسمہ کا سر بلی کے ایسا ہے مصریوں کے عقیدہ میں "نارس فریجہ" بھی بلی کی شباہت رکھنے والی ہستی ہے

اس کو "عشق کی دیوی" بتایا جاتا ہے۔ آئی سس کا مجسمہ بھی بہت اہم ہے۔ اسکی آغوش میں اسکا بچہ بھی دکھایا گیا ہے جو "ہورس" دیوتا کا بیٹا تھا مصر کے مختلف حصّوں میں دیویوں کے نام پر معابد پائے جاتے ہیں کنواری "بوٹو" بھی ایک دیوی تھی۔ مقام ہیریکلیو پولس میں ہنیب کو (NAHEB-KAU) کا ایک مندر ہے اس کو ایک "ناگنی" بتایا جاتا ہے۔ جو اژدہا بھی کرتی تھی۔ مشہور مورخ ہیرودوتس مصر میں اکثر اس ناگنی دیوی کا چرچا سنا کرتا تھا لیکن باوجود تلاش بھی وہ اس دیوی کے دیدار سے مشرف نہ ہو سکا۔ کھیت میں ہل چلنے کے موقعہ پر غلہ افشانی کے قبل اس دیوی کی پوجا ہوتی تھی۔[1]

دمینتی

خرافیات ملل کا مطالعہ کرنے کے بعد انسان اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ یونان و فارس ذہنی اور شجاعانہ سربلندیوں، بابل و اسیریا اپنے مذہبی افکار جاپان اپنے عشقیہ تصورات کے لئے مخصوص رجحان رکھتا ہے سرزمین ہند میں یہ ساری خوبیاں لپ یک جا پائیں گے۔ کالیداس کی "شکنتلا" ہرش کوی کی "نل و دمینتی"۔ عشقیہ افسانوں میں ایک خاص اثر کی حامل ہیں۔ دنیا کے اور قدیم افسانوں کی طرح یہ بھی نظم میں ہیں لیکن ایک خاص حسن ادا جو ان ہندوستانی افسانوں میں ہے وہ ان میں ہیروین کا کردار ہے ہندوستان بھی عورتوں کی پرستش میں دوسرے اقوام و ملل سے کم نہیں "سرسوتی کو علم کی دیوی بتایا

---

[1] Egyptian Myth & Legend: Donld A. Mackenzie ص ۹۰-۹۱

جاتا ہے۔ مہابھارت میں "دروپدی" کا کردار اس کی عفت مآبی بہت اثر انگیز ہے دریودھن کی چال بازیوں سے یدہشٹر "چوسر بازی" میں شکست کھاتا ہے۔ مخالف جماعت کے افراد دروپدی پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اس موقعہ پر اس خاتون کا کردار نہایت خوبی سے نمایاں کیا گیا ہے کالیداس کی شکنتلا میں عورت ہی اپنے شوہر کے پیچھے سرگرداں ہوتی ہے۔ یہی حال افسانہ "نل و دمینتی" کا ہے۔ اس میں بھی دمینتی کا کردار بے حد اثر آفریں اور عبرت انگیز ہے۔ راجہ نل اپنے بھائی پشکار سے تاج و تخت ہار جاتا ہے اور تنہا جنگل کی راہ لیتا ہے۔ دمینتی اس کے پیچھے پیچھے جاتی ہے دونوں ایک سنسان جنگل میں پہنچ جاتے ہیں۔ دمن تھک کر سو جاتی ہے۔ نل یہ خیال کرکے کہ اس کی محبوبہ محض اس کے لئے حیران و سرگرداں ہو رہی ہے، اس کو تنہا چھوڑنا چاہتا ہے تاکہ وہ اپنے باپ راجہ بھیم کے ہاں "وھرب ۱ ۲ ۳ ۴ ۵" چلی جائے۔ چنانچہ وہ رانی کو تنہا چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ دمن نیند سے اٹھتی ہے اور نل کو نہیں پاتی ہے اس موقعہ پر دمینتی کا جو والہانہ انداز پیش کیا گیا ہے اس کی نظیر مشکل سے کسی غیر ہندوستانی عورت میں مل سکتی ہے دمن روتی ہے چلاتی ہے۔ نل کو پکارتی ہے کبھی جھاڑیوں میں جاتی ہے۔ کبھی درختوں کی بلندیوں پر نظر ڈالتی ہے اس کا جوش محبت طوفان خیز ہے۔ دیوانہ وار کبھی سر بفلک پہاڑوں کو مخاطب کرتی ہے۔ کبھی موج مارنے والے دریاؤں سے نل کا حال پوچھتی ہے۔ نل کی محبت اور اس کے شوق تلاش میں اس نے جتنی سخت مصیبتیں

Indian Myths & Legend . Don . d A. Mack . . .

جمیلیں اور محبت میں ثابت قدم رہی اس نے عورت کا مرتبہ بہت بلند کر دیا افسانہ کے پلاٹ میں دمینتی کی سرفروشانہ زندگی، اس کی سوگوارانہ بادیہ پیمائی اس کا اٹل تصور محبت اس کا والہانہ انداز شیفتگی ایسی چیزیں معلوم ہوتی ہیں جو عورت کو مجسمہ ایثار و قربانی اور پیکر نور و تقدس بنا دیتی ہیں[۱]۔

آرفیس و یوریڈ ایس

قدیم یونانیوں کی خرافیات میں یوں تو ہندوستان کی طرح دیوتاؤں اور دیویوں کے بہت سے عشقیہ افسانے ہیں لیکن "آرفیس اور یوریڈایس" کے افسانہ میں جس درد انگیز تاثر کی کارفرمائیاں ہیں اور افسانوں میں کم نظر آتی ہیں۔ افسانہ کا آغاز نہایت دلچسپ پیرائے میں ہوتا ہے ابتداً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا خاتمہ نشاط پر ہوگا لیکن آخر میں واقعات کچھ ایسی صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ افسانہ ایک المناک فاجعہ بن کر رہ جاتا ہے

آرفیس مقام تھرلس کا رہنے والا تھا۔ قدیم زمانہ میں وہ بہت بڑا ماہر موسیقی مشہور تھا۔ اپالو دیوتا نے اس کو سونے کا ایک ستار دیا تھا۔ ستار لے کر کبھی وہ "کوہ البس" کی وادیوں میں جہاں دیوتاؤں کا مسکن ہے، مارا پھرتا، اور کبھی "پاناسس" کے

---

[۱] نل و دمینتی کے افسانہ پر ایک بسیط مقالہ مرتب ہو چکا ہے جس کے ضمن میں فارسی مثنویوں پر ایک سرسری تبصرہ کیا گیا ہے اور فیضی کی سوانح زندگی اور اُس کی مثنوی "نل دمن" پر شرح و بسط کے ساتھ تنقید کی گئی ہے۔ یہ مقالہ "طاق لبستان" آرہ سے ملے گا۔

صحراؤں میں بادیہ پیمائی کرتا جب وہ اپنا ستار چھیڑتا اور بکمال فن کے ساتھ کوئی نغمہ گاتا تو صحرائی درندے سرڈالے مسحور ہو کر اس کے سامنے آجاتے آبشاروں کی روانیاں کم ہو جاتیں اور پہاڑ کے چٹان اور جنگل کے درخت اس کی ترانہ بھی سننے کے لئے اس طرف کھنچ جاتے، آرفیس کی موسیقی سے وحشی انسانوں کا دل بھی ملایم ہو جاتا۔ یہ مغنی جو پتھر کے اندر بھی زندگی کی روح پھونک دیتا تھا ایک حسینہ "یوریڈائیس" پر عاشق ہوا، اور اُسکو وہ لیادہ بہادر بھی تھا۔ لیکن ان عاشق و معشوق کے عیش کی گھڑی بہت جلد ختم ہو گئی۔ یوریڈائیس اپنی شادی کی تقریب میں رقص کر رہی تھی۔ ایک زہریلے سانپ نے جو گھانس کے نیچے چھپا ہوا تھا اس کو ڈس لیا اس لئے وہ اسی رات کو مر گئی جس رات کو اس کی شادی ہوئی تھی۔ غمناک شوہر نے اس کو دفن کر دیا۔ میت کے ساتھ جو لوگ تھے ان کا دل ہل گیا جب آرفیس اپنے درد و کرب کا مظاہرہ کرتا۔ آرفیس کو بھی زندگی تاریک معلوم ہونے لگی کیونکہ یوریڈائیس ہمیشہ کے لئے اس سے چھوٹ گئی تھی۔ اس نے محبوبہ کی تلاش میں "ہیڈس" (Hades) کے دروازہ کا رُخ کیا۔ جس سے کوئی شخص اپنی موت سے قبل گذر نہیں سکتا، رستے میں کتنے خوفناک مناظر، کتنے روح فرسا اور جرأت آزما نظاروں سے اس کو واسطہ پڑا۔ اس تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ افسانہ نگار نے بڑی خوبی کے ساتھ آرفیس کو اس ہفت خوان کی آخری منزل تک پہنچا دیا جہاں "ہیڈس" کا بادشاہ اپنی ملکہ "پرسیفون" کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ یہاں اس سحر کار مغنی نے ایک خاص ماہرانہ انداز میں ایک نغمہ گایا۔ اور اس میں بادشاہ سے درخواست کی کہ آپ موت کی گرہ

ڈھیلی کردیجئے کیونکہ عشق نے مجھے اس ناقابل گذر منزل تک پہنچایا۔ جہاں میں اپنی زندگی میں نہیں پہنچ سکتا تھا سخت "پلوٹو" نے میری محبوبہ کو مجھ سے جدا کردیا، میری محبوبہ مجھے واپس کردی جائے جو اس قدر جلد مجھ سے چھوٹ گئی۔ یا پھر یہ ممکن نہیں تو ایک کے بدلے دو قربانیاں قبول کی جائیں۔ لیکن مجھے تنہا عالم آب وگل میں جانے نہیں دیا جائے"

سیاہ ابرو والے "پلوٹو" نے اس کی دعا پر اشارہ کیا "پرسیفون" نے اپنے شوہر کے کان میں رحم کا کوئی کلمہ کہا ایک نرم و آہستہ آواز آئی، آرفیس کے ستار کی سحر کاریاں بند چکی تھیں سارے عالم "ہیڈس" میں سناٹا تھا حکم ہوا کہ دنیا میں واپس جاؤ، اور "یوریڈایس" سایہ کی طرح تمہارے ساتھ ہوگی لیکن نہ کہیں ٹھہرو، نہ بات کرو اور نہ پیچھے مڑکر دیکھو یہاں تک تم دنیا کی ہوا میں پہنچ جاؤ، ورنہ پھر تم اس کی صورت نہ دیکھ سکو گے اچھا اب ذرا دیر نہ کرو، روانہ ہو جاؤ، اور تم اپنے خموش رستہ میں تنہا نہیں ہوگے۔

آرفیس واپس جارہا تھا رستہ میں نہ کہیں بولا، نہ ٹھیرا، "ہیڈس" کا دروازہ نزدیک ہورہا تھا اور اس کی اُمید کا ستارہ آہستہ آہستہ زیادہ درخشاں ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جب منزل قریب آگئی تو یکایک اس کے دماغ میں شبہ اور بے صبری کی تاریکی چھانے لگی اس نے فرط شوق میں سر گھمایا اور پیچھے دیکھا کہ وہ ہستی کفن میں لپٹی ہوئی چلی آرہی ہے جس پر وہ اس والہانہ انداز میں وارفتہ تھا۔ "میری یوریڈایس" کہہ کر وہ چلایا اور اپنی آغوش۔ اکر دئے، اس کے بازو سے ٹھنڈے باریک بال مس ہوگئے صرف ایک آہ کی آواز آئی وہ صورت تاریکی میں غائب ہوگئی۔

اب "یوریڈایس" اس عالم میں میسر ہونے والی چیز نہ تھی۔ وہ کئی کئی دن بلا کھائے پیئے بُت کی طرح پڑا رہتا۔ اب نہ تو اس کی نغمہ سنجیاں ہی باقی تھیں اور نہ تکلّم نوازیاں وہ جلد سے جلد فاقہ کر کے مرنا چاہتا تھا کیونکہ یہی ایک صورت اب "یوریڈایس" کے وصل کی باقی رہ گئی تھی آخر کار وہ اُٹھا اور انسانی آبادی کی طرف راہ لی وہ چپ چاپ چلا جا رہا تھا اس کا ستار اس کے دل کی طرح شکستہ تار تھا۔ اس نے ساری خوشیوں کو تیاگ دیا کسی عورت پر نظر بھی نہیں ڈالتا حالانکہ اکثر لڑکیاں اس کو موہنے کے لئے مسکراتیں اور کہتیں کہ وہ اپنی گم شدہ "یوریڈایس" کو بھول جائے اس کے بعد تھریس کے پہاڑی جنگلوں میں اس نے بود و باش اختیار کر لی۔ وحشی جانور اس کے رفقاء تھے ع

خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا

آرفیس زندگی کے دن اسی طرح گزار رہا تھا ممکن تھا وہ اپنے ستار پر "یوریڈایس" کے فراق میں غمناک ترانے گاتا کہ یکایک عورتوں کا ایک گروہ آیا وہ آکر اس اجنبی کے سامنے رقص کرنے لگیں لیکن آرفیس دہشت میں اُٹھ کر بھاگا اور ان کی وحشت زدہ پکار پر بھی مخاطب نہ ہوا۔ وہ عورتیں بے اعتنائی پر بڑی غضب ناک ہوئیں اور جس طرح ایک شکاری آہو کا تعاقب کرتا ہے اس کے پیچھے روانہ ہوئیں اور اُس کو پتھر سے مارتے مارتے زمین پر گرا دیا اور اس کے ٹکڑے اُڑا دیئے اس کے ستار کو پارہ پارہ کر ڈالا۔ مشہور ہے کہ اس کا سر جس سے "یوریڈایس" کی آواز نکل رہی تھی جزیرہ "لس بس" کے ساحل پر بہتا ہوا آیا۔ یہاں اس کو ایک مقبرہ میں دفن کر دیا گیا اب یہ ایک مقدس

زیارت گاہ ہے۔ یہاں بلبلیں ایسی سُریلی آواز میں ترانہ سنجیاں کرتی ہیں کہ اس کی مثال دوسری جگہ نہیں ملتی۔

اقوام و ملل کے یہ افسانے انسان کی معصومانہ فطرت کے حقیقی ترجمان ہیں۔ قدیم عورت کے تقدس کی نظیر دور حاضر کی تعلیم یافتہ عورت میں نہیں مل سکتی۔ آج عورت محبت کی حقیقی لذتوں سے محروم ہے۔ عہد قدیم کی عورت جس طرح آج بھی پرستش کی چیز سمجھی جاتی ہے اس کا حقیقی نظارہ اس زمانہ کی عورت کو خواب میں بھی میسر ہونے والی چیز نہیں وہ ہوسناکیوں کا شکار ہے "آہ" اور "واہ" کی ہنگامی شورشوں میں وہ رواں دواں ہے اس کی آنکھیں اس وقت کھلتی ہیں جب وہ منزل سے بہت دور چلی جاتی ہے۔ اب تلافی مافات کی صورت اس کے سوا کچھ باقی نہیں رہتی کہ آسمان کے دوراور زمین کے سخت ہونے پر آنسو بہائے عہد حاضر کی عورت شعر کہتی ہے۔ عشقیہ افسانے لکھتی ہے۔ آسمان پر اُڑتی ہے۔ دریا میں تیرتی ہے حُسن کے میدان مقابلہ میں اُترتی ہے۔ الغرض مرد کے وداع عقل و ہوش کے لئے اپنے اندر ایسے ایسے سامان جذب و کشش پیدا کرتی ہے کہ ناانصافی ہوگی اگر اس کی جدت طرازیوں اور ہنگامہ زاریوں کی داد نہ دی جائے۔ لیکن کیا عہد حاضر کی کوئی تعلیم یافتہ عورت ایسی بھی ہے جو مستقبل میں "دیوی" کے مرتبہ تک پہنچ جائے۔ اور "ڈائنا" کے مندر کی طرح اس کے نام پر بھی ایک پرستش گاہ تعمیر کی جائے۔ جہاں ہزاروں مرد اور عورتیں اس کی قبر پر محبت و

لہ خرافیات و اساطیر ملل قدیمہ مرتبہ اے آر ہوپ ماکر لیف ص ۱۲۷

عقیدت کے پھول چڑھائیں۔

اہل امن و سکون آپ کس گھر میں پا سکتے ہیں جہاں عورت مقابلہ پرواز و شناوری کی ڈگریاں لے کر جلوہ فروش ہو۔ اور اخبار و صحائف میں اپنی عشقیہ افسانہ نگاری اور عریاں غزل سرائی کی اشاعت کرتی ہو۔ یا پھر اس گھر میں جہاں عورت صبح سویرے سے اُٹھ کر رات گئے تک عبادت و تلاوت، بچوں کی پرورش و تربیت۔ خانہ داری کے نظم و نسق۔ مرد کی محبت و اطاعت میں سوگوار رہتی ہو۔ عورت سمجھتی ہے کہ اس کی حقیقی منزلت عوام میں مشہور ہو جانے اور اپنے ذوق شعر و ادب کی داد لینے میں مضمر ہے۔ در آنحالیکہ ایسی عورت نہ کبھی حقیقی عزت کی مستحق سمجھی گئی اور نہ اس کی تعلیم و تہذیب کی وجہ سے لوگوں نے اس کو پوجا۔ دنیا میں ہمیشہ نفسی تربیت اور مقدس کردار پرستش دنیا بش کی چیز سمجھا گیا۔ آج صفیہ و نور جہاں جمیلہ و عزت میلار کا نام لیا جاتا ہے، لیکن کیا ہمارے قلوب میں کوئی ارادت مندانہ جوش پیدا ہوتا ہے۔ مگر جب "مریم بصریہ" اور "عفیرۃ العابدہ" کا نام آتا ہے تو ہمارے دل ہلنے لگتے ہیں۔ اور معاً تقدس و بزرگی کے ایک خیالی پیکر کے سامنے ہماری گردنِ عقیدت جھک جاتی ہے۔ مریم بصریہ شہیدۂ محبت تھیں، کسی مجلس میں "محبت" کے موضوع پر بحث ہو رہی تھی۔ آپ کا دل محبت الٰہی سے روشن تھا آپ کا کلیجہ پھٹ گیا اور اسی مجلس میں جان دی۔ عفیرۃ العابدہ اتنا روئیں کہ بینائی جاتی رہی لوگوں نے کہا کہ نابینائی تو بڑی مصیبت ہے۔ آپ نے فرمایا خدا سے محجوب رہنا اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔ "امّ علی" شیخ احمد بن نضرویہ (متوفی سنہ ۲۴۰ھ)

کی اہلیہ تھیں، میاں بیوی دونوں خدا رسیدہ، بڑے گھرانے کی لڑکی تھیں۔ دولت میکہ سے بہت لائی تھیں۔ سب کو خدا کی راہ میں لٹا دیا۔ حضرت ابو حفصؒ فرماتے ہیں۔ عورتوں کا تذکرہ مجھے ہمیشہ مکروہ معلوم ہوتا تھا مگر جب میں نے "ام علی" کو دیکھا تو میں نے سمجھا کہ "معرفت" خدا کی دین ہے، جس کو دے دے۔ ذوالنون مصری فرماتے ہیں کہ فاطمہ نیشاپوریہ قرآن مجید کے ایسے ایسے معانی بیان کرتیں کہ مجھ کو تعجب آتا تھا ابو یزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ تصوف کے جس کسی "مقام" کے متعلق میں نے ان سے تذکرہ کیا مجھے معلوم ہوا کہ وہ پہلے سے اس سے واقف تھیں۔ حضرت فضیل بن عیاض بی بی شعوانہ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ میرے لئے اللہ سے دعا کیجئے۔ بی بی نے فرمایا کہ تمہارے اور خدا کے درمیان کوئی ایسی بات ہے کہ اگر دعا کریں تو مقبول ہو جائے۔ حضرت فضیل نے چیخ مار کر گرے اور بیہوش ہو گئے "لبابۃ المتعبدہ" بیت المقدس کی رہنے والی تھیں۔ آپ فرماتی ہیں کہ خدا سے مجھے شرم آتی ہے کہ وہ مجھے اپنے سوا کسی غیر میں مشغول دیکھے۔[۱]

شاعری کی تاریخ کا پتہ لگائیے۔ آپ کو اس کی تخلیق کی تہ میں عورت ہی کی چشم و ابرو زلف و خال کی کارفرمائیاں نظر آئیں گی موسیقی کے نشو و ارتقاء پر غور کیجئے عورت ہی اس کی اولین محرک ثابت ہو گی۔ بت تراشی کی ابتدا بھی اس کی قامت رعنا کی مرہون منت ہے۔ اقوام و ملل کے افسانوں سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ فرائڈ کے فلسفۂ تجدید سے اس کا ثبوت ملتا ہے

۱۔ نفحات الانس

اسی صنف کی ایک ہستی نے مجھ سے بھی ادب کی یہ خدمت لی۔ ہر چند وہ اب ہماری آنکھوں سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گئی۔ اس کی معصومانہ ادائیں محض ایک "یاد" ہو کر دل و جگر سے لپٹی ہوئی ہیں آنکھیں ڈھونڈھتی ہیں لیکن نہیں پاتیں گزرے ہوئے ایام کی وہ رنگینیاں یاد آتی ہیں آہ! وہ پُرسکون اور پُرسرور لمحے، بھولی بسری باتیں بن گئیں۔ جینا بھی مرنے کی طرح کس قدر ناگزیر ہے۔ ہماری حسرت سنجیوں اور محرومیوں نے زندگی کو اسی سطح پر پہنچا دیا ہے۔

گرمیوں کے زمانہ میں دفتر سے تھک کر پسینہ میں شرابور آنا اور کسی کا بے تابانہ پنکھا لے کر دوڑنا اور اس وقت تک اسے ہاتھ سے نہ رکھنا جب تک نسیم کی طراوت بزیوں کی طرح بادکش کی سکون آفرینیاں رخسار و تن سے پسینہ کا آخری قطرہ جذب نہ کر چکی ہوں۔ کسی کا کبھی کبھی غصہ میں آجانا اور تیور بدل کر باتیں کرنا اور کسی با ایک لخت چپ سادھ لینا اور ابرو پر شکن تک نہ لانا۔ موٹے کپڑوں اور ٹوٹی ہوئی جھونپڑی میں بسر کرنا اور صبح و شام ایسی رنگین صحبتیں —— رنگین اور معصوم صحبتیں —— کہ دولت و امارت کی بڑی سے بڑی قربانیاں بھی اس پر چڑھائی جا سکتی ہیں۔ کاش، پگمیلین کی طرح بُت تراش ہوتا اور "گلیتیا" کی طرح "انیرہ" کا بُت بناتا کاش "آرفیس" کے سے لحن و غنا کا ماہر ہوتا اور "ہیڈس" سے اپنی محبوبہ کو واپس لاتا۔ جو "یوریڈایس" کی طرح بہت جلد مجھ سے جُدا ہو گئیں ؎

ز مرغ خاص بدی در وثاق ہیر ہنے | چو طبل باز شنیدی بہ لا مکاں رفتی

تصانیف

عبدالمالک آروی

انتخاب دیوان شمس تبریز

ڈاکٹر نکلسن (پروفیسر عربی کیمبرج) کی مشہور کتاب (Selected odes from the Diwan Shams Tabriz) کا اردو ترجمہ و تلخیص، صوفیانہ شاعری اور رومی کے رنگ تغزل پر معرکۃ الآرا تبصرہ، مع نکلسن کی تصویر و انتخاب غزلیات رومی، طباعت بہترین، صفحات ۲۳۰، قیمت مجلد ۳ روپیہ

خواب کی دُنیا

سگمنڈ فریوڈ کی کتاب (The Interpretations of Dream) کا خلاصہ، خواب کی ماہیت اور فلسفہ پر اردو میں بے مثل کتاب، حکومت بہار نے اشاعت کیلئے روپے دئے صفحات ۱۸۹ قیمت مجلد ۱ روپیہ ۴ آنے

ناظم ادارۂ "طاقِ بستاں" آرہ (بہار)